سرما ۱۹۹۷

آج

ترتیب: اجمل کمال

سید محمد اشرف — اسد محمد خاں — رابندرناتھ ٹیگور

تادیوش بوروسکی — مارین شورِسکو — جان پروکوپ

وِسلاوا شمبورسکا — لِنڈسے بلسَم — مارک ڈائل

نجیب محفوظ

Scanned with CamScanner

سرما ۱۹۹۷

جنوری ۔ مارچ ۱۹۹۷

مینیجنگ ایڈیٹر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۱۴۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت

ایجوکیشنل پریس

پاکستان چوک، کراچی

رابطے کے لیے پتا:

اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

فون: ۸۱۱۳۴۷۴

ای میل: aaj@biruni.erum.com.pk

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا:

محمد عمر میمن

۵۴۱۷، ریجنٹ اسٹریٹ، میڈیسن، وسکانسن ۵۳۷۰۵، یو ایس اے

ترتیب

بطورِ اداریہ

۷

اقبال احمد: ایک بستی ـــــ شانتی نگر نامی

ناصر جمال: شانتی نگر کے زخم

مظہر زیدی: جہنّم میں مکان

***

سید محمد اشرف

۲۱

نمبردار کا نیلا

اسد محمد خاں

۱۰۴

سارنگ

رابندر ناتھ ٹیگور

۱۱۷

آرٹ کا مفہوم

***

Scanned with CamScanner

تادیوش بوروسکی

۱۳۵

پروجیکٹ: پرچم

مارین شورِسکو

۱۳۶

شیکسپیئر

شطرنج

سینیکا

جان پروکوپ

۱۴۰

وکٹری اسکوائر، سابق سیکسونین اسکوائر، پر
گمنام سپاہی کی قبر کے پاس چڑیوں کے لیے
پھینکے گئے روٹی کے ٹکڑے کا نغمہ

وِسلاوا شِمبورسکا

۱۴۲

ایک ریزیومے کا لکھنا
یاسلو کے قریب فاقہ کیمپ

***

Scanned with CamScanner

لنڈسے ہلسم

۱۴۹

کیگالی کہاں ہے؟

مارک ڈائل

۲۰۱

کیپٹن مبایے دیا گنے

***

نجیب محفوظ

۲۱۱

شادیانے

(دوسرا اور آخری حصہ)

Scanned with CamScanner

بطورِ اداریہ

ایک بستی ـــــ شانتی نگر نامی

۶ فروری ۱۹۹۷ کو شانتی نگر کے بد قسمت عیسائی باشندوں کے ساتھ جنونی مسلمانوں کے ہجوم نے جو دہشت ناک کارروائی کی اُس کی روداد بیشتر اخباروں میں یکساں ہے۔ فساد برپا کرنے والوں نے تیرہ گرجا گھر تباہ کیے اور سیکڑوں گھر جلا ڈالے۔ لیکن اعداد و شمار اس جرم کی سنگینی کا پوری طرح اظہار کرنے سے قاصر ہیں جس کا ارتکاب اکثریتی مذہبی گروہ کے ایک حصّے نے اقلیتی عقیدے سے تعلق رکھنے والے اپنے ہم وطن شہریوں کے خلاف کیا ہے۔

دستیاب ہونے والے شواہد اس جانب بھی اشارہ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اس ظالمانہ کارروائی پر اُکسانے اور اس کی تنظیم کرنے کے عمل میں ضلع خانیوال کی پولیس فورس کے کچھ ارکان باقاعدہ شامل تھے جبکہ باقی ارکان نے ڈیوٹی پر موجود ہوتے ہوئے تماشا دیکھتے رہنے کا طرزِ عمل اختیار کر کے اس جرم میں اعانت کی۔ چند ایک کے بارے میں اطلاع ہے کہ انھوں نے لُوٹ مار میں بھی حصّہ لیا۔ اس بھیانک خواب کا انجام اُس وقت ہوا جب قانون نافذ کرنے کے لیے فوج وہاں پہنچی۔ حالیہ یادداشت کی رو سے یہ فرقہ وارانہ تشدّد کا بدترین واقعہ تھا۔

اخلاقی اصولوں کے قائل کسی معاشرے میں ایسا بھیانک واقعہ رونما ہوا ہوتا تو ذرائع ابلاغ اور تعلیم یافتہ طبقات اس خرابی کی جڑ تک پہنچنے کے لیے غور و فکر شروع کرتے۔ ہمیں حکومت اور سیاسی پارٹیوں کی جانب سے بھی یہ توقع کرنے کا حق تھا کہ وہ اعتماد بحال کرنے، اقدار کا اثبات کرنے اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے علامتی اور حقیقی اقدامات کریں۔ لیکن اس قسم کی کسی کشمکش یا خود تنقیدی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ وفاقی یا صوبائی حکومت کے کسی سیاسی عہدے دار نے اس بد قسمت بستی کا دورہ نہیں کیا جس کا نام "شانتی نگر" بجائے خود ایک طنز بن گیا ہے۔ کسی منتخب یا غیر منتخب سیاسی لیڈر نے وہاں جا کر ان ڈرے ہوئے، ستم رسیدہ لوگوں کو دلاسا دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی جن کے ۷۰۰ یا اس سے زیادہ گھر جلا دیے گئے، اسباب لُوٹ لیا گیا اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ صرف ایک سیاسی لیڈر ـــــ جماعتِ اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد ـــــ نے اس ظلم کی برسرِ عام مذمّت کی۔

انسانیت کا اثبات کرنے اور ملک کے ضمیر کو بچانے کا کام اخبار نویسوں پر اور ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے نہایت مصروف اور بہادر کارکنوں پر چھوڑ دیا گیا۔ کمیشن کی انسانی حقوق کے چھ ممتاز کارکنوں پر مشتمل ٹیم نے ۱۰ فروری کو شانتی نگر کا دورہ کر کے یہ رپورٹ دی کہ "۱۹۸۹ میں چک سکندر میں پیش آنے والے احمدی کش فسادات کے بعد سے کسی پوری شہری آبادی کو لُوٹنے اور

Scanned with CamScanner

تباہ کرنے کے یہ بد ترین واقعات ہیں، اور جزوی طور پر ۱۹۴۷ کے دنوں کی یاد دلاتے ہیں۔" اپنی پانچ نکاتی سفارشات کے پہلے دو نکات میں کمیشن نے حکومت پر عیسائیوں کے اس مطالبے کو تسلیم کرنے کے لیے زور دیا کہ "ہائی کورٹ کے ایک جج سے ان واقعات کی تحقیقات کرائی جائے...؛ اور قصوروار افراد کو ایسی سزا دی جائے جو مستقبل میں ایسے عناصر کو اس قسم کے جرم سے باز رکھ سکے۔ دوم، ٹبہ اور شانتی نگر کی آبادیوں کی مکمل بحالی کے سلسلے میں حقیقی اور بڑے پیمانے کی کوششیں کی جانی چاہییں۔" امید کی جاتی ہے کہ نئی منتخب ہونے والی وفاقی اور صوبہ پنجاب کی حکومتیں ان سفارشات پر وقت ضائع کیے بغیر عمل کریں گی۔

ہیومن رائٹس کمیشن نے رپورٹ دی کہ اس کے ارکان غارت گری کے اس مقام سے واپس آتے ہوئے "صرف ان باتوں کی وجہ سے مضطرب نہیں تھے جو وہاں ان کے دیکھنے اور سننے میں آئی تھیں۔ انھیں یہ بھی تشویش تھی کہ یہ واقعات مستقبل کے لیے نہایت خطرناک امکانات کے حامل ہیں۔" ان افراد کو جو آج اقتدار پر فائز ہیں، اور ان کو بھی جو اقتدار پر فائز ہونے کے خواہشمند ہیں، ان "امکانات" پر غور کرنا چاہیے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس المیے کی ابتدا مذہب کی توہین کے ایک جھوٹے الزام سے ہوئی۔ دعویٰ کیا گیا کہ ۵ فروری کو قرآن کے چند جلے ہوئے اوراق شانتی نگر سے دو کلومیٹر دور سڑک کے کنارے بنی ہوئی ایک چھوٹی مسجد کے پاس سے ملے ہیں، اور ان پر ایک عیسائی کا نام لکھا ہوا ہے، جو وہی شخص ہے جس نے ان اوراق کو جلایا ہے۔ علاقے کی تمام مسجدوں نے اپنے لاؤڈ اسپیکروں سے یہ دعویٰ نشر کرنا اور ایمان والوں کو جہاد پر اکسانا شروع کر دیا۔ ہیومن رائٹس کمیشن کی رپورٹ کہتی ہے کہ "یہ سلسلہ کئی گھنٹے جاری رہا جس کے دوران لوگ آس پاس کے علاقوں سے آ آ کر جمع ہونے لگے۔ اچھی طرح بھڑکائے ہوئے اس ہجوم نے خانیوال کے کئی گرجا گھروں پر حملہ کیا۔

حملوں کا سلسلہ اگلے روز صبح (۶ فروری کو) دوبارہ شروع کیا گیا اور ہجوم نے پہلے ٹبہ اور پھر شانتی نگر کی بڑی آبادی کا رُخ کیا۔ بادی النظر میں یہ ایک منظم کارروائی تھی۔ پہلے لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے کا حکم دیا جاتا، پھر لوٹ مار کی جاتی، مویشی نکال لیے جاتے اور مکان کو آگ لگا دی جاتی۔ اسی صبح خانیوال کے بڑے سینٹ جوزف چرچ اور اس سے ملحق بچوں کے ہاسٹل کو تباہ کیا گیا۔ "بچوں کی کتابوں کے اوراق،" کمیشن کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے، "جن میں اسکول کے نصاب میں شامل اسلامی دینیات کے متن بھی شامل تھے، ہاسٹل کے سامنے زمین پر بکھرے پڑے تھے۔"

اس واقعے سے حاصل ہونے والا سبق بالکل واضح ہے: توہینِ مذہب کا قانون (Blasphemy Law) نہ صرف انصاف کے بنیادی اصولوں کی نفی کرتا ہے بلکہ قانون کے ادارے کو فرقہ وارانہ جبر و تشدد اور انفرادی یا اجتماعی انتقام کے آلہ کار میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مشتعل ہجوم کے ہاتھوں ہلاک ہو جانے والے ایک بے قصور حافظِ قرآن سے لے کر ملک کے معروف ترین سماجی انجینئر ڈاکٹر اختر حمید

خاں تک اس قانون کا نشانہ بننے والوں میں شامل ہیں جنھیں توہین مذہب کے ایک بے بنیاد الزام پر برسوں تک بدسلوکی، قتل کی دھمکیوں اور مقدمے بازی کا نشانہ بنایا گیا۔ ہیومن رائٹس کمیشن کے اس موقف سے اتفاق کیے بغیر چارہ نہیں کہ "توہینِ مذہب کے قانون میں مذہبی جنون اور عوامی شرپسندی بھڑکانے کی جو صلاحیت ہے وہ ایک بار پھر پوری طرح ثابت ہوئی ـــــ اور اس کی ادا کردہ قیمت میں ہزاروں انسانوں کو پہنچنے والی تکلیف اور قوم کے امیج کو پہنچنے والا نقصان دونوں شامل ہیں۔" اس قانون کو منسوخ کیا جانا چاہیے، اور یہ اس کے لیے بالکل موزوں وقت ہے۔

شانتی نگر کے المیے سے سامنے آنے والا دوسرا نہایت پریشان کن نکتہ ریاست کی مشینری کی مجموعی ناکامی ہے۔ فسادات کو منظم کرنے میں خانیوال پولیس کے اہلکاروں کے ملوث ہونے کے قوی شبہات موجود ہیں۔ شانتی نگر کے باشندوں نے یاد کیا کہ ۱۷ جنوری ۱۹۹۷ کو خانیوال صدر تھانے کے انچارج عزیزالرحمن ڈوگر نے شانتی نگر کے ایک باشندے ایوب کے گھر پر اس الزام کے تحت چھاپا مارا کہ وہ جوے کا اڈا چلاتا ہے۔ اسے وہاں کچھ نہیں ملا، اور غالباً اپنی ناکامی پر برافروختہ ہو کر اس نے گھر میں رکھی ہوئی ایک بائبل کو ٹھوکر ماری۔ گھر کے افراد نے اس کے خلاف رپورٹ درج کرائی جس کے نتیجے میں اسے معطل کر دیا گیا، لیکن وہ آزاد پھرتا رہا اور اس نے شانتی نگر والوں کو سبق سکھانے کی قسم کھائی۔ بستی والوں کے خلاف توہینِ مذہب کا الزام جس طرح ایک موٹر سائیکل سوار نے علاقے میں پھیلایا، اور پھر جس طرح اس الزام کو مسجد کے لاؤڈ اسپیکروں سے نشر کرنا شروع کیا گیا، اس سے شرپسندانہ منصوبہ بندی کا شبہ ہوتا ہے، اگرچہ اس کی حقیقت محض عدالتی تحقیقات ہی سے متعین کی جا سکتی ہے۔

خانیوال ۵ فروری ۱۹۹۷ کو فرقہ وارانہ فسادات کے لیے ایک نہایت موزوں مقام رہا ہو گا۔ خانیوال ہی کا ایک محلہ، کبیر والا، پاکستان کے پُرتشدد ترین "اسلامی" گروہوں میں سے ایک یعنی انجمن سپاہ صحابہ کی جائے پیدائش ہے۔ ضیاالاسلام فاروقی نامی ایک مولانا نے اس ضلعے سے رکن قومی اسمبلی کے انتخاب کے لیے کاغذاتِ نامزدگی بھی داخل کیے تھے۔ علاقے میں مسلم لیگ کی مقبولیت کی لہر کا رُخ موڑ پانے سے پہلے ہی بدقسمتی سے مولانا لاہور سیشن کورٹ کی عمارت کے باہر ہونے والے ایک بم دھماکے میں ہلاک ہو گئے۔ مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ پارٹی کے ایک اور رہنما اعظم طارق انتخابات میں شکست کھا گئے۔ تاہم، انھیں دوبارہ گنتی کے بعد کامیاب قرار دے دیا گیا۔ ایمان والوں کا طیش اونچی سطح پر تھا کہ عیسائیوں کو نشانہ بنانے کا یہ موقع پیدا ہوا۔

خانیوال کے سرکاری حکام اس واقعات اور ان سے پیدا ہونے والی کشیدگی سے ضرور واقف رہے ہوں گے ـــــ یا کم سے کم انھیں واقف ہونا چاہیے تھا۔ انھوں نے تشدد کی راہ روکنے کی، اور جب وہ پھوٹ پڑا تو اسے قابو میں لانے کی، ذرا بھی کوشش نہ کی۔ جس وقت ڈپٹی کمشنر اور سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہیڈکوارٹر سے چند میل کے فاصلے پر لاؤڈ اسپیکر لوگوں کو تشدد پر آمادہ کر رہے تھے، وہ بیٹھے جماہیاں لیتے رہے۔ جب پولیس موقعے پر پہنچی تو تشدد کی کارروائی جاری تھی۔ کچھ پولیس والے اس

Scanned with CamScanner

کارروائی میں شامل ہو گئے، کچھ تماشا دیکھنے لگے اور باقی وہاں سے بھاگ گئے۔ ڈپٹی کمشنر کے ہیڈ کوارٹر سے چند گز کے فاصلے پر واقع سینٹ جوزف چرچ اور اس سے ملحق بچوں کے ہاسٹل پر حملے کے دوران بھی ضلعی انتظامیہ مفلوج رہی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہیومن رائٹس کمیشن کی ٹیم اس المیے کی بابت ڈپٹی کمشنر کی تشویش اور اس کا شکار ہونے والوں کے لیے اس کی ہمدردی سے بہت متاثر ہوئی"؛ رپورٹ میں لوگوں کو "امداد اور دلاسا دینے پر ضلعی انتظامیہ کی تعریف کی گئی اور اس "متاثر کن" امداد کے سلسلے میں بھی جو ابھی راہ میں ہے۔ اس بھلے ڈپٹی کمشنر کے مفلوج رویّے کی توجیہ کمیشن کی رپورٹ میں اس طرح کی گئی: سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس عمرے پر گیا ہوا تھا، اور ڈپٹی کمشنر نے "اس بات کو بہت زور دے کر بیان کیا کہ اس کے پیش رو کو اس کے دفتر کے سامنے ایک مذہبی جنونی نے دن دہاڑے ہلاک کر دیا تھا۔" کیا ملک کا انتظام چلانے والے افراد ان علامات سے بے خبر ہیں جن کا یہ حقائق اعلان کر رہے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر وہ خاموش کیوں ہیں؟

اس المیے سے ظاہر ہونے والا تیسرا، اور بہت اہم، نکتہ تبدیلی کے اس پُرخطر عمل سے تعلق رکھتا ہے جس سے یہ ملک اور معاشرہ گزر رہا ہے۔ شانتی نگر میں ۵ اور ۶ فروری کو کی جانے والی دہشت ناک کارروائی میں نہ تو کوئی روایتی بات تھی اور نہ حقیقی معنوں میں جدید۔ پندرہ ہزار افراد پر مشتمل اس بستی کو ۱۹۱۲ میں سالویشن آرمی نامی سماجی بہبود کی تنظیم نے بسایا تھا۔ اس کے قریب ہی ٹبہ نامی آبادی کوئی دس برس پہلے سات مرلہ اسکیم کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔ اس تمام عرصے میں عیسائی اکثریت والی یہ آبادیاں اپنے مسلمان پڑوسیوں کے ساتھ امن سے رہتی آئی ہیں۔ فرقہ وارانہ کشیدگی کا ان کے ماضی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ لیکن حالیہ عشروں میں بازار کی طاقتوں نے معاشرے میں بہت تیز رفتاری سے اپنی جگہ بنائی ہے جس سے مقامی معیشتوں کا انحصار باہمی خاصا کم ہو گیا ہے۔ علاقے میں معاشی مسابقت بڑھ گئی ہے۔ نئی رقابتوں اور کامیابی کی تازہ تر اشتہاؤں نے جنم لیا ہے۔ پرانے طور طریقوں کا زور ٹوٹ چلا ہے، لیکن ان کی جگہ نئی روایتیں مستحکم نہیں ہو پائی ہیں۔

تیز رفتار تبدیلیوں کے اس ماحول میں لوگوں کو ایک دانش مند قیادت، منصفانہ اور مضبوط انتظامیہ، قانون کی یقینی حکمرانی اور شراکت اور خوداختیاری کا احساس درکار ہوتا ہے۔ جب یہ چیزیں عنقا موجود ہوں تو لوگ فرقہ پرست نظریہ بازوں کے پھندے میں آ جاتے ہیں جو آبادی کے مختلف حصوں کے درمیان فرق پر زور دیتے اور عقیدے کو نفرت اور خوف کے نظریے کے طور پر فروخت کرتے ہیں۔ تغیر کے ایسے زمانے میں جب سیاست کا زور ہو، روشن خیال قوانین کا نفاذ نہایت ضروری اور منصفانہ نظام کا قیام بقا اور ترقی کے لیے لازمی ہے۔

اقبال احمد

روزنامہ "ڈان"، کراچی

(۱۸ فروری ۱۹۹۷)

Scanned with CamScanner

***

شانتی نگر کے زخم

ضلع خانیوال میں ہونے والے فسادات کے پانچ روز بعد جب ہماری گاڑی شانتی نگر گاؤں میں داخل ہو رہی تھی تو ایک فوجی جوان نے اسے روکا اور ہماری شناخت کرنے کے بعد ہی ہمیں گاؤں میں داخل ہونے دیا۔ ڈرائیور، جو ۶ فروری کے فسادات کے بعد سے دو بار وہاں آ چکا تھا، بولا کہ آنے جانے والوں کی شناخت کی پڑتال اس واقعے کے بعد سے فوجی جوانوں کا معمول بن گئی ہے۔ فوج کو ہنگاموں پر قابو پانے کے لیے طلب کیا گیا تھا اور وہی فسادات کی تحقیقات بھی کر رہی ہے۔

بڑے پیمانے پر ہونے والی تباہی کے آثار دور ہی سے دکھائی دینے لگے تھے۔ گاؤں میں پہنچ کر ہم نے مردوں اور عورتوں کو اپنے جلے ہوئے مکانوں اور سامان کے ملبے پر روتے ہوئے دیکھا، جبکہ امدادی رضاکار انھیں نقصان کا تخمینہ لگانے میں مدد دے رہے تھے۔ بیسیوں کی تعداد میں مکان اور دکانیں، فرنیچر اور سازوسامان سمیت، جل کر خاک ہو چکی ہیں۔ زیادہ قیمتی چیزیں، مثلاً مویشی، زیور اور الیکٹرانک کی اشیا، فسادیوں نے لوٹ لیں۔ گرجاگھروں اور اسکولوں کو بھی حملہ کر کے تباہ کیا گیا۔ فساد میں استعمال کیے جانے والے پٹرول بموں، دستی بموں اور نامعلوم دھماکا خیز مادّوں کی پیدا کردہ حدّت سے بیشتر مکانوں کی کنکریٹ کی چھتیں بیٹھ گئیں، دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں اور فولادی گرڈر اور چھت کے پنکھے مڑ گئے یا پگھل گئے۔

شانتی نگر، جو خانیوال سے بارہ کلومیٹر مشرق میں واقع ہے، ضلعے کے آٹھ عیسائی گاؤں میں سے ایک ہے۔ عیسائیوں کو یہاں ۱۹۱۶ میں انگریزوں نے پنجاب کے نہری نظام کی تعمیر کے بعد اپنی "آبادکاری کی پالیسی" کے تحت بسایا تھا۔ گاؤں میں تقریباً پندرہ ہزار عیسائی رہتے ہیں اور مسلمانوں کے کوئی بیس پچیس گھر ہیں۔ زیادہ تر عیسائی زمینوں کے مالک اور کاشتکار ہیں اور خاصے خوش حال سمجھے جاتے ہیں۔ نوجوان نسل کے بہت سے لوگ صوبے کے دوسرے حصّوں میں کام کرتے ہیں اور بعض سرکاری ملازمت میں ہیں۔

"ہم معاشی طور پر برباد ہو گئے۔ پچھلے پچاس برس میں ہم نے جو کچھ جمع کیا تھا، سب تباہ کر دیا گیا،" گاؤں کے ایک باسی دانیال بھٹی نے کہا۔ گاؤں کے رہنے والوں کے ابتدائی اندازوں کے مطابق متاثرہ خاندانوں کا نقصان پانچ ہزار سے لے کر پندرہ لاکھ تک کا ہوا ہے۔

شانتی نگر ـــــ یعنی امن کے مقام ـــــ اور خانیوال میں فساد کی شروعات ۵ فروری کی شام کو ہوئی جب موٹرسائیکلوں پر اور گاڑیوں میں سوار کچھ افراد، جن کی شناخت نہیں ہو سکی، علاقے میں یہ افواہ پھیلاتے پھرے کہ شانتی نگر کے ایک عیسائی باشندے راج مسیح عرف بابا راجی نے قرآن کی بے حرمتی کی ہے۔ انھوں نے الزام لگایا کہ قرآن کے پھٹے ہوئے اوراق، جن پر توہین آمیز کلمات درج ہیں، شانتی

Scanned with CamScanner

نگر سے ایک کلو میٹر دور واقع ایک چھوٹی سی مسجد میں ایک درزی عبدالرحمن ڈوگر کو ملے ہیں۔ پولیس کو ڈوگر کی شکایت پر ایف آئی آر درج کرنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔

خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ خانیوال شہر اور اس کے گردونواح کی مسجدوں سے کئی بار اعلان کیے گئے جن میں مسلمانوں کو اکٹھا ہو کر شانتی نگر اور دوسری عیسائی آبادیوں پر ہلا بولنے اور مبینہ توہین کا انتقام لینے کی ترغیب دی گئی۔ مسجدوں سے عیسائیوں کے خلاف اعلانات کرنے والوں یا موٹر سائیکلوں پر اور کاروں میں سوار ہو کر یہ افواہ پھیلانے والوں کو پہچانا نہیں جا سکا۔

خانیوال کے اسسٹنٹ کمشنر محمد اسلم ملک کا کہنا ہے کہ یہ تمام واقعہ نہایت منظم انداز میں پیش آیا۔ "منصوبہ تیار کرنے والوں نے رمضان کی ستائیسویں شب کا انتخاب کیا جب مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ ہزاروں افراد کو مشتعل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ سب بالکل اچانک ہوا۔ متعدد موٹر سائیکل سوار ایک دم شہر اور اس کے ارد گرد کے دیہات میں نمودار ہو گئے اور یہ خبر پھیلانے اور مسلمانوں کو مبینہ بے حرمتی اور توہین کا انتقام لینے اور عیسائیوں پر حملہ کرنے کے لیے اکسانے لگے۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں انھوں نے بیس ہزار مشتعل اور مسلح افراد کا ہجوم اکٹھا کر لیا۔"

جس چھوٹی سی مسجد کے پاس مبینہ طور پر قرآن کے پھٹے ہوئے اوراق ملے تھے، وہ اب مقفل اور ویران ہے۔ یہاں تک کہ اس کی قریبی دکانیں بھی واقعے کے بعد سے اب تک بند ہیں اور آس پاس رہنے والے لوگ اس موضوع پر بات کرنے سے کتراتے ہیں۔ "جب یہ سب کچھ پیش آیا، میں یہاں موجود نہیں تھا،" وہاں کے ایک مسلمان باشندے نے بتایا۔ "دکان دار پولیس کی تفتیش کے خوف سے دکانیں بند کیے بیٹھے ہیں،" پاس ہی رہنے والا ایک لڑکا بولا۔ اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی کہ عبدالرحمن ڈوگر، جس نے پولیس کے پاس رپورٹ درج کرائی تھی، گرفتار ہوا ہے یا نہیں۔

ضلعی انتظامیہ اور پولیس اہلکاروں سے کی جانے والی بات چیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابا راجی پر لگایا جانے والا الزام قطعی بے بنیاد تھا، اور یہ تاثر بہت قوی ہے کہ پورے واقعے کی منصوبہ بندی پولیس والوں نے کی جو اب شبے میں معطل ہیں اور فوجی اہلکاروں اور ملتان کی ضلعی انتظامیہ کے نمائندوں پر مشتمل تفتیشی ٹیم نے انھیں گرفتار کر رکھا ہے۔

شانتی نگر کے ساٹھ سالہ ان پڑھ باشندے بابا راجی کے مکان پر ۱۴ جنوری کی رات کو پولیس اہلکاروں ـــــ اے ایس آئی صادق محمد اور تین کانسٹبلوں محمد رمضان، نور نبی اور خادم ـــــ نے جوے کا اڈا چلانے کے الزام میں چھاپا مارا۔ بابا راجی نے، جو تانگا چلاتا ہے، اس الزام کی تردید کی، لیکن چھاپا مارنے والوں نے اس کے مکان کی تلاشی لینے پر اصرار کیا۔ تلاشی کے دوران پولیس والوں نے مبینہ طور پر بائبل کی بے حرمتی کی اور بابا راجی کو پکڑ کر تھانے لے گئے۔

گاؤں کے کچھ باشندوں نے خانیوال کے ڈی ایس پی حبیب احمد گھمن اور ایس ایچ او عزیزالرحمن ڈوگر سے مل کر بابا راجی کی رہائی اور پولیس اہلکاروں کے خلاف بائبل کی بے حرمتی کی شکایت درج کرنے کا

مطالبہ کیا۔ باباراجی کو رہا کر دیا گیا لیکن پولیس والوں کے خلاف مقدمہ درج نہ کیا گیا جس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے عیسائی برادری نے ۱۷ جنوری کو ایک جلوس نکالا۔ اس سے مجبور ہو کر پولیس کے اعلیٰ حکام نے واقعے میں ملوّث پولیس اہلکاروں کو معطل اور گرفتار کیا۔ لیکن، کہا جاتا ہے، ان کے ساتھ ملزموں والا سلوک قطعی نہیں کیا گیا اور ۳ فروری کے انتخابات میں ڈیوٹی ادا کرنے کے لیے طلب بھی کیا گیا۔ عیسائیوں کا الزام ہے کہ پولیس والوں کو ایک سول جج نے ضمانت پر رہا کر دیا اور شانتی نگر کے رہنے والوں کے خلاف سازش تیار کرنے اور مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف بھڑکانے میں مصروف ہو گئے۔

خانیوال کے متعدد مسلمان باشندے بھی اس شبے کا اظہار کرتے ہیں کہ اس واقعے میں پولیس ملوّث تھی۔ "ہم یہاں برسوں سے پُرامن طور پر رہ رہے تھے۔ ماضی میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، اور پھر اچانک ہمیں عیسائیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر اشتعال پھیلا دکھائی دیا۔ اُس الزام پر یقین کرنا ناممکن ہے جس کے نتیجے میں فسادات شروع ہوئے۔ یہ پوری سازش پولیس والوں کی تھی جو اپنی معطلی کا بدلہ لینا چاہتے تھے،" ایک ٹیکسی ڈرائیور کرم الٰہی نے کہا۔

خانیوال میں چند عیسائی پادریوں کی جان ان کے مسلمان دوستوں نے بچائی۔ کچھ مسلمان مذہبی رہنماؤں نے، جن کا نام لوگوں کو بھڑکانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا، اس واقعے کی مذمّت کی اور قرآن کی توہین کے الزام کو بالکل غلط قرار دیا۔ "بعض مقامات پر مسلمان مذہبی رہنماؤں نے صورت حال کو معمول پر لانے میں مدد دی اور لوگوں کو سمجھایا کہ وہ عیسائی مخالف اشتعال میں آ کر ہوش نہ کھو بیٹھیں،" پیٹر جیکب نے کہا۔ بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ فسادات کرانے والوں نے حرکت الانصار نامی مذہبی تنظیم سے بھی مدد مانگی تھی جو بھارتی مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے لیے کام کر رہی ہے اور علاقے میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانے کی کوشش کر رہی ہے۔

"ساڑھے آٹھ بجے کے قریب جب ہم نے عیسائیوں کے خلاف اعلانات سنے اور ہمیں معلوم ہوا کہ آس پاس کے گاؤں سے ہزاروں افراد آ کر شانتی نگر کے عیسائی شہریوں پر حملہ کرنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں تو ہم نے فوری طور پر ضلعی انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ ہمارے گرجاگھروں اور مکانوں کی حفاظت کا بندوبست کریں۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (جنرل) نے ہمیں یقین دلایا کہ ضلعی انتظامیہ ہمارے خلاف مسلمانوں کے ممکنہ حملے کو ناکام بنانے کا انتظام کر رہی ہے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ملتان سے فوج اور اضافی پولیس ریزرو دستے طلب کر لیے گئے ہیں،" شاہانہ روڈ پر واقع سینٹ جوزف کیتھولک چرچ سے ملحق اسکول کے ایک استاد اصغر فضل نے بتایا۔

"انتظامیہ سے ہماری بات چیت کے چند گھنٹے بعد ہم نے دو سو افراد کے ایک ہجوم کو گرجاگھر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ گرجاگھر کے اندر گھس آئے اور توڑپھوڑ کرنے لگے۔ وہ پادری کے گھر اور اسکول کی عمارت میں بھی داخل ہو گئے اور پٹرول بم پھینک کر اور قالینوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔

فرنیچر نے آگ پکڑلی اور ہمیں جان بچا کر بھاگنا پڑا،" فضل نے کہا۔ "پولیس نے ہجوم کو روکنے یا ہماری حفاظت کرنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ اُس رات یہی واقعات تین اَور گرجاگھروں میں بھی پیش آئے۔"

فضل نے یاد کیا کہ رات کے واقعے کے بعد گرجاگھر پر پولیس تعینات کر دی گئی تھی، لیکن مشتعل افراد اگلی صبح پھر واپس آئے تاکہ جو کچھ باقی رہ گیا تھا اُسے تباہ کر سکیں۔ "اُس وقت اسکول کے ہاسٹل میں کوئی ڈیڑھ سو طلبا موجود تھے۔ جب ہجوم نے اسکول اور ہاسٹل کی عمارت کو آگ لگائی تو بڑے لڑکے کھڑکیوں سے کود گئے اور چھوٹے لڑکے پلنگوں کے نیچے چھپ گئے جنھیں فسادیوں کے جانے کے بعد وہاں سے نکالا گیا۔ پولیس ہجوم کے ہاتھوں گرجاگھر اور اسکول کی تباہی کا تماشا دیکھتی رہی،" فضل نے بتایا۔

رات کے وقت شانتی نگر پر حملہ کرنے کی غرض سے جو ہجوم اکٹھا ہونا شروع ہوا تھا وہ کہا جاتا ہے کہ صبح تک بیس ہزار کی نفری تک پہنچ گیا اور یہ سب لوگ شانتی نگر سے ایک کلومیٹر باہر آکھڑے ہوئے۔ ڈپٹی ایس پی سی آئی اے چودھری ریاض اور میجسٹریٹ چودھری اسلم کی قیادت میں پانچ سو کی نفری پر مشتمل پولیس پارٹی بھی صبح کے وقت وہاں پہنچ گئی۔ انھوں نے شانتی نگر کے رہنے والوں کو اطلاع دی کہ قرآن کی بے حرمتی پر مشتعل ہو کر ہزاروں لوگ جمع ہو گئے ہیں اور بستی پر حملہ کرنے والے ہیں۔

"انھوں نے ہم سے کہا کہ کوئی فکر نہ کریں اور اگر خیریت چاہتے ہوں تو ان افراد کو پولیس کے حوالے کر دیں جنھوں نے پولیس والوں کے خلاف بائبل کی بے حرمتی کا مقدمہ درج کرایا تھا۔ میجسٹریٹ نے بتایا کہ اگر بستی والوں نے تعاون نہ کیا تو پولیس کے لیے تیس ہزار افراد کے اس جلوس کو روکنا ممکن نہیں ہو گا جو شانتی نگر کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے،" شفیق مہدی خان نے یاد کیا۔ "ہم نے کہا کہ ہم کسی کو حوالے نہیں کریں گے کیوں کہ اس کا مطلب اُسے موت کے منہ میں بھیجنا ہو گا۔" اس کے باوجود، کہا جاتا ہے، پولیس نے تین عمر رسیدہ افراد ـــــ ساٹھ سالہ چمن، ساٹھ ساہ سردار اور پینتالیس سالہ بشیر ـــــ کو اٹھالیا جو اب تک لاپتا ہیں۔

بستی والوں نے بتایا کہ صبح نو بجے تک بڑی تعداد میں مسلح افراد شانتی نگر میں داخل ہو چکے تھے اور مختلف مقامات پر تعینات کیے گئے پولیس کے اہلکار ہٹا لیے گئے تھے۔ "پولیس نے فسادیوں کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی جنھوں نے پانی اور بجلی کی لائنیں کاٹ دیں، ہمارے گھروں میں گھس آئے، ہمارا اسباب لُوٹا، مویشی کھول کر لے گئے، مردوں کو مارا، عورتوں کے ساتھ بدسلوکی اور بدتمیزی کی اور پٹرول بم اور ایک نامعلوم آتش گیر پاؤڈر چھڑک کر ہمارے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگا دی،" شفیق خان نے کہا۔

"میں اُس ہولناک صبح کو کبھی نہیں بھول سکتی،" پندرہ سالہ عذرا روز نے کہا۔ "انھوں نے ہمیں بازوؤں سے پکڑلیا اور زبردستی کلمہ پڑھوایا۔ انھوں نے دھمکیاں دیں کہ جس نے ان کا حکم نہیں مانا اسے

Scanned with CamScanner

جان سے مار دیا جائے گا۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کی پٹائی بھی کی۔"

"چاروں طرف عورتیں چیخ چلا رہی تھیں۔ بہت سے لوگوں نے اپنے گھروں سے نکل کر پہلے شانتی نگر کے ایک کونے میں اور پھر دوسرے کونے میں پناہ لینے کی کوشش کی، لیکن اس تمام جدوجہد کا پولیس پر کوئی اثر نہ ہوا اور انھوں نے کوئی اقدام نہ کیا،" ۵۰ سالہ رحمت نے بتایا۔ رحمت کا بازو فسادیوں نے توڑ ڈالا۔ اطلاعات کے مطابق ۵۰ افراد زخمی ہوئے۔

"پولیس والے فسادیوں کے آگے آگے چل رہے تھے اور فساد رکوانے کے بجائے ہمیں اپنے مکان اور دکانیں خالی کرنے کا حکم دے رہے تھے،" ۶۵ سالہ شریف نے کہا۔ شریف کا الزام ہے کہ کچھ پولیس والے فسادیوں کے ساتھ مل کر عیسائیوں کو مار بھی رہے تھے اور انھوں نے شانتی نگر کے ارد گرد کے علاقے میں تمام گرجا گھروں اور پادریوں کے گھروں کو حملہ کر کے تباہ کرنے میں بھی حصہ لیا۔

ایک اور مشتعل ہجوم نے شانتی نگر سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع عیسائیوں کے تقریباً ۵۰۰ کچے گھروں پر مشتمل بستی ٹبہ کالونی پر حملہ کیا۔ پوری کالونی کو گرجا گھروں سمیت آگ لگا دی گئی۔ "جب ہم نے انھیں آتے دیکھا تو ہم سب جان کے خوف سے بھاگ کر گاؤں کی طرف آ گئے،" اسکول کی استانی میری روز نے بتایا۔ "جب شام کے وقت ہم واپس آئے تو ہمارے گھروں کی ہر چیز یا تو لوٹی جا چکی تھی یا جل کر راکھ ہو چکی تھی۔"

خانیوال کے اسسٹنٹ کمشنر نے پولیس کی بے عملی اور شانتی نگر اور ٹبہ کالونی پر ہجوم کے حملے کے وقت کوئی اقدام نہ کرنے کے فیصلے کی مدافعت کی۔ "اگر پولیس ہجوم کو روکنے کی کوشش کرتی تو اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کی جان ضائع ہو سکتی تھی کیوں کہ ہجوم میں شامل بہت سے افراد ہتھیار لیے ہوئے تھے۔ درحقیقت پولیس کی بے عملی سے بہت سے لوگوں کی جان بچی،" اسسٹنٹ کمشنر نے کہا۔

اس نے دعویٰ کیا کہ انتظامیہ نے ان واقعات کو ہونے سے روکنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے بس میں تھا۔ "ہم نے ملتان سے ریزرو پولیس کے دستے منگوائے، لیکن ہجوم اپنی کثیر تعداد اور اسلحہ اور گولا بارود کی وجہ سے بے قابو ہو گیا۔"

فسادی فوج کے آنے پر ہی منتشر ہوئے۔ "لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ دو گھنٹے سے کم وقت میں فسادیوں نے بستی کے ۵۰۰ سے زیادہ مکانوں، گرجا گھروں اور دکانوں کو جلا دیا تھا، اور ہمارے زیورات، ہماری بیٹیوں کے جہیز کا سامان، مویشی اور تمام قیمتی چیزیں لوٹ لی تھیں، اور جو کچھ وہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکے تھے اسے تباہ کر دیا تھا،" ساٹھ سالہ لیاقت داس نے بتایا۔

شانتی نگر کے رہنے والوں کا، جو فوج کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، الزام ہے کہ پولیس نے فوجیوں کو ان کی آمد میں تاخیر کرنے کے لیے غلط اطلاعات دیں کہ بستی میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی ہے۔ بستی والوں نے بتایا کہ فوج کو جب اندازہ ہوا کہ حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں تو اس نے ضلعی انتظامیہ کی اجازت کے بغیر مداخلت کی۔ شانتی نگر کے باشندوں کا عام خیال ہے کہ انتظامیہ نے حالات کو

Scanned with CamScanner

سنبھالنے میں سخت کوتاہی کا مظاہرہ کیا اور فسادیوں کو ان کے منصوبے پر بلا رکاوٹ عمل کرنے میں مدد دی۔

لیکن خانیوال کے اسسٹنٹ کمشنر محمد اسلم ملک نے اس الزام کی تردید کی۔ "ہمیں اس واقعے سے پہلے کی رات کو جوں ہی اطلاع ملی کہ شانتی نگر کے نزدیک مشتعل ہجوم اکٹھا ہو رہا ہے، ہم نے فوراً فوج کو طلب کر لیا تھا۔ فوج ملتان سے صبح نو بجے پہنچی۔ گاؤں میں اس کی آمد میں تاخیر کا سبب یہ تھا کہ فوج کے ضوابط فوجی اہلکاروں کو ہجوم کے درمیان سے گزرنے کی اجازت نہیں دیتے، چناں چہ ہمیں پہلے گاؤں میں داخلے کا راستا صاف کرنا پڑا جسے ہجوم نے گھیر رکھا تھا،" اسلم ملک نے بتایا۔ اس بیان پر تبصرہ کرنے کے لیے کوئی فوجی اہلکار دستیاب نہ تھا۔

پولیس کا دعویٰ تھا کہ لُوٹی ہوئی اشیا بھی فوج کی مدد سے فسادیوں سے برآمد کی جا رہی ہیں۔ "ہم گاؤں گاؤں جا کر مسجدوں سے اعلان کرتے ہیں کہ لوگ شانتی نگر سے جو کچھ لائے ہوں وہ واپس کر دیں۔ فی الحال ہم ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہے ہیں تاکہ حالات مزید خراب نہ ہوں، لیکن ان کے خلاف یقیناً مقدمے درج کیے جائیں گے اور کارروائی ہو گی،" ایک پولیس اہلکار نے کہا۔

شانتی نگر کے متاثرہ خاندانوں نے عیسائی رضاکار تنظیموں کے فراہم کیے ہوئے خیموں میں پناہ لے لی ہے اور یہ تنظیمیں ان کی مدد کرنے میں بہت سرگرم ہیں۔ لوگ حکومت کی بے حسی کی شکایت کرتے ہیں۔ "صدر، وزیرِ اعظم، گورنر یا وزیرِ اعلیٰ کی جانب سے مذمت میں ایک لفظ تک نہیں کہا گیا۔ صرف صوبائی چیف سیکرٹری نے اس واقعے کے بعد شانتی نگر کا دورہ کیا،" فریڈرک نے بتایا۔ فریڈرک کے مطابق سرکاری محکمے متاثرہ افراد کو ریلیف فراہم کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ "حکومت نے صرف ۲۰۰ خاندانوں میں پانچ ہزار روپے فی خاندان امداد تقسیم کی ہے۔" ممکنہ صحت نے واقعے کے پانچ روز بعد طبی امداد کی پیش کش کی۔ تمام امداد عیسائی تنظیموں کی جانب سے آئی ہے۔ لیکن ایک میجسٹریٹ ناصر خان نے دعویٰ کیا مختلف سرکاری محکمے نقصان کا تخمینہ لگانے کے لیے بستی کا سروے کر رہے ہیں۔ ناصر خان نے کہا کہ حکومت نے تمام متاثرہ عمارتوں کی ازسرِ نو تعمیر کا حکم دے دیا ہے اور متاثرہ خاندانوں کو معاوضہ دینے کا معاملہ محکمۂ مالیات میں آگے بڑھا ہے۔ میجسٹریٹ کا یہ بھی کہنا تھا کہ ۷ اور ۸ فروری کو حکومت کی طرف سے کھانا اور ایک درجن خیمے فراہم کیے گئے تھے، مگر بعد میں رضاکار تنظیموں کی جانب سے امداد آنا شروع ہو گئی اور "ہماری امداد کی ضرورت نہ رہی۔"

ناصر جمال

روزنامہ "ڈان"، کراچی

(۱۳ فروری ۱۹۹۷)

Scanned with CamScanner

***

جہنّم میں مکان

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملک ہمارے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ ہم اقلیت ہیں اور اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ زیادتی ہوتی ہے۔ ملک کا قانون صرف اکثریت کو تحفظ دیتا ہے، اقلیتوں کو نہیں۔ مجھے امید نہیں کہ حالات کبھی بہتر ہوں گے۔"

کلیم۔ عمر ۱۴ سال۔ طالب علم، سینٹ جوزف چرچ اسکول، خانیوال۔

"میں نے پاکستان کے قیام کی تحریک کا ساتھ دیا تھا اور جب ہمارا ملک آزاد ہوا تو میں بڑا خوش ہوا تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس ملک میں ایسے واقعات ہوں گے۔"

چرن مسیح۔ عمر ۷۵ سال۔ شانتی نگر، ضلع خانیوال۔

کلیم اور چرن دونوں کے لیے حالات اب پہلے سے بد تر ہو چکے ہیں۔ چرن، جس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خرابی کہاں واقع ہوئی، کہتا ہے کہ وہ زندگی میں پہلی بار اپنے گاؤں شانتی نگر میں خود کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ آزادی کے وقت اس نے لوگوں کے مل جل کر ساتھ رہنے کا جو خواب دیکھا تھا، اور جس کے باعث اس میں آزادی کے لیے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا تھا، وہ خواب اب مٹی میں ملتا جا رہا ہے۔ "ایسے واقعات تو ہم نے انگریز کے وقت میں بھی نہیں دیکھے۔ یہ ملک اُس وقت کی لیجسلیٹو اسمبلی کے ایک عیسائی رکن کے ووٹ کی وجہ سے وجود میں آیا تھا، اور اب یہ ہمارے لیے روز بروز غیر محفوظ ہوتا جا رہا ہے۔"

کمسن کلیم کے لیے حقیقت اس سے بھی کہیں زیادہ ہولناک ہے۔ کلیم کو راہ چلتے ہوئے دکان داروں اور دوسرے راہ گیروں سے جس قسم کے طنزیہ تبصرے سننے کو ملتے ہیں انھوں نے دسویں جماعت کے اس طالبِ علم کو اندر سے بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ بس میں سفر کرتے وقت اسے گردن میں صلیب پہننے کی وجہ سے ساتھی مسافروں کے جو جھڑکیاں اور دھکے سہنے پڑتے تھے، وہی اکثریتی فرقے کے دل میں اقلیت کے لیے اُبلتی ہوئی نفرت ظاہر کرنے کو کافی تھے، لیکن ۵ فروری ۱۹۹۷ کو شانتی نگر میں پیش آنے والے واقعات اس نفرت کے بھڑک اٹھنے کے امکان کا بدترین مظاہرہ ثابت ہوئے۔

کلیم خانیوال کے سینٹ جوزف چرچ اسکول کے ہاسٹل کے اسٹڈی ہال میں اپنے فائنل امتحان کی تیاری میں مشغول تھا کہ اس نے قریب کی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر ایک عجیب و غریب اعلان سنا۔ "کوئی کہہ رہا تھا کہ جہاد کا وقت آ پہنچا ہے۔ جو لوگ مجاہد بن کر ثواب کمانا چاہتے ہوں وہ باہر آ کر جمع ہو جائیں،" اس نے بتایا۔ اس کے بعد اس نے کلہاڑوں، باکیوں اور دوسرے ہتھیاروں سے لیس نوجوانوں کے ہجوم کو اسکول کے احاطے میں داخل ہو کر گرجا گھر پر حملہ کرتے دیکھا۔ "بڑی عمر کے لڑکے پیچھے کی کھڑکیوں

سے کود کر بھاگ گئے لیکن چھوٹے لڑکے کود نہ سکے اور پلنگوں کے نیچے چھپ گئے۔ جب ہجوم نے عمارت کو آگ لگائی تو ہمارے استادوں نے انھیں وہاں سے باہر نکالا،" کلیم ۵ فروری کی رات کے دہشت ناک واقعات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وہ آگ اب تک سرد نہیں ہوئی ہے۔ ایک ہفتے بعد جب کلیم گاؤں میں اپنی ماں سے مل کر واپس آ رہا تھا، اس کی مڈبھیڑ نوجوان مولویوں کی ایک ٹولی سے ہوئی۔ "انھوں نے ایسی باتیں کیں جو میرے لیے ناقابلِ برداشت تھیں۔ انھوں نے کہا کہ عیسائیوں کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اب انھیں گرجاگھر کی نئی عمارت مل جائے گی۔"

کلیم نے اپنے ہاسٹل واپس آ کر پہلا کام یہ کیا کہ دو پوسٹر تیار کیے۔ پہلا پوسٹر یہ تھا: "کیا پاکستان میں عیسائی ہونا جرم ہے؟ ہاں!" دوسرا یہ تھا: "کیا ہمیں پاکستان میں تحفظ حاصل ہے؟ نہیں!"

اور شانتی نگر کی دیواروں پر آپ کو یہی تحریر دکھائی دے گی۔ جلا ہوا سامان جسے فسادیوں نے ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا، اَدھ جلی درسی کتابیں، بیٹھی ہوئی چھتیں ـــــ اور ان سب سے بڑھ کر، دیواروں پر لکھے نعروں کے پیچھے سے جھانکتا ہوا غصہ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں ابھی ابھی جنگ کا میدان بنا تھا۔ اور گاؤں یہ جنگ ہار گیا ہے۔

جلی ہوئی چیزوں کے اس ڈھیر میں نوعمر اعجاز کی دستاویزات بھی تھیں جس کا ایف ایس سی کا نتیجہ ابھی حال ہی میں آیا تھا اور جو فوج میں بھرتی کی درخواست دینے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے اپنے رزلٹ کارڈ کی تو دوسری نقل مل جائے گی لیکن اصل سوال یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن سے اُس واقعے کی دہشت ناک یادیں جھٹک کر اپنے ملک کے محافظوں میں شامل ہونے کی آرزو پوری کرنے کے قابل ہو سکے گا یا نہیں۔

خانیوال کے گرجاگھروں اور شانتی نگر کے مکانوں پر پُرتشدد حملوں کے تکلیف دہ اثرات عیسائی برادری کو خصوصاً اور وہاں رہنے والے تمام باشندوں کو عموماً محسوس ہو رہے ہیں۔ "یہ اب رہنے کے لیے محفوظ جگہ نہیں رہی۔ اب ہمارے ذہنوں پر خوف ہمیشہ چھایا رہے گا،" ساٹھ سالہ چراغ مسیح کہتا ہے جو اب اپنے مکان کے صحن میں دن گزارنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یہ مکان، وہ کہتا ہے، اب اسے اپنے مکان جیسا نہیں لگتا۔ چراغ کا نوجوان بیٹا ندیم اپنے احساسات کو زیادہ صاف گوئی سے بیان کرتا ہے۔ "اب دشمنی کا بیج پڑ گیا ہے، اور جس کو بھی موقع ملے گا وہ حساب برابر کرنے کی کوشش کرے گا۔"

اس شرمناک واقعے کے اثرات اس علاقے کی زندگی سے آسانی سے محو ہونے والے نہیں۔ حملے کے بعد سے کلیم کے اسکول میں ۱۵۰ میں سے صرف ۳۵ طلبا واپس آئے ہیں۔ خانیوال کے تمام گرجاگھروں اور عیسائیوں کے مکانوں پر پولیس یا فوج کا پہرا ہے۔ اور عیسائی نوجوانوں میں پایا جانے والا غصہ، جس میں ایک غیر دانش مند انتظامیہ اور ناعاقبت اندیش سیاست دان مزید اضافہ کر رہے ہیں، نہ صرف خانیوال بلکہ پورے ملک میں اقلیتی اور اکثریتی فرقوں کے پُرامن بقائے باہمی کے سلسلے میں تباہ کن اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

تاہم، وہاں کے مسلمان باشندوں کے رد عمل میں روشنی کی ایک کرن دکھائی دیتی ہے۔ "یہ ایک نہایت افسوس ناک واقعہ تھا، اور مجھے اس کا بہت رنج ہے۔ ہم اتنے طویل عرصے سے ساتھ رہتے آئے ہیں اور کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ سب ہماری جانب موجود چند مفسدوں کی وجہ سے ہوا،" خانیوال کے ایک مسلمان دکان دار نے کہا۔ یہ وقت ہے کہ اکثریتی فرقے کے دوسرے افراد بھی کشیدگی کو کم کرنے کے سلسلے میں اپنی ذمے داری محسوس کریں کیوں کہ زیادتی کا شکار ہونے والی برادری کے بعض افراد کے ذہنوں میں دوسرے درجے کا شہری ہونے کا شدید احساس جڑ پکڑنے لگا ہے۔

پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کی صورت حال کبھی بہت خوشگوار نہیں رہی، لیکن شانتی نگر میں جس وسیع پیمانے پر تباہی ہوئی اور اس نے جس قسم کا رد عمل پیدا کیا اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ "بہت ہو چکا۔ اب ہمارے صبر کا مزید امتحان نہیں لیا جانا چاہیے۔ یہ ملک ہمارا بھی ہے، ہم نے بھی اسے وجود میں لانے کی کوششوں میں حصہ لیا تھا، اور اس ملک نے ہمیں کیا دیا ہے؟ جنگ کے دنوں میں ہمیں جاسوس کہا جاتا ہے اور امن کے دنوں میں چوہڑا جیسے خطابات دیے جاتے ہیں۔ کیا ہم اسی سلوک کے مستحق ہیں؟" یہ جمی ڈینز کا سوال ہے جو اقلیتی رہنما کے طور پر اپنی سیاسی سرگرمیوں سے دستبردار ہو چکا تھا لیکن شانتی نگر کے واقعے نے اسے اپنی خاموشی ترک کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

جمی ڈینز کی طرح کچھ دوسرے عیسائی رہنما بھی شانتی نگر کے رہنے والوں کے جذبات کی تسکین کرنے میں مصروف ہیں ـــــ اور ان میں سے بعض کے اپنے ذاتی مفادات ہیں ـــــ جہاں مزید تشدد کے لیے فضا خاصی سازگار دکھائی دیتی ہے۔ شانتی نگر کے واقعے پر ہونے والا بے مثال احتجاج، جس میں کراچی میں ایک شخص کی جان گئی، بظاہر عیسائی برادری کے اس غصے کا اظہار ہے جو بہت عرصے سے اندر ہی اندر بڑھ رہا تھا۔

سیکڑوں پولیس والوں کی موجودگی میں جس آسانی کے ساتھ شانتی نگر کے امن کو تہ و بالا کر دیا گیا اس نے علاقے کے پورے سماجی ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیا ہے، لیکن اس نے پورے ملک کو اس بات پر غور کرنے کا موقع بھی دیا ہے کہ ہم نے اپنی آزادی کے پچاس برسوں میں کس طرح کا معاشرہ پیدا کیا ہے۔ شانتی نگر میں بھڑکنے والی آگ نفرت کی اُس روایت کا جشن مناتی ہے جو امن کے رواج کے پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہی ہے اور جسے اب تک چیلنج نہیں کیا گیا۔

مظہر زیدی

روزنامہ، "دی نیوز"، کراچی

(۲۱ فروری ۱۹۹۷)

Scanned with CamScanner

کراچی کی کہانی (۱)

ناؤں مل ہوت چند　　جان برنٹن　　کیول رام رتن مل ملکانی　　پیر علی محمد راشدی
نگیندر ناتھ گپتا　　لوک رام ڈوڈیجا　　سہراب کٹرک　　فیروز احمد
گوپال داس کھوسلا　　موہن کلپنا　　شیخ ایاز　　سوبھو گیانچندانی　　کیول موٹوانی
حاتم علوی　　حسن حبیب　　اے کے بروہی　　انوار شیخ
میر امداد علی　　عبدالحمید شیخ　　حسن منظر　　اسد محمد خاں
سیگرڈ کاہلے　　انیتا غلام علی　　عارف حسن

۴۱۵ صفحات، کراچی کے مختلف ادوار کے ۱۲ نقشے
مجلد، قیمت: ۱۵۰ روپے

کراچی کی کہانی (۲)

فہمیدہ ریاض　　اختر حمید خاں　　آصف فرخی
محمد حنیف　　زینت حسام　　بجمن انتھونی　　شریف سوز
لیاقت منور　　بیکسٹر بھٹی　　نسرین اسٹیفن　　آصف شہباز
محبوب جان　　تسنیم صدیقی　　کینتھ فرنانڈیز
یان فانڈر لنڈن　　اکبر زیدی　　مارک ٹلی　　عارف حسن

۴۰۸ صفحات، کراچی کے بارے میں اہم اعداد و شمار، کتابیات
مجلد، قیمت: ۱۵۰ روپے

Scanned with CamScanner

قلمکار اور قاری کے درمیان ایک پُل

سہ ماہی

نیا ورق

مدیر: ساجد رشید

36/38, Alooparoo Bldg., 4th Floor, Room 25,
Umer Khadi Cross Lane, Mumbai 9.

ادب اور فنونِ لطیفہ کا ترجمان

سہ ماہی

ذہنِ جدید

مرتب: زبیر رضوی

پوسٹ بکس ۷۰۴۲، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اردو ادب کا شش ماہی انتخاب

سوغات

مدیر: محمود ایاز

۸۴، تھرڈ مین، سیکنڈ کراس، ڈیفنس کالونی، اندرانگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۸

ماہ نامہ

شب خون

ترتیب و تہذیب: شمس الرحمن فاروقی

پوسٹ بکس ۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

سہ ماہی

جامعہ

ترتیب: شمیم حنفی، سہیل احمد فاروقی

ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

Scanned with CamScanner

سید محمد اشرف

نمبردار کا نیلا

۱

ہوا بالکل خاموش تھی اور آرہر کے اس لمبے چوڑے کھیت کو گھیرے میں لیے پچاس ساٹھ آدمیوں کی موجودگی کے باوجود غضب کا سناٹا تھا۔ پاگل نیلا اسی کھیت میں کسی جگہ موجود تھا۔ لاٹھیاں، ڈنڈے اور سانٹھیں تھامے وہ سارے آدمی پنجوں کے بل چل رہے تھے اور پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ اگر کھڑی فصل میں سے نمودار ہو کر اپنے نکیلے سینگ پر رکھ کر ریلتا ہوا، پٹخنیاں دیتا ہوا، کھُروں سے کھوندتا ہوا لہولہان کرتا ہوا وہ بھاگے تو کیا ہو گا ـــــ یہی سوچ ہر آدمی کے کانوں میں دھڑکن بن کر دھک دھک کر رہی تھی۔

اچانک ہوا چلی، آرہر کے پودوں کی شاخیں آپس میں ٹکرا کر بجیں اور ہر آدمی کو وہ آواز نیلے کی بھگدڑ کی طرح محسوس ہوئی، اور ہر آدمی کے منھ سے ڈری ڈری سی چیخ نکل پڑی۔ جب کسی کے پاس بھی پودوں کو چیرتا ہوا نیلا نہیں نکلا تو سب کی جان میں جان آئی۔ طے یہ ہوا تھا کہ سب کے سب گھیرا بندی اس طرح کریں گے کہ ایک آدمی سے دوسرے آدمی کا فاصلہ ایک لاٹھی کی لمبائی سے زیادہ نہ ہو، تاکہ اگر نیلا اچانک اندر سے حملہ کرے تو ہر آدمی کے پاس ایک لاٹھی کے فاصلے پر کم از کم دو بچانے والے موجود ہوں۔ دائرے میں چلتے چلتے اگر ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو جاتا تو دل دھڑکنے لگتا اور فوراً رفتار کچھ تیز کر کے یا دھیمی کر کے فاصلہ ایک لاٹھی کے برابر

کر لیتے، جیسے عید کی نماز میں کن انکھیوں سے تکبیریں درست کی جاتی ہیں۔ گرمی اور خوف کے مارے سب کے ہاتھ لاٹھیوں پر پسیجنے لگے تھے۔ نتھو چچا نے کھوج دیکھ کر بتایا تھا کہ کھیت میں جانے کے کھوج تو ہیں، باہر نکلنے کے نہیں۔ یعنی نیلا یقیناً کھیت کے اندر ہے۔ نیلا یا تو بیٹھا تھا یا ساکت کھڑا تھا۔ لیکن وہ اپنی دُم کو اتنی دیر تک بے حرکت نہیں رکھ سکتا۔ دُم ہلتی تو کسی ارہر کے پودے سے ضرور ٹکراتی۔ ٹکراتی تو آواز نہ ہوتی؟ لیکن کھیت کے اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ اس کا مطلب، وہ کھیت کے اندر ایک ایسا محفوظ گوشہ تلاش کر کے بیٹھا ہے جہاں فصل ماری گئی ہے اور پودے برائے نام ہیں۔ کھیت میں فصل کہاں کہاں ماری گئی ہے، یہ بات نمبردار اودل سنگھ اور ان کے نوکروں کو معلوم تھی۔ لیکن وہ کسی بھی سوال کا صحیح، براہِ راست اور فطری جواب نہیں دے رہے تھے۔ وہ صحیح جواب اس لیے بھی نہیں دے رہے تھے کہ وہ اس مہم میں براہ راست فریق بن کر سامنے آنا نہیں چاہ رہے تھے۔ بستی کی آبادی کے دباؤ میں وہ بمشکل اس بات پر راضی ہوئے تھے کہ ہانکا کر کے نیلا نکال کر اسے صرف اتنا مارا جائے کہ وہ باڑے میں بند کیا جا سکے۔ پچاس ساٹھ جوانوں کی تعداد کافی تھی اگر وہ فصل کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دیتے۔ طریقہ بھی یہی ہوتا ہے کہ جنگلی جانور اگر کسی فصل کے اندر چھپا ہوا ہو تو چاروں طرف سے گھیرا کر کے کچھ لوگوں کو فصل کے اندر داخل کر دیتے ہیں، شور مچا مچا کر جانور کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور جانور باہر نکلتے ہی داب لیا جاتا ہے۔ ٹھاکر اودل سنگھ کا خیال تھا کہ اس طرح فصل کے اندر داخل ہونے سے فصل برباد ہو گی اور ساتھ ہی ساتھ تلسی کے پودے بھی پیروں تلے روندے جائیں گے، جس سے ان کی بے حرمتی ہو گی۔ لوگوں نے پوچھا، ارہر کے کھیت میں تلسی کے پودے کہاں سے آئے؟ ٹھاکر نے جواب دیا کہ یہ دراصل تلسی کا ہی کھیت تھا، ارہر تو کسی مجبوری کی وجہ سے اگانی پڑی۔ لوگوں نے کہا کہ اتنے بڑے کھیت میں تلسی کی کاشت کے کیا معنی۔ تلسی تو گملوں میں بھی اگائی جا سکتی ہے کہ اس کا مصرف ہی کتنا ہے؛ کبھی کبھی نزلے زکام میں پتیاں اُبال کر پی لیں یا کبھی کبھی پوجا کر لی۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے جواب دیا کہ تلسی کی فصل کا صرف اتنا ہی کام نہیں ہے۔ جب تلسی بڑھتی ہے تو اس کی پتیوں میں سورج کی تیز چمک سے ایک خاص مادّہ پیدا ہوتا ہے۔ اس مادّے میں ایک خوشبو ہوتی ہے۔ ہوا چلے تو وہ خوشبو دور دور تک جاتی ہے۔ جہاں جہاں تک وہ خوشبو پہنچتی ہے وہاں وہاں تک دیگر فصلوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کو مار دیتی

ہے۔ لوگوں نے کہا، ہم نے تو ایسا نہیں سنا۔ نمبردار اودل سنگھ نے کہا کہ اس کے ذمے دار وہ نہیں ہیں۔ تب لوگوں نے کہا، مگر تلسی کے پودے نظر تو نہیں آ رہے۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے جواب دیا، ممکن ہے اندر ہوں۔ اندر جا کر میرے علاوہ تو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا، زیادہ تر تو ارہر کے پودے ہی ہیں، بلکہ ہماری نظر میں تو صرف ارہر کے ہی پودے ہیں۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے کڑک دار آواز میں کہا، نظر دھوکا بھی کھا سکتی ہے۔ اگر اسی دھوکے میں ارہر کی فصل کے ساتھ تلسی کے پودے بھی کچل گئے تو ذمے دار کون ہو گا؟ بولو، ذمے دار کون ہو گا؟ بولو، چپ کیوں ہو گئے؟ سب ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے اور آہستہ آہستہ سب نے خود کو یقین دلایا کہ ارہر کے بڑے کھیت میں یقیناً زیادہ تر تلسی کے ہی پودے ہیں اور تلسی کے پودے کچل جائیں تو شراپ لگے گا۔ دراصل اندر جانے کا خطرہ بھی کوئی مول لینا نہیں چاہ رہا تھا۔ اندر جانے کا مطلب تھا نیلے سے پہلا، براہ راست اور دوبدو مقابلہ، جہاں بھاگنے کی بھی جگہ کا امکان نہیں تھا۔ وہ لوگ دائرے میں چلتے رہے... پسیجی ہوئی لاٹھیاں تھامے، برابر کا فاصلہ رکھتے ہوئے، اپنی سانسوں کی آواز کو سنتے ہوئے، کھیت کی موہوم سے موہوم آواز پر کان رکھے ہوئے۔

ہوا چلی۔ شاخیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ پورے کھیت میں ہوا کے بہاؤ کے رخ پر آوازوں کا ریلا آگے بڑھا۔ ان آوازوں کو لوگوں نے پھر نیلے کی بھگدڑ سمجھا۔ پھر سب کے منھ سے ڈری ڈری چیخیں نکلیں۔ ایک دوسرے کو چیختا سُن کر لوگوں کی چیخیں اور طویل ہو گئیں۔

ایک نسبتاً کم گھنے حصے میں ساکت منوں وزنی گوشت کا سیاہ تودا کنوتیاں ملائے کھڑا تھا۔ دُم تیزی سے بے آواز گردش کر رہی تھی۔ ہری خوراک کے پودوں کے ادھر چاروں طرف دیر سے پہچل سنائی دے رہی تھی۔ مگر کھیت کے اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ کھیت محفوظ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے پودے بجتے تو وہ آواز اس کی مانوس آواز تھی۔ لیکن ان آوازوں کے بعد اچانک آدمی بھی چیخے تھے، اور ایسا دوسری بار ہوا تھا۔ اس بار ابھی تک چیخیں تھمی نہیں تھیں۔ اسے لگا جیسے یہ چیخیں چاروں طرف سے بلند ہو رہی ہیں۔ اسے لگا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ اسے لگا لوگ اس کے بالکل نزدیک ہو گئے ہیں۔ اس کی دُم نے تیزی سے گردش کاٹی۔ اس نے اگلے کھُر مٹی میں مارے۔

باہر لوگوں نے محسوس کیا ان کی سہمی سہمی چیخیں جیسے ہی بند ہوئیں، اندر کھیت میں زوردار آوازیں پیدا ہوئی ہیں۔ اڑڑ... بھڑڑڑ... اڑڑ... بھڑڑڑ... کرتا ہوا نیلا ارہر کے مضبوط پودوں

سے ٹکراتا ہوا پوری رفتار سے ایک طرف بر آمد ہوا۔ ڈری ڈری چیخیں بلند ہوئیں۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں سے لاٹھیاں چھوٹ گئیں۔ کچھ اندھادھند دوسری طرف بھاگے۔ کچھ نے ہمت کر کے لاٹھیاں بلند کر کے وار کیے۔ خون میں لہولہان سیاہ نیلا کھیتوں فصلوں کو پار کرتا ہوا سیدھا آبادی کی طرف دوڑا۔

۲

ٹھاکر اودل سنگھ نے نیلے کو اس کے بچپن سے پالا تھا۔ اس کے پالنے کی وجہ بھی عجیب وغریب تھی اور اس پر ابھی تک بھید کے پردے پڑے ہیں۔ اودل سنگھ بیک وقت دیہات، قصبے اور شہر کے باشندے تھے۔ تینوں جگہ ان کے مکانات تھے۔ گاؤں میں آبائی کھیت تھے اور حکومت، قصبے میں چیئرمینی اور شہر میں تجارت۔ وہ حکومت، تجارت اور سیاست تینوں کو برابر کا وقت اور اہمیت دیتے تھے۔ گاؤں میں گڑھی تھی، قصبے میں حویلی اور شہر میں کوٹھی۔ ایک دن گاؤں کی گڑھی میں چوری ہو گئی۔ پچاس تولے سونا، بیس سیر چاندی کے برتن اور دس ہزار روپے کے علاوہ گروی گانٹھ کے تیس چالیس سونے کے عدد بھی گئے۔ وہ قصبے سے اپنی جیپ میں طوفانی رفتار سے گاؤں پہنچے اور گڑھی کے دیہاتی پہرے داروں کے سر پہ اتنے جوتے بھوائے کہ ڈاکٹری معائنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ ان لوگوں نے روتے روتے اعتراف کیا کہ رات دوسرے گاؤں کی بارات میں کچھ لوگ آئے تھے، انھوں نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر بیڑیاں پیں اور ہمیں اپنی سگریٹیں پلائیں، سگریٹیں پی کر ہم بے ہوش ہو گئے۔ گڑھی کے پیچھے پہرے کے کتے مُردہ پائے گئے؛ ان کے منھ سے نیلا نیلا پانی رِس رہا تھا۔ انھیں گوشت کے پارچوں میں کچلا دیا گیا تھا۔ جس دیہات سے بارات آئی تھی وہاں دوش دی گئی تو بارات کے گھرانے نے ان سگریٹ پلانے والوں سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ بتایا کہ ہم تو ان کو گھراتی سمجھے تھے۔ خیال کیا تھا کہ لڑکی والوں کے دور کے رشتے دار ہیں جو کسی اَور بستی سے بیاہ کے نیوتے میں آئے ہیں۔ ٹھاکر اودل سنگھ دانت پیس کر رہ گئے۔ وہ رات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ جب رات ہوئی ـــــ اور دیہات میں رات

Scanned with CamScanner

شام کے بعد ہو جاتی ہے ـــ تو انھوں نے گڑھی کے دروازے بند کرا کے تیسرے دالان کے پیچھے والے کوٹھے میں جا کر اوپر جانے والی سیڑھیوں میں سیڑھی نمبر تین کی پٹیاں ہٹا کر معائنہ کیا اور اطمینان کیا کہ ڈالڈا کے تینوں ڈبوں میں وہ سارے سونے کے زیور ویسے کے ویسے ہی موجود ہیں جو اُدھار لینے والوں نے ضمانت کے طور پر رکھوائے تھے اور جو سُود ادا نہ کرنے کے تاوان میں ڈوب گئے تھے اور ٹھاکر اودل سنگھ کی دولت کے سمندر میں اُبھر آئے تھے۔ وہ لگ بھگ گیارہ سیر سونے کے زیور تھے۔ اس خزانے کو شہر کی کوٹھی میں رکھنے کا مطلب تھا انکم ٹیکس والوں کے خوف سے خود کو بے خواب رکھنا۔ قصبے کی حویلی میں جو خفیہ جگہ بنوائی تھی، اور جسے بنانے والے راج مستری کے کپڑے تعمیر کے دوسرے دن نہر کنارے پائے گئے تھے، وہ اس نقدی کے لیے ہی ناکافی تھی جو ٹھاکر اودل سنگھ نے شہر کے کولڈ اسٹور اور قصبے کی چیسر مینی سے پیدا کی تھی۔ کولڈ اسٹور میں ۹۰ فیصد آلو ان کا خریدا ہوا تھا، لیکن حساب کی کتابوں میں اس کا اندراج دیہات کے کسانوں کے نام ہوتا تھا۔ ایک بار انکم ٹیکس افسر نے ان کسانوں کو نوٹس بھیج کر شہر کے آفس میں بلا کر چیلنج بھی کی تھی۔ کسانوں نے سارے اندراجات اپنے نام میں قبول کیے۔ یہ سارے کسان وہ تھے جو ٹھاکر اودل سنگھ کی گڑھی سے برسات اور سردیوں میں اپنے گھر کے زیور رکھ کر قرضہ اٹھاتے تھے۔ جس دن کسانوں کے بیانات ہوئے تھے اس سے دو دن پہلے ٹھاکر صاحب شہر کے وکیل کو لے کر گڑھی میں آئے تھے اور ان سارے کسانوں کو آنگن میں بٹھا کر سوال جواب کی تیاری کرا دی تھی اور لال اور نیلی رسیدوں والی کتابیں دکھا کر ان سے پوچھا تھا:

"کیا تم یہ رسیدیں پہچانتے ہو؟"

"نہیں،" سب نے ایک آواز ہو کر کہا تھا۔

شہر کا وکیل ٹھاکر صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا اور جلدی جلدی سگریٹ پینے لگا۔ ٹھاکر صاحب نے دانت پیس کر سمجھایا کہ تم سب ان کتابوں کو پہچانتے ہو کیوں کہ ان پر تمھارے انگوٹھوں کے نشان ہیں۔ پھر انھوں نے سب کے انگوٹھوں کے نشان لگوائے۔

انکم ٹیکس دفتر میں کسانوں نے بیک آواز بتایا کہ "اب ہم ان کتابوں کو پہچانتے ہیں اور کولڈ اسٹور میں سارا آلو ہمارا ہی ہے اور ان کتابوں کو تلپٹی کہتے ہیں۔ اور ان پر ہمارے انگوٹھوں کے نشان ہیں۔"

Scanned with CamScanner

انکم ٹیکس آفیسر یہ سن کر چکرایا۔اس نے اپنے انسپکٹر کو دوسرے کمرے سے بلایا۔ انسپکٹر نے اسے پھر سمجھایا کہ "سر، میں خود کئی دنوں تک کسان کا بھیس بنا کر کولڈاسٹور کے آس پاس گھوما ہوں۔ یہ سارا آلو کولڈاسٹور کے مالک کا ہے۔ یہ کسان تیار کیے ہوئے ہیں۔"

آفیسر نے اپنے چیمبر میں آ کر سب کا بیان کاغذ پر درج کیا۔ سب نے ایک ہی بات دُہرائی کہ ہم کسان ہیں۔ آلو پیدا کرتے ہیں۔ فصل پر آلو سستا ہوتا ہے تو ہم اسے کولڈاسٹور میں رکھ دیتے ہیں۔ کولڈاسٹور سے فصل کے بعد والے زمانے میں نکال کر یہ آلو اچھے داموں میں بیچ دیا جاتا ہے۔ سرخ نیلی تلپٹی پر ہمارے ہی انگوٹھے کے نشان ہیں۔"

ان کے چہروں پر کوئی زیادہ جھوٹ بھی نہیں برس رہا تھا۔ انھوں نے ایک ایک لفظ صحیح کہا تھا۔ صرف درمیان میں ایک جملہ اور بھی جوڑا جاسکتا تھا کہ صاحب فصل پر آلو پیدا ہوتے ہی ہم سے اونے پونے خرید لیتے ہیں کہ اُس وقت ہمیں ان کا بیاج ادا کرنا ہوتا ہے۔

افسر نے ان کے چہروں کو پڑھا اور کارروائی مکمل کر کے اطمینان کی سانس لی کہ کیس ختم کرنے سے پہلے ساری ضروری کارروائیاں مکمل ہو گئی تھیں ـــــ کیس پڑھنا، شک کرنا، شک دور کرنے کے لیے نوٹس بھیج کر گواہوں کو بلانا، ان کے بیانات کا اندراج کرنا اور پھر فیصلہ سنا دینا۔ ٹھاکر صاحب نے آفس سے نکلتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کمر سے جھکتے ہوئے "صاحب" کا شکریہ ادا کیا اور اظہارِ افسوس کیا کہ آپ کو اس کیس میں خواہ مخواہ محنت کرنا پڑی اور اتنے لوگوں کے بیانات درج کرنا پڑے۔ صاحب نے خاکساری کے ساتھ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ "یہ تو ہمارا فرض تھا۔"

ٹھاکر صاحب چوری کے بعد کئی دن تک گاؤں میں آتے رہے۔ وہ روز شام کو گڑھی کی بیٹھک میں بیٹھ کر دانت پیستے رہتے اور ان نوکروں کو ماں بہن کی سناتے رہتے جنھوں نے چوروں کے ہاتھوں نشے کی سگریٹیں پی تھیں۔

ایک دن ایسے ہی بیٹھے تھے کہ باہر شور ہوا۔ نکل کر دیکھا تو گڑھی کی چاردیواری میں ایک مادہ نیل گائے دو بچوں کے ساتھ ہانپتی ہوئی اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر، وحشت کے عالم میں دوڑ رہی ہے اور دُھول اڑا رہی ہے۔ گیہوں کے کھیت کٹنے کے بعد کھیت میدان ہو گئے تھے اور چھپنے کی جگہ نہیں بچی تھی۔ کتوں نے رگیدا ہو گا اور بے چاری بچوں کی کم رفتاری سے مجبور ہو کر گاؤں کی

Scanned with CamScanner

سمت بھاگ پڑی ہو گی۔ مادہ تو ٹوٹی ہوئی چار دیواری پھلانگ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ آگے جا کر رک کر مڑ کر بچوں کی طرف دیکھا، دم تیزی سے ہلائی، پھر چار دیواری کی طرف بھاگ کر واپس آئی کہ کتوں نے پھر رگیدا۔ مجبوراً اسے کھیتوں کی طرف بھاگنا پڑا۔ بچوں کو، بھورے بھورے، بڑی بڑی آنکھوں والے، بڑے کتے کی جسامت کے بچوں کو پکڑ کر نیم کے درخت سے باندھ دیا گیا۔ ان میں کا ایک نیم کے درخت سے بندھا بندھا تیزی سے درخت کا طواف کرتا اور جب رسی درخت سے لپٹ جاتی اور گردن میں بل پڑنے لگتے اور آنکھیں اُبلنے لگتیں تو پھر مخالف سمت میں دائرے کاٹنے لگتا۔ اس نے درخت سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سورج غروب ہو رہا تھا تو وہ زمین پر گر کر تیز تیز سانس لینے لگا۔ خون کی اُلٹی ہوئی اور تھوڑی دیر بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ دوسرے بچے کی ٹانگیں باندھ دی گئی تھیں اور اسے نیم کے تنے سے سر ٹکرانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

اتنے میں گاؤں کے لوگ آپہنچے۔ ایک بوڑھے نے تاسف کے ساتھ کہا "ہائے رے دیا گنوماتا کا بدھ ہوئے گیا۔" ٹھاکر کی آنکھیں یہ سن کر چمکنے لگیں۔ انھوں نے بوڑھے کو ڈانٹ کر چپ کرایا اور بتایا کہ اگر ان جانوروں کو پکڑا نہ جاتا تو یہ گاؤں کے غریب کسانوں کے گھروں میں گھس کر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ننھے ننھے بچوں کو اپنے پیروں سے کچل ڈالتے۔ گاؤں والوں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا کہ آج ٹھاکر اودل سنگھ کی وجہ سے ان کے معصوم بچوں کی جان بچ گئی۔

ٹھاکر اودل سنگھ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ مرنے والا جانور کا بچہ کتنا جری اور قوی تھا۔ نیم کے تنے پر بچے کے سر کی مار کے نشان دیکھ کر انھوں نے فیصلہ کیا جو بچہ بچ گیا ہے اسے وہ پالیں گے۔ کیوں کہ اول تو یہ گنوماتا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بڑا ہو کر اجنبیوں کو اپنے سینگوں سے لہولہان کر کے انھیں اپنے کھُروں سے کچل سکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اسے کھلانے پلانے کا کوئی خاص خرچہ نہیں ہو گا؛ کبھی کبھی اپنے کھیتوں کا چارا بھی کھا لیا کرے گا۔ چوتھے یہ گوشت کے پارچے شوق سے نہیں کھاتا۔

ٹھاکر صاحب نے اسے اس انداز سے پالا کہ آدھا وقت وہ قصبے میں رہتا اور آدھا وقت گاؤں میں کاٹتا۔ گاؤں کی گڑھی اور قصبے کی حویلی میں پانچ میل کا ہی تو فاصلہ تھا۔ وہ اسے نیلا کہہ کر پکارتے تھے اور لوگ اسے ٹھاکر کا نیلا کہہ کر بلاتے تھے۔

Scanned with CamScanner

شروع شروع میں بہت دقتیں پیش آئیں۔ اول تو یہ کہ وہ وحشی تھا، کسی طرح بندھنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ پہلے اسے بھوکا رکھا گیا۔ بھوک نے اس کی وحشت کو کم کیا۔ پھر اسے خوب پیٹ بھر کر ضرورت سے زیادہ غذا دی گئی، تب خوش خوری نے اس کی وحشت کو بظاہر ختم کر دیا۔ گاؤں اور قصبے والے اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ٹھاکر اودل سنگھ اسے ہمیشہ باندھ کر رکھتے تھے۔ وہ ہرا چارا ناشتے میں کھاتا تھا، موٹے ناج کی سانی لنچ میں اور ڈنر میں ثابت ناج اور گڑ۔ کبھی کبھی سوپ کے طور پر اس کے منہ میں کھوکھلے بانس کا نلکا ڈال کر سرسوں کا خالص تیل پلایا جاتا۔ دو سال میں اس کا سینہ پُر گوشت، بدن سڈول اور سینگ بلالی ہو گئے۔ ماتھے پر سفید بھنوری کے بال جگہ بنانے لگے۔ ایک دن ٹھاکر صاحب نے محسوس کیا کہ نیلا اب اتنا بڑا اور طاقت ور ہو گیا ہے کہ رسی کی بندش کو صرف عادت کے طور پر فرماں برداری میں قبول کرتا ہے، ورنہ چاہے تو ایک ہی زقند میں رسی اور رسی کے دوسرے سرے پر کھڑے بھوندو کسان کو لے کر اُڑ جائے۔

اگر رسی سے آزاد کر دوں تو کیا بھاگ جائے گا؟ انھوں نے سوچا، اور کچھ یاد کر کے مسکرائے۔ رات میں گڑھی کے آنگن میں لیٹ کر انھوں نے پچھلے سال کا چیئرمینی کا الیکشن یاد کیا۔ ان کی موافقت کے ۷ لوگ ممبری کا چناؤ جیتے تھے اور مخالف امیدوار کی موافقت کے ۸ ممبران فتح یاب ہوئے تھے۔ ان ۱۵ ممبران کو چیئرمین کا انتخاب کرنا تھا۔ پچھلے بیس برس سے وہ بلاشرکت غیرے چیئرمینی کے تنہا امیدوار ہوتے آئے تھے۔ ممبروں کے ذریعے چناؤ محض رسمی خانہ پری ہوتا تھا۔ مگر اب زمانہ بدل رہا تھا۔ کچھ عجیب عجیب سے نعرے سننے میں آتے تھے کہ "ٹھاکر ہی کیوں بارم بار؟ نہیں چلے گا اک پریوار!" یا "ٹھاکر کو ہے ہٹانا، ہم کو بھی آزمانا..."

ابھی چیئرمینی کے چناؤ میں پانچ دن باقی تھے۔ مخالف کیمپ آٹھ امیدواروں کے ساتھ جیتا تھا اس لیے چناؤ سے پہلے ہی جشن منا رہا تھا۔ جشن کی آوازیں کانوں میں آتیں تو ٹھاکر کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ حویلی کی چھت پر کھرنی چارپائی پر لیٹے لیٹے رات گزار دیتے۔ چناؤ سے تین دن پہلے جھمن چمار ممبر غائب ہو گیا۔ پولیس میں گمشدگی کی رپورٹ لکھائی گئی۔ یہ رپورٹ ٹھاکر صاحب نے لکھوائی تھی۔ ان کا بیان تھا کہ جھمن اندر ہی اندر ان کا موافق تھا۔ مخالف امیدوار محمود صاحب اس بات کو جان گئے تھے۔ انھوں نے اسے اغوا کرا کے اسے مروا ڈالا ہے۔ محمود صاحب کی طرف سے بھی رپورٹ ہوئی۔ اس کا لب لباب بھی وہی تھا۔ پولیس نے تفتیش تیز کر دی، یعنی دونوں

Scanned with CamScanner

امیدواروں کو قرقی کی دھمکی دے کر دونوں سے کہا گیا کہ چناؤ کے دن تک مقتول کو ہر حال میں حاضر کرنا پڑے گا۔ دونوں امیدواروں نے پولیس سے وعدہ کیا۔ دن میں ٹھاکر صاحب قصبے کی حویلی میں پولیس کے سب انسپکٹر انچارج کو کھانے کی میز پر تفتیش کراتے اور رات کو بارہ بجے کے بعد گاؤں پہنچ کر گڑھی کے تہہ خانے میں جھمن کو ڈنڈے پر کپڑا لپیٹ کر پٹواتے۔ چناؤ سے ایک دن پہلے انھوں نے جھمن کو سمجھایا کہ "ہمارا ساتھ دینے میں تمھارا جو فائدہ ہے اسے تم سمجھ نہیں پا رہے ہو۔ ایک تو یہ کہ تمھیں چیئرمین بننے کے بعد صفائی کا ممبر انچارج بنا دوں گا۔ صفائی کے عملے کی آسامیاں تم اپنی مرضی سے بھرنا۔ قصبے میں نل لگوانے کا کام بھی تمھارے ہی سپرد ہو گا۔ ۱۰۰ نل منظور ہوتے ہیں، کم از کم ۱۵ ضرور لگوانا ہوں گے۔ روزانہ سڑک کی نالیوں پر چونا ڈلوانے کا ایک بجٹ ہوتا ہے۔ اس پیسے کو تم دھرم کے کام میں لگا سکتے ہو جیسے اپنی بیٹی کی شادی کا کھانا اور کپڑے وغیرہ، کیوں کہ روزانہ چونا ڈلوانے سے نالیوں میں چونے کی لگدی جم جائے گی جس کی وجہ سے مزید گندگی کا خطرہ ہے۔"

انھوں نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ شہر کے کچھ غنڈے اس کی لڑکی کو اغوا کر کے اپنے کام میں لانا چاہتے تھے جن کو ٹھاکر نے بڑی مشکل سے روکا ہے اور ان غنڈوں کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے کہ جھمن ہمارا آدمی ہے۔ آدمی کیا ہمارا بھائی ہے، ہمارا موافق ہے، ہمیں ووٹ دینے جا رہا ہے۔

انھوں نے باتوں ہی باتوں میں یہ بھی سمجھایا کہ ان شہری غنڈوں نے یہ کام صرف ان کے کہنے کی وجہ سے نہیں کیا اور وہ یہ دھمکی دے گئے ہیں کہ اگر جھمن ٹھیک سے راضی نہیں ہوتا تو اس کا گلا کاٹ کر اس کے کپڑے خون میں بھگو کر محمود صاحب کے گھر کے پچھواڑے کھنڈر میں ڈلوا دو۔ یہ سن کر جھمن نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ سلامت پایا تو ٹھاکر صاحب کا ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کیا۔

گڑھی کے خنک آنگن میں لیٹے لیٹے ٹھاکر صاحب نے پچھلے موسم کی اس رات کو یاد کیا اور اس یاد میں مزہ محسوس کیا کہ کیسے انھوں نے اچانک ایک فیصلہ کیا تھا۔ وہ جھمن سے اچانک آواز بدل کر بولے تھے:

"جھمن، تُو کیا سمجھتا ہے کہ میں تجھے اپنی چیئرمینی کے لیے اٹھا کر لایا ہوں؟ نہیں، نہیں،

Scanned with CamScanner

بالکل نہیں۔ ایسا وچار بھی من میں مت لانا... نہیں، تُو شاید اب بھی یہی سوچ رہا ہے..."

جھمن چپ چاپ کھڑا ہولے ہولے کانپتا رہا۔

ٹھاکر نے چہرے پر ایک خاص طرح کا سادھو سنتوں والا تیج پیدا کیا اور بھاری مصنوعی آواز میں بولے:

"چلو جھمن، تمھیں تمہارے گھر چھوڑ آئیں۔ کل جسے دل چاہے ووٹ دینا۔"

وہ حیران کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔ ٹھاکر نے اس کی ٹانگوں سے رسی کھولی، پھر ہاتھوں کی رسیاں کھولیں، اس کی آنکھوں پر انگوچھا باندھا اور اسی عالم میں گاؤں سے لا کر قصبے کی عید گاہ کے پیچھے جا کر جیپ سے اتارا اور انگوچھا کھول کر اس کی چمچماتی آنکھوں میں دیکھنے لگے... دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ بھی انھیں دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ اس نے آج تین دن اور تین راتوں کے بعد اپنے پیروں اور ہاتھوں کو آزاد پایا تھا۔ اس نے آنکھیں مل کر ٹھاکر کا چہرہ دیکھا۔ اسے ٹھاکر کے چہرے کے چاروں طرف ایک ہالا سا نظر آیا جیسے رام لیلا کی تصویروں میں ہوتا ہے۔ ٹھاکر، جو ابھی تک اس کا ایک ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، سوچ رہے تھے کہ یہ ہاتھ چھوڑ دوں یا پکڑے رہوں، اس سے کچھ بولوں کہ کچھ نہ بولوں۔ جھمن نے اس ہاتھ کی پروا نہیں کی۔ اسے اپنی جان بچنے کی اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ اسے خیال ہی نہیں تھا کہ اس کا ہاتھ ابھی تک ٹھاکر کی گرفت میں ہے۔

پو پھٹنے والی تھی۔ بیر کے درختوں میں تیتر بولا۔ نیک شگون لے کر ٹھاکر نے جھمن کی سوکھی کلائیوں میں قدرے اطمینان سے دوڑتے خون کی رفتار کو محسوس کیا اور ہاتھ کو آزاد ہونے کا جو واحد فائدہ جھمن کی سمجھ میں آیا وہ یہ کہ اب اطمینان سے جھک کر دونوں ہاتھ جوڑ سکتا تھا۔ اس نے یہی کیا۔

الیکشن میں ٹھاکر کو ووٹ دینے کے بعد اس نے تھانے میں یہ بیان دیا کہ وہ دل کے اندر سے ہمیشہ سے ٹھاکر صاحب کا موافق رہا ہے۔ محمود صاحب کے ڈر سے وہ دلّی بھاگ گیا تھا اور وہیں نظام الدین اسٹیشن پر تین دن تین راتیں گزار کر آیا ہے۔ پولیس سب انسپکٹر نے فائنل رپورٹ کی اور حاشیے میں ٹھاکر صاحب کے تعاون کا جلی حروف میں ذکر کیا جو اب چیئرمین بھی تھے۔

صرف ایک سال پرانی یاد میں بھی اتنا مزہ آسکتا ہے، یہ سوچ کر ٹھاکر کو اور لطف آیا۔ کھیتوں کی طرف سے ہوائیں لوریاں دیتی ہوئی آئیں۔ پہرے کے نوکروں کو گالیاں دے کر

انھوں نے ہوشیار کیا، بندھے ہوئے نیلے کو ایک نظر پیار اور ایک نظر اختیار کے ساتھ دیکھا اور سو گئے۔ صبح اٹھ کر انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آسمان پر نگاہ پھینک کر دیکھا کہ پو پھٹنے میں کتنی دیر ہے۔ جب میلا میلا اجالا اتنا روشن ہو گیا جتنا پچھلے سال جھمن کا ہاتھ چھوڑتے وقت تھا تو انھوں نے کان لگا کر کوشش کی کہ کسی بیر کے باغ میں تیتر بول جائے۔ نہیں بولا۔ البتہ کوئی ٹیٹری زور سے چیخی۔ اسی کو تیتر کی آواز پر محمول کر کے انھوں نے آگے بڑھ کر نیم کے درخت سے بندھے نیلے کو رسی سے آزاد کر دیا۔ وہ رسّی کھُل جانے کے بعد بھی ویسے ہی کھڑا رہا، ہلا تک نہیں۔

ٹھاکر صاحب نے زور سے آواز دے کر اپنے چھوٹے بیٹے اونکار کو بلایا۔ اُس کی آنکھوں میں رات کی شراب کا خمار تھا۔ نیلے کو آزاد دیکھ کر اس کا خمار ٹوٹا۔ اس نے حیرت سے اپنے باپ کو دیکھا۔ باپ نے چہرے پر کسی غیر ضروری تاؤ کو لائے بغیر مضبوط آواز میں دھیمے دھیمے کہا:

"ایسے ہی جھمن کو رام کیا تھا پتے سال..."

۳

نیلے نے یکایک اپنی زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی محسوس کی۔ اسے محسوس ہوا کہ گردن میں جو موٹی سی چیز چبھتی رہتی تھی وہ دور ہو گئی ہے، اور اب چلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں محسوس ہوتی۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ اگر کبھی تیز چلنے کا دل چاہے تو رسی پکڑنے والے کا بوجھ بھی گھسیٹنا پڑتا تھا۔ اب سب کچھ کتنا ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے جبلّی طور پر اسے ایک خدشہ لاحق ہوا کہ اَور باتیں بھی تو تبدیل نہیں ہو گئیں۔ لیکن جب صبح ہرا چارا، دوپہر کو سانی اور رات کو ناج اور گڑ ملا تو اس نے طبیعت میں بہت چونچالی محسوس کی۔ وہ گڑھی کے چاروں کونوں میں گھومتا پھرا۔ ایک بار دروازے سے نکل کر باہر بھی گیا۔ گاؤں والے اسے کھلا دیکھ کر چونکے۔ کچھ بدکے، کچھ اس کی آزادی کے خیال سے خوش ہوئے۔ نیلا تھوڑی دیر بعد واپس گڑھی میں آ گیا اور نیم کے درخت کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندر ہی اندر گردن پر تناؤ محسوس ہوا۔ دراصل

Scanned with CamScanner

جب دھوپ اس جگہ آ جاتی تھی تو وہ اٹھ کر لمبی رسی گھسیٹتا ہوا درخت کے سائے والے حصے میں چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس پر دھوپ آ گئی تھی۔ روزانہ اسی گھڑی اسے اٹھ کر رسی کی گرفت کے سہارے سائے میں جانا ہوتا تھا۔ اس لیے اسے دھوپ اور رسی کا تناؤ ساتھ ساتھ محسوس ہوا۔ لیکن جب وہ سائے کے حصے کی طرف بڑھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ آج رسی کا تناؤ گردن پر نہیں تھا۔ وہ اگلے دونوں پیر زمین پر مار کر اگلے دھڑ سے اٹھا اور نیم کے تنے پر اپنے سر سے ایک سبک سی ٹکر ماری۔ یہ آزادی کے رقص کی پہلی تال تھی۔

ٹھاکر صاحب نے آہستہ آہستہ اسے کچھ افراد سے مانوس کر دیا، جس کا لامحالہ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دیگر افراد کو تھوڑا تھوڑا سا غیر سمجھنے لگا۔ قصبے میں جس صبح انھیں یہ خبر ملی کہ رات نیلے نے گڑھی کی دیوار پھلانگ کر شیشم کی سوٹ چرا کر بھاگنے والے شامو کی کمر توڑ دی ہے تو مارے خوشی کے حویلی میں ناچے پھرے۔ گاؤں پہنچے اور نیلے سے منہ میں کھوکھلا بانس ڈال کر اپنے ہاتھ سے ایک سیر تیل پلایا۔ تیل پی کر وہ اُچھلنے لگا۔ ٹھاکر نے بیشک میں آ کر گاؤں کے بہوم کو دیکھا جو نیلے کی شکایت لے کر آیا تھا اور صرف ایک ہی بات کہی:

"رات کے دو بجے شامو گڑھی میں کیا پوجا کرنے آیا تھا؟ بولو۔ جواب دو۔ چپ کیوں ہو؟"

ظاہر ہے کہ اس بات کا جواب کون دیتا، کہ رات کو دو بجے واقعی پوجا کا کوئی مناسب وقت نہیں ہوتا۔

"یہ گئوماتا کا اوتار ہے۔ دُشٹ لوگوں کا ٹھیک ٹھیک پربندھ رکھے گا۔" بہوم اٹھ کر چل دیا۔ کچھ بڈھوں نے گڑھی سے نکلتے وقت کن انکھیوں سے نیلے کو دیکھا جو اگلے پیر زمین پر مار مار کر دھول اُڑا رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے ہاتھ جوڑ کر اوتار کو پرنام کیا۔

گڑھی میں رکھے زیورات کی حفاظت کے اس انوکھے انتظام سے ٹھاکر کا رواں رواں خوش ہو گیا۔ نیلا کبھی کبھی قصبے کی حویلی میں بھی رات گزارتا تھا۔ ٹھاکر نے یہ بھی سوچ سمجھ کر کیا تھا، تاکہ قصبے اور دیہات دونوں پر نیلے کی یکساں دہشت قائم رہے۔ نیلا ابھی پٹھا تھا، مکمل بالغ نہیں ہوا تھا، اس لیے مستی میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ ان کے ساتھ کتے کی طرح رہتا تھا... ساتھ ساتھ... وفادار... آگے پیچھے... دائیں بائیں...

دیہات کی کھیتی باڑی، گروی گانٹھ کا کام، سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ نیلے کی وجہ سے

Scanned with CamScanner

چوروں سے بھی خوب حفاظت تھی۔ اسی طرح قصبے کی حویلی میں کبھی کبھی رات گزارنے کی وجہ سے وہاں بھی چوروں کا خطرہ نہیں رہا۔ اب تو کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگا کہ چور تو چور، جو لوگ حویلی یا گڑھی میں اپنا حق لینے آتے، جیسے گیہوں کاٹنے والے اپنی مزدوری کا گٹھا یا چھت پر مٹی ڈالنے والے مزدور اپنے حصے کا اناج، تو اُن پر بھی نیلا دوڑ پڑتا تھا۔ وہ لوگ ٹھاکر سے منت سماجت کرتے، نیلے کی کارکردگی کی مبالغے کے ساتھ تعریف کرتے، تب ٹھاکر خوش ہو کر انھیں ان کا حق دیتے۔

دیہات اور قصبے کی طرف سے جب فراغت محسوس ہوئی تو ٹھاکر نے شہر کی تجارت میں توجہ بڑھائی۔ دیہات والی چوری کے سانحے کے بعد اُدھر وقت نہیں دے پائے تھے۔ شہر کی تجارت بھی زوروں پر چلنے لگی۔

ویسے تو نیلا زیادہ تر کام معمول کے مطابق کرتا تھا، یعنی دیہات میں رہتا، کسی بھی کھیت میں دوچار منھ مار دیتا، کہ جانور یہ تفریق نہیں کر سکتے کہ یہ تیرا ہے یہ میرا ہے۔ کبھی کبھی گڑھی سے تالاب کی طرف جاتے ہوئے اگر گلی تنگ ہے تو وہ راستے میں ملنے والے افراد کے درمیان سینگوں سے راستا بنا لیتا۔ یہ بات بھی ہر فرد بشر آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ سینگوں کے بجائے اگر کھُروں سے راستا بناتا تو اس میں لوگوں کو زیادہ زخم آتے۔ کبھی کبھی یوں ہی دولتی بھی چلا دیتا جس سے ان لوگوں کے کپڑے اور کپڑوں کے نیچے ذرا کھال وغیرہ بھی پھٹ جاتی۔ معلوم نہیں کیوں لوگ باگ بیچ راستے میں چلنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

اسی طرح جب وہ قصبے میں ہوتا تو کبھی کبھی پڑوس کے کسی بھی گھر میں گھس پڑتا اور مٹی کے برتن وغیرہ توڑ کر شاداں واپس آتا۔

ٹھاکر نے شکایت کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کہ نیلے نے آج تک کسی کے تانبے پیتل کے برتن نہیں توڑے، ہمیشہ مٹی کے توڑے۔ ٹھاکر چاہتے تھے کہ لوگ نیلے کی اس حسِ تفریق کی داد دیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اس سے بیزار ہونے لگے۔ خصوصاً دیہات میں لوگ اپنے کمزور کواڑ دن میں بھی بند رکھتے۔

قصبے میں بھی نیلے کو دور سے دیکھتے ہی اہم چیزیں چھپا لی جاتیں اور دروازے اگر کھلے ہوں تو بند کر لیے جاتے۔ ٹھاکر نے لوگوں کی اس بیزاری کو بہت بُرا سمجھا۔ انھیں اکثر خیال آتا کہ وہ

Scanned with CamScanner

کیسے لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں، جن میں ذرا بھی حسِ مزاح نہیں... ذرا بھی چونچالی نہیں۔

ایک دن گلفام کنجڑا شام کو روتا ہوا قصبے کی حویلی پر آیا اور بیٹھک میں ٹھاکر کے پیر پکڑ لیے۔ اس نے احوال بیان کیا کہ وہ خوانچہ لگا کر امرود بیچ رہا تھا کہ بغیر کسی اشتعال کے نیلے نے آ کر پہلے تو اس کے پانچ عدد امرود کھائے۔ جب اس نے نیلے کو دھکا دیا تو نیلے نے باقی امرودوں کو کچل دیا۔ جب اسے اس حرکت سے روکا گیا تو اس نے گلفام کے اوپر دو پیروں سے حملہ کر دیا جس سے اس کا بازو زخمی ہو گیا اور قمیص پھٹ گئی... وہ اس کا ہرجانہ چاہتا ہے۔

ٹھاکر نے اس کی بات توجہ سے سنی۔ بلکہ کئی بار واقعات کو بیچ بیچ میں روک روک کر نئے سرے سے سنا۔ اس درمیان انھوں نے نوکر بھیج کر کچھ پاس پڑوس کے، کچھ بازار کے آدمی بلوا لیے۔ جب سب آ کر گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور گلفام نے ساتویں دفعہ واقعہ بیان کر لیا تو ٹھاکر نے اس سے ایک عجیب شانِ بے نیازی کے ساتھ پوچھا:

"آج کا تہہ بازاری کا پیسہ بھرا تھا؟"

"نہیں سرکار۔ خوانچہ بڑھا کر ٹھیکے دار کو دیتا۔ شام کو دیتا۔"

"تہہ بازاری کا مطلب ہوتا ہے بازار میں بیچنے کے عوض اس سرکاری جگہ کا روزانہ کا کرایہ۔ اتنا تو تم جانتے ہو گے؟"

"ہاں سرکار۔"

"اگر تم نے اس وقت تک تہہ بازاری کا پیسہ نہیں بھرا تو اس کا مطلب صبح سے شام تک تم غیر قانونی انداز میں بیٹھے۔ بولو۔ جواب دو۔"

گلفام چپ رہا۔ یہ نکتہ اس کی سمجھ میں عام حالات میں بھی نہ آتا، نہ کہ اس زخمی حالت میں جب کہ اس کے امرودوں کا نقصان بھی ہو چکا تھا۔

"بولو... بھائی، کچھ تو بولو... میں تمھیں پورا موقع دیتا ہوں۔ میں اُن لوگوں میں نہیں جو دولت اور کرسی کے نشے میں غریب کو بولنے بھی نہیں دیتے اور اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے بیٹھے ہوئے تمام افراد کے چہرے پر آئے نئے قسم کے تاثرات کا معائنہ کرنا ضروری خیال کیا۔ تاثرات کچھ کچھ حسبِ منشا تھے۔ تجربے نے انھیں بتایا تھا کہ کبھی کبھی کچھ دیر خاموش

Scanned with CamScanner

رہنا بولنے کے مقابلے میں زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ وہ چپ ہو گئے۔ بلکہ خاکساری کے انداز میں سر بھی نیچے جھکا لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد انھوں نے دھیمے سے فیصلہ کن انداز میں کہا:

"آج تم نے تہہ بازاری کی چوری کی۔"

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر انھوں نے اس سے بھی زیادہ دھیمی لیکن مضبوط آواز میں سوال کیا:

"تمھارے کتنے امرود کھائے؟ دس، آٹھ، چار یا پانچ؟ تم اس بات کو سات دفعہ دہرا چکے ہو۔ میں اپنے کانوں سے چھ بار سن چکا ہوں، جب سے یہ پندرہ لوگ یہاں بیٹھے ہیں تم کئی بار اپنے امرودوں کی تعداد بدل چکے ہو۔ بولو کتنے امرود کھائے؟ سات یا چھ؟ ان پندرہ لوگوں کے سامنے جواب دو۔ میں تمھیں نو مرتبہ موقع دے چکا ہوں۔ بولو... سچ کہ جھوٹ؟ جواب دو..."

گلفام بولا:

"نیلے نے میرے پندرہ امرود یا سات امرود یا شاید نو امرود یا میرے خیال میں دو امرود کھائے تھے۔"

سب ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے۔ گلفام ان کی طرف بے بس نظروں سے دیکھتا رہا۔

"آپ لوگوں نے دیکھا یہ کتنی بار امرودوں کی گنتی بدل چکا ہے۔ اب اس کی کس بات کا یقین کریں۔ خاص طور سے اس حالت میں کہ آج اس نے تہہ بازاری ٹیکس کی چوری بھی کی۔"

"سرکار! نیلے نے میرے ہاتھ پر لات چلائی اور خوناخون کر دیا،" گلفام سسکنے لگا۔

ٹھاکر نے تمام افراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"آپ دھرم ایمان سے بولنا، ہمارا نیلا جو ہاتھی کے برابر ہے اگر اس لونڈے کو لات مارتا تو کیا یہ زندہ بچ سکتا تھا؟ کیا اس کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ نیلے نے اس کو لات ماری؟ جب کہ خود یہ اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ اس نے بغیر کسی اشتعال کے نیلے کو دو مرتبہ دھکا دیا..."

"سرکار! جب اس نے میرے امرود کھائے تب دھکا دیا تھا۔"

"کون سے امرود، جن کی صحیح گنتی بھی تم ان پنچوں کے سامنے نہیں بتا پائے ہو؟"

کیوں کہ اب وہ پندرہ آدمی پنچ تھے، اس لیے ان کا منصف مزاج ہو کر سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کرنا ضروری تھا۔ ان میں سے چند ایک کے چہرے پر ججوں جیسی سنجیدگی اور کرختگی بھی آ گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

فرداً فرداً ان پندرہ آدمیوں نے گلفام سے مختلف نوعیت کے پندرہ پندرہ سوالات پوچھے۔ گلفام نے ہر سوال کا جواب نہایت غلط دیا، یعنی ان پنچوں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ اس دوران ٹھاکر بالکل چپ رہے۔ ان کے بولنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اب اگر بولتے بھی تھے تو چاروں طرف سے سوالات کے نرغے میں گرفتار گلفام کی طرف داری میں ہی کوئی جملہ ادا کرتے۔ ان کی اس غیر جانبداری بلکہ خود مخالفانہ رویّے نے پنچوں پر بہت اچھا اثر مرتب کیا۔ سب گلفام کو ملامت کرنے لگے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو سبھوں کا فیصلہ یہ تھا کہ گلفام باغوں سے امرود چرا کر بیچتا ہے اور اس پر یہ دھاندلی بھی کرتا ہے کہ تہہ بازاری کا ٹیکس ادا نہیں کرتا۔ آج اس نے ایک مزید سینہ زوری کرنے کی کوشش کی، ایک معصوم گئوسمان پشو پر حملے کا الزام لگایا جو بیچارہ شام کے وقت ٹہلنے کے لیے بازار کی سڑک پر بائیں کنارے کی طرف دب کر ٹریفک کے اصول کے مطابق چل رہا تھا۔ یقیناً گلفام نے مزہ لینے کے لیے، جیسا کہ اس طرح کے اوباش لڑکے کرتے ہیں، اس بے زبان جانور پر دو یا پانچ یا سات یا نو دفعہ کچے سخت امرود مارے جس سے ممکن ہے جانور کو چوٹ آئی ہو۔ گلفام سو مرتبہ اٹھا بیٹھی کرے اور ٹھاکر صاحب سے معافی مانگے۔

گلفام نے سو مرتبہ اٹھا بیٹھی کرنا چاہی تو ٹھاکر نے اٹھانوے پر پہنچ کر اسے روک دیا، اور پنچوں کی طرف دیکھ کر کہا:

"اب بس کیجیے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ میرا دل بہت نرم ہے۔"

ان کے لہجے میں آنسو دیکھ کر لوگوں نے گلفام کو روکا۔ جب گلفام اپنا ٹوٹا ہوا خوانچہ اور باقی ماندہ امرود لے کر آنکھوں میں آنسو بھرے حویلی سے باہر نکلا تو دروازے پر نیلا کھڑا زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔ پنچوں نے اسے للکار کر کہا:

"ارے اب اس بے زبان کو امرود تو کھلا دے بتیارے..."

بتیارے نے خوانچہ زمین پر رکھ کر آنسو خشک کیے اور امرود دونوں ہاتھوں میں بھر کر بے زبان جانور کے سامنے پیش کیے۔

Scanned with CamScanner

۴

جب دولت، سیاست اور اقتدار تینوں حاصل ہوں تو بگڑی بات بنانے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی ـــــ ایک دن ٹھاکر اسی فلسفے پر غور کر رہے تھے تو ان پر ایک عجیب وغریب انکشاف ہوا کہ جب سے وہ دیہات اور قصبے کی دولت کی حفاظت سے بے فکر ہوے ہیں، سیاست اور تجارت میں خوب وقت دینے لگے ہیں اور ان کی توجہ اور وقت دینے کی وجہ سے سیاست اور تجارت پہلے سے کئی گنا ترقی پر ہیں ـــــ یعنی ان سب ترقیوں کے پیچھے اس نیلے کا ہاتھ ہے۔ انھیں یہ بات مضحکہ خیز محسوس ہوئی۔ مگر وہ جتنا غور کرتے اسی نتیجے پر پہنچے کہ ان کی حالیہ ترقی میں نیلے کا بہت عمل دخل ہے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح تھی، دیہات اور قصبے دونوں میں لوگ ٹھاکر صاحب سے زیادہ نیلے سے خوف کھانے لگے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ ٹھاکر صاحب اگر براہ راست کسی کو کوئی گزند پہنچائیں گے تو اس کی تو دادفریاد ہے لیکن نیلے کی کسی حرکت کی دادفریاد اس لیے نہیں ہے کہ اس کی حمایت میں ٹھاکر صاحب کے علاوہ بہت سے غیر جانبدار لوگ بھی شامل ہو جاتے تھے۔ کوئی نیلے کو برا کہہ کر خواہ مخواہ شراپ بھی نہیں لینا چاہتا تھا کیوں کہ ٹھاکر صاحب نے مختلف لوک گاتھاؤں سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نیلا بھی گئوماتا کے بہت ہی قریبی عزیزوں میں ہوتا ہے، یعنی تقریباً کزن جیسا ـــــ انھوں نے کزن کا ہندوستانی ترجمہ کر کے بھی بتایا تھا۔

آہستہ آہستہ صورتِ حال کچھ یوں ہو گئی کہ جو لوگ نیلے سے مضروب ہوتے وہ بھی اس بات کا کھلم کھلا اعتراف نہ کرتے، مبادا انھیں کی کوئی غلطی سامنے آجائے... صورتِ حال کو اس حد تک پہنچانے کے لیے کئی واقعات عالم ظہور میں پیش آئے، جن میں کچھ دیہات میں وقوع پذیر ہوے اور کچھ واقعات کے لیے قدرت نے قصبے کا انتخاب کیا۔

Scanned with CamScanner

۵

دیہات میں گڑھی کے ٹھیک سامنے ننھو کمہار کی بیوہ اپنی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ننھو کمہار کا پچھلے دنوں عارضۂ دق میں انتقال ہو گیا تھا۔ صبح تین بجے اٹھ کر تینوں ماں بیٹیاں گدھوں کو لے کر نکل پڑتیں اور دور دور کے تالابوں کی مٹی کھود کر گدھوں پر لاد لاد کر صبح منھ اندھیرے واپس آ جاتیں۔ پھر گارا تیار کرتیں۔ کمہار کی جوان بیٹیاں پنڈلیوں تک گارے میں کھڑی، لہنگا ذرا ذرا سا اُڑسے ہوے، پھاوڑے سے گارے کو نرم کرتی رہتیں۔ ماں چاک پر بیٹھی برتن ڈھالتی رہتی۔ چار پانچ دن کی محنت کے نتیجے میں جب اتنے برتن بن جاتے کہ بھٹی سلگا کر پکائے جا سکیں تو اُپلوں کی بنیاد بنا کر پولے پولے ہاتھوں سے کچے کچے برتنوں کو اس انداز سے سجایا جاتا کہ ان کے بیچ سانس کی جگہ باقی رہے، تاکہ آگ کی گرمی کی لہریں درمیان سے گزر کر تمام برتنوں تک پہنچ سکیں۔

ٹھاکر کے چھوٹے بیٹے اونکار کو کمہار کی بڑی بیٹی کے برتن بہت پسند تھے۔ مگر وہ اونکار کو ہاتھ لگانا تو ایک طرف، نظر بھر کر دیکھنے بھی نہیں دیتی تھی، پلّو سے چھپائے رکھتی تھی۔ اونکار اکثر گڑھی کی چاردیواری کے دروازے میں مونڈھا ڈال کر بیٹھ جاتا اور دس قدم دور گارے میں ابھرتے ڈوبتے کمہار کی لونڈیوں کے پیروں کو تاکتا رہتا۔ سانولے پاؤں اور اُجلے تلوے گارے میں ڈوبتے اور ابھرتے، اسی رفتار سے اونکار کا دل بھی ڈوبتا اور ابھرتا... وہ بیٹھا دیکھتا رہتا کہ لڑکیاں اس کی طرف سے منھ پھیر کر گارے کو اپنے پیروں سے دبا دبا کر نرم کر رہی ہیں۔ وہ وہیں بیٹھا بیٹھا گارے کی طرح نرم ہوتا جاتا اور اپنے اندر مختلف شکلوں کے برتنوں کو ڈھلتا ہوا محسوس کرتا رہتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ بڑکی نے گارے کی چھینٹوں سے بچنے کے لیے اپنے لہنگے کو تھوڑا سا اونچا کر کے نیفے میں اڑس لیا ہے۔ وہ پنڈلیوں سے ذرا اوپر تک کھل گئی تھی۔ اونکار اس کا بدن پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ میلے میلے اُلجھے بالوں کے نیچے چمکتی ہوئی سانولی گردن، گردن کے نیچے دبلی پتلی سڈول کمان کی طرح کھنچی ہوئی کمر، پشت کے نیچے گارے کو تھپکی دیتے پیروں کی دھمک سے ہلتے ہوے کولھے، پیوند لگا لہنگا اور گھٹنوں کی پشت کا پنڈلی کا سب سے اوپر کا حصہ جو موٹی موٹی کھنچی ہوئی رگوں کے بیچ ایک اُبھار کی طرح واضح تھا اور جس میں اونکار کھڑے ہو کر اپنی شکل دیکھ

Scanned with CamScanner

سکتا تھا...

اونکار کو معلوم تھا کہ اُس کی شادی پڑوس کے گاؤں میں طے ہو چکی ہے۔ لڑکا بھی ذات کا کمہار ہے اور انٹر کا امتحان دے رہا ہے۔ اونکار کسی بھی قیمت پر بڑکی کو شادی سے پہلے ایک رات کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پرتاپ نے اسے اشاروں اشاروں میں منع بھی کیا تھا کہ اس میں پتاجی کی عزت کا سوال ہے، لیکن اونکار پر روزانہ گارے کی تھپکی کا جادو چڑھ چکا تھا۔ آج اس نے پہلی بار بڑکی کی ٹانگوں کو اتنا کھلا ہوا دیکھا تھا... اس نے موٹرسائیکل اٹھائی اور قصبے میں جا کر راکیش کو پوری بات بتائی۔ ٹھاکر اودل سنگھ آج شہر گئے ہوئے تھے۔ دونوں نے شام تک بیٹھ کر حویلی میں شراب پی اور رات گئے موٹرسائیکل پر ایک اَور ہم مشرب رمیش کو بٹھا کر واپس آئے۔ موٹرسائیکل ایک ایکھ کے کھیت میں چھپا دی۔ جاڑا بہت تیز تھا اور کہرا بھی تھا۔ جگہ جگہ گاؤں کا دھواں کہرے میں مل کر گاڑھا ہو کر ہوا میں معلق کچھ کچھ ٹھوس ہو گیا تھا۔ گاؤں سو چکا تھا۔ لیکن گاؤں کے سونے کا مطلب خاموشی نہیں ہوتا۔ چھپر تلے بندھی بھینسیں ایک دوسرے سے بدن رگڑتی رہتی ہیں، ایستادہ گائیں سوتے سوتے آنکھ کھول کر ڈکرانے لگتی ہیں اور بے خواب کتے ایک دوسرے پر غراغرا کر بے ضرر جھپٹیں کرتے رہتے ہیں۔

پہلے تو یہ تینوں چپ چاپ گڑھی میں داخل ہوئے۔ چار دیواری کے پاس ہی بیٹھا نیلا جگالی کر رہا تھا۔ دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سینگ آگے کر کے، سر نیچا کر کے پینترے بدلنے لگا۔ اونکار نے دھیرے سے سیٹی بجا کر، پاس جا کر اسے تھپکی دی۔ دونوں کو اندر لایا۔ پرتاپ بھی شہر گیا ہوا تھا۔ اس کے کمرے میں اونکار کے دوستوں نے جھانکا۔ ہلکی چاندنی میں کھڑکی کے قتلے ایک جوان عورت کے بدن پر پڑ رہے تھے۔

"یہ کون مال ہے؟" رمیش نے اونکار سے پوچھا۔

"چپ سالے... بھابھی ہے۔"

"ہوہوہو... " راکیش اور رمیش بے ڈھنگے پن سے شرمندہ ہنس رہے تھے۔

تینوں نے اونکار کے کمرے میں بیٹھ کر منصوبے کو آخری شکل دی۔ تھوڑی دیر بعد رمیش نیلے سے بچتا ہوا گڑھی کے دروازے سے باہر نکلا اور کمہار کی بیوہ کے جھونپڑے کے پاس پہنچا۔ جھونپڑے میں کمہار کی بیوہ کے چند گدھے بندھے خاموش کھڑے تھے۔ جھونپڑے کے پاس آ کر

رمیش نے آواز دی:

"مائی... او مائی...!"

"کو ہے؟" اندر سے آواز آئی اور چاندی کے ہلکے زیور بجنے لگے۔ لڑکیاں بھی اٹھ گئی تھیں۔ تینوں نے ایک ساتھ آ کر بانس کا ٹٹر ہٹایا۔

"میں لکھنا ہوں۔ کھلیل پور سے آیا ہوں۔ تمہارے ہووے والے جمائی پر ڈاکوؤں نے حملہ کروؤ ہے۔ تمھیں بلایو ہے۔"

"ہے ری دیا!" سمجھ کر تینوں رونے لگیں۔ بڑی بیٹی نے احتیاط کی کہ آواز زور سے نہ نکلے۔

لکھن نے مشورہ دیا کہ ماں اور چھوٹی بیٹی چلی چلیں۔ بڑی کی سگائی ہو چکی ہے، اس کا اُس گاؤں میں، خاص طور پر اُس گھر میں جانا ٹھیک نہ ہو گا۔

بڑی بیٹی کو اکیلے جھونپڑے میں چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ لکھن نے مشورہ دیا کہ گڑھی میں بڑی بہو کے پاس چھوڑ دیا جائے۔

بڑی بہو نے اندر کا دروازہ کھول کر پہلے تو واقعے پر افسوس کا اظہار کیا، پھر بڑکی کو اپنے کمرے میں بلا کر زمین پر بچھونا دے کر لیٹنے کو کہا۔

کمہار کی بیوہ اور چھوٹی بیٹی لکھن کے ساتھ گاؤں کی حد سے نکل گئے۔

سیاست داں باپ کے بیٹے کا منصوبہ بڑا چست درست تھا۔ لکھن نے گاؤں سے باہر جا کر ان دونوں ماں بیٹی کو گھونسے مار مار کر قابو کیا، اور سرد رات تلے آموں کے ایک اجاڑ باغ میں، جس کی نشان دہی اونکار نے کر دی تھی، ٹیوب ویل کے کمرے میں رسی سے باندھ کر منھ میں کپڑا ٹھونس کر ڈال دیا۔ چلتے چلتے اس کے دل میں رحم آیا اور بہت سا پیال اٹھا کر دونوں پر ڈال دیا۔

لکھن اب دوبارہ رمیش بن چکا تھا۔ اس نے گڑھی کے دروازے کے پاس آ کر آوازیں دیں۔

اونکار اپنے کمرے سے زور سے چلاتا ہوا نکلا: "آتا ہوں... کون؟"

نیلے کی بہترین کارکردگی کی وجہ سے پہرے کے نوکر اپنی مڑھیا میں پیال اوڑھے سو رہے تھے۔

بھابھی نے گھبرا کر کھڑکی پر آ کر پوچھا، "کون ہے اونکار؟"

"دیکھتا ہوں بھابھی۔"

Scanned with CamScanner

دروازے پر آ کر اس نے دھیمی آواز میں رمیش کی پوری کارکردگی کا احوال سنا اور بھابھی کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر بولا:

"برابر کے گاؤں سے ایک آدمی آیا ہے۔ وہاں پتاجی کے دوست یادَو ماصاب پر کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ مجھے بلایا ہے۔"

"جاؤ۔ بندوق لے جانا۔"

تینوں گاؤں سے باہر آ کر کچھ دیر تک ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔ بوتل کھول کر ایک ایک گلاس شراب اَور پی، اور آخری مرحلے کی طرف بڑھے۔ ان کا رخ گڑھی کی طرف تھا۔

صدر دروازے کے بجائے ٹوٹی ہوئی دیوار سے داخل ہوئے۔ اونکار چھپا رہا۔ دونوں نے آگے بڑھ کر آواز دی:

"اونکار! او اونکار بھائی..." بھابھی گھبرائی آنکھیں ملتی ہوئی ساڑھی برابر کرتی ہوئی اٹھی۔ کھڑکی پہ آ کر پوچھا، "کون ہو؟"

"یادو ماصاب پر حملہ ہوا ہے۔ اونکار بھائی کو بلایا ہے۔"

"ابھی ابھی تو اونکار وہیں گئے ہیں۔ گاؤں سے نکلے ہی ہوں گے۔"

"اچھا تو ہم چلتے ہیں۔ آپ کے گھر میں ٹارچ ہو گی؟ بیٹری؟ ہماری ٹارچ راستے میں گر پڑی۔ دگڑے پر بہت پانی ہے۔ موٹر سائیکل پھنس جائے گی..."

"ہوں... ابھی لاتی ہوں..."

اندر بڑکی جو سب سن رہی تھی بھابھی سے لپٹ گئی۔ "موہے ڈر لگ روَاے۔"

"ڈرو مت... کبھی کبھی اچانک چاروں طرف سے مصیبت آ جاتی ہے..." بھابھی نے اسے دلاسا دیا۔ اس نے دروازہ کھول کر ہاتھ بڑھا کر ٹارچ دینا چاہی۔ رمیش نے بھابھی کے ہاتھ کے بجائے کندھے کو پکڑ کر جھٹکے سے کھینچا اور اس سے پہلے کہ وہ چیخ سکے، منہ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر اندر داخل ہو کر پلنگ پر گرا کر قابو کر لیا۔ بھابھی پلنگ پر ٹانگیں مارتی رہی۔ بڑکی منہ پھاڑے اس منظر کو دیکھ رہی تھی کہ راکیش نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ارہر کے جوان پودوں کے گٹھے کی طرح باندھ کر ڈال دیا۔ بھابھی مضبوط بدن والی نئی عمر کی عورت تھی۔ ابھی پچھلے ہی سال

شادی ہوئی تھی۔ اسے قابو میں کرنے میں زیادہ وقت لگا کیوں کہ ایک ہاتھ سے منھ دبائے رکھنا بھی ضروری تھا... اس درمیان اونکار اندھیرے میں کھڑے نیلے کو تھپکیاں دیتا رہا۔ رمیش نے بھابھی کو باندھ کر منھ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ رمیش کی سانس بھی اکھڑ گئی تھی۔ کچھ تو طاقت آزمانے کی وجہ سے اور کچھ بھابھی کے گرم گداز بدن کو دیر تک جکڑے رہنے کی وجہ سے۔ راکیش نے بڑکی کو کندھے پر اناج کی بوری کی طرح ڈالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ بھابھی آنکھیں پھاڑے سارا منظر دیکھتی رہی۔

لالٹین بجھ گئی تھی۔ چاندنی جالی دار کھڑکی سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ بھابھی نے دیکھا کہ اسے بے قابو کرنے والا ابھی تک کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا ہے اور ہولے ہولے ہانپ رہا ہے۔ وہ پیش آنے والے واقعے سے بے چین ہو کر بندھے بندھے تڑپنے لگی۔ اس کی ساڑی گھٹنوں سے اوپر سرک آئی تھی اور مدھم چاندنی میں اس کی پنڈلیاں دیوالی کی موٹی موٹی موم بتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہانپنے کی وجہ سے سینہ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ رمیش نے کھڑے کھڑے کچھ سوچا۔ کھڑکی سے جھانک کر راکیش سرگوشی میں باہر سے چلایا، "ابے جلدی کر... کیا کر رہا ہے؟"

"آ رہا ہوں بے!" یہ کہہ کر اس نے یاد کیا کہ دو تین گھنٹے پہلے ہی اس نے اس بندھی ہوئی عورت کو "مال" کہا تھا... وہ اس پر جھکا اور اسے چھٹپٹاتا دیکھتا رہا۔ کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا جس نے نشے کو کچھ ہلکا کیا۔

وہ واپسی کے لیے مڑا... پھر کچھ سوچ کر پلٹا اور یہ سوچ کر کہ یہ عورت اس کی بدمعاشیوں کے یار اونکار کی بھابھی ہے، اس نے ہاتھ بڑھا کر ساڑی پیروں تک سرکا دی اور نشے کے عالم میں بھی اس بات کا پورا خیال رکھا کہ ساڑی نیچے سرکاتے وقت اس کا ہاتھ گھٹنوں سے پیروں تک مسلسل عورت کے بدن سے رگڑتا ہوا نیچے تک آ سکے۔ اسی انداز سے اس نے اوپر کا پلّو بھی سینے پر برابر کیا۔ دروازے سے نکل کر وہ مسکرایا کہ پورا مال نہ سہی کچھ اٹھنیاں چونیاں تو بین ہی لیں۔

رات بہت اندھیری تھی۔ باہر نکل کر تینوں کمہار کے گھر تک آئے اور اونکار بڑکی کو لے کر اس کے جھونپڑے میں گھس گیا اور دونوں باہر اندھیرے میں چھپ کر پہرہ دیتے رہے۔ رمیش دھیمی دھیمی آواز میں راکیش کو اپنی تازہ فتوحات کا واقعہ سناتا رہا جسے سن کر راکیش "دھت دھت" کرتا رہا۔ لیکن جیسے ہی رمیش خاموش ہوتا، راکیش اس کا چہرہ دیکھنے لگتا۔ "پھر کیا ہوا؟"

Scanned with CamScanner

اونکار نے زمین پر پڑے پیال پر بڑکی کو ڈال دیا اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اپنے سر سے مڑاسا کھول لیا۔ اندر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ماچس جلا کر لونڈیا کا بدن غور سے دیکھا۔ اسے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ دور سے یہ جتنی جاندار نظر آتی تھی اتنی تگڑمی نہیں تھی۔ اس نے ماچس دوبارہ جلائی اور اس کے سانولے پیروں اور اُجلے تلووں کو دیکھا۔ پاؤں سانولے تھے اور تلوے اُجلے تھے، لیکن ایڑیوں میں مٹی اور پانی کے مسلسل برتاؤ کی وجہ سے دراریں سی پڑ گئی تھیں۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں رانیں ٹٹولیں۔ وہ اتنی سخت نہیں تھیں جتنی وہ سمجھ رہا تھا۔ بڑکی رانوں پر ہاتھ لگنے کی وجہ سے بھڑکنے لگی۔ آنکھوں پر پٹی اور منہ میں کپڑا ہونے کی وجہ سے چہرے کی ہئیت عجیب سی ہو گئی تھی، لیکن اتنی بدہئیت نہیں کہ اونکار کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے... وہ بدن پر ہاتھ پڑتے ہی مچھلی کی طرح تڑپتی تھی۔ اونکار نے معائنے کے آخری مرحلے کے طور پر لونڈیا کی گردن کی جڑ سے نیچے کی طرف ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ سینے کے ابھار معمولی تھے... اس کے ہاتھ پیڑو کے اوپر چمٹانما پسلیوں کے ڈھانچے پر آ کر رک گئے۔ وہ ایک ایک پسلی کو انگلی سے چھو چھو کر محسوس کرتا رہا اور لونڈیا کے دبلے پن پر افسوس کرتا رہا۔ بڑکی کا بدن گرم تھا اور سانسیں تیز تھیں اس لیے اونکار بالکل بیزار نہیں ہو پایا لیکن اتنی محنت، منصوبوں اور جوکھم کے بعد ملنے والے انعام کو اس نے اپنے حق سے کچھ نہیں بلکہ خاصا کم محسوس کیا۔ وہ بڑکی سے اس کا بدلہ لینے لگا اور بہت دیر تک اپنے حساب نت نئے طریقوں سے اسے برتتا رہا۔

چھپر کا ٹٹر لگا کر وہ تینوں کھیتوں تک آئے جہاں ایکھ میں موٹر سائیکل چھپا کر رکھی تھی۔ اونکار نے راکیش اور رمیش کو رخصت کیا اور اندازہ کرنے لگا کہ اپنے گاؤں سے ماصاب کے گاؤں جانے اور وہاں سے آنے میں زیادہ سے زیادہ کتنی دیر لگ سکتی ہے۔ اتنا ہی وقت گزار کر وہ گڑھی پہنچنا چاہتا تھا جہاں بھابھی بندھی ہوئی اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔

گڑھی میں آ کر بھابھی کے کمرے میں پہنچ کر بھابھی کو اس حالت میں دیکھ کر اس نے وہ ساری حرکات کیں جو ایسے موقع پر اسے کرنا چاہیے تھیں۔

بھابھی منہ کا کپڑا نکلتے ہی رونے لگی۔ جب اس نے پوری بات بتا کر بھی رونا جاری رکھا تو اونکار کو شک ہوا کہ رمیش نے بھابھی کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی ہے۔ بھابھی کی گردن کے نیچے اسے نیل کا نشان نظر آیا۔ اس کا سارا نشہ اتر گیا۔ پھر اس نے کرید کرید کر ڈاکوؤں کی حرکتوں

Scanned with CamScanner

کے بارے میں پوچھا۔ بھابھی اسے بڑی مشکل سے یقین دلا پائی کہ اس کی عزت پر آنچ نہیں آ پائی۔

اونکار نے بھابھی کو بتایا کہ یہ سب منصوبہ بند سازش تھی۔ "یادو ماصاب پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔ ان کے گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی وہ آدمی راستے میں کسی کام کا بہانہ کر کے دوسرے راستے پر ہو لیا تھا۔ میں بھی ان کے گاؤں تک نہیں گیا تھا، گاؤں کے باہر ہی ماصاب کی خیریت مل گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی اور چکر ہے۔ وہیں سے بھاگا بھاگا آ رہا ہوں۔"

اونکار نے محسوس کیا کہ وہ اگر چاہے تو جاسوسی اپنیاس لکھ سکتا ہے۔ لیکن بھابھی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"وہ لوگ بڑکی کو بھی اٹھا لے گئے۔ سامنے والی لڑکی کو۔"

"آخر وہ کون لوگ تھے اور انھوں نے ایسی ہمت کیوں کی؟ گھر میں چوری بھی نہیں ہوئی... کچھ سمجھ میں نہیں آتا..." اونکار نے سر پر ہاتھ رکھ کر بھابھی کے سامنے نوٹنکی کی۔

صبح سب سے پہلے کمہار کی بیوہ اور چھوٹی بیٹی گاؤں میں داخل ہوئی جنھیں رگھوبیر باغ والے نے ٹیوب ویل کے کمرے سے آزاد کیا تھا۔ ان دونوں نے آ کر بڑکی کو جھونپڑے میں پا کر اوپر والے کا شکر ادا کیا۔

بھابھی نے تینوں کو بلا کر پوچھا، "یہ سب کیا چکر تھا؟" تینوں آنکھیں پھاڑے بھابھی کو دیکھتی رہیں۔

نو بجے تک پولیس رپورٹ کر دی گئی۔ رپورٹ اونکار نے کی تھی کہ بڑکی کے ہونے والے پتی کے کچھ دوستوں نے یہ سب حرکت کی ہے تاکہ اس کا پتی شادی سے پہلے ہی اس کا استعمال کر سکے۔ واقعات کے تانے بانے اس طرح بٹھائے گئے کہ کیس خاصا جان دار لگنے لگا۔ کم از کم چوکی کے دیوان کا تو یہی خیال تھا۔ اونکار نے موٹر سائیکل کی چوری کی رپورٹ بھی لکھائی۔ موٹر سائیکل رمیش اور راکیش کی مدد سے پھر ایک گنے کے کھیت میں چھپائی گئی جو تیسرے دن سویرے برآمد ہو گئی۔ بڑکی کا میڈیکل ہوا جس میں طرح طرح کی ایذا رسانی کے بعد عصمت دری ثابت ہوئی۔ کمہار کی چھوٹی بیٹی کا بھی میڈیکل ہوا، لیکن اس کی رپورٹ ٹھیک آئی جس پر گاؤں والوں نے ڈاکٹروں کی ملی بھگت کا الزام لگایا...

Scanned with CamScanner

بڑکی کا ہونے والا پتی کالج سے آتے وقت گرفتار ہوا۔ حوالات سے ہی اس نے اعلان کر دیا کہ اس کی سگائی اب ٹوٹی سمجھی جائے۔ وہ میڈیکل رپورٹ کے بارے میں سن چکا تھا۔ البتہ وہ چھوٹی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو یہی کہہ کر ڈھارس دی۔ اس کے ماں باپ نے اس کا پیغام کمہار کی بیوہ تک پہنچایا۔

کمہار کی بیوہ کے چھپر کے اندر بڑکی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ برابر میں اس کی بہن چھٹکی انٹرپاس دولھا کے خیال میں مگن، سامنے کھڑے گدھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ماں کچے برتنوں کو احتیاط سے اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے پر جما رہی تھی۔ سامنے گڑھی کے دروازے سے گڑھی کا صحن نظر آ رہا تھا جہاں نیلا کھڑا ہوا اپنے کانوں کی نوکوں کو ہوا کی سمت میں ٹیون کر رہا تھا... بڑکی اچانک سوچتے سوچتے ہنسنے لگی۔ اس کی بہن نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔ "کیوں ہنسی بڑکی؟"

"بس ایسے ہی..."

"بتانا..."

"میں سوچ رہی تھی میری سہاگ رات اپنے ہی گھر میں ہو گئی..."

بڑکی یہ کہہ کر پھر ہنسی۔ چھٹکی یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ سامنے جیپ آ کر رکی اور نمبردار اودل سنگھ اترے۔ تیر کی طرح سیدھے اندر گئے، کمرے کے باہر کھڑے ہو کر کھڑکی کے راستے بہو سے تسلی کے کچھ جملے کہے، اونکار کو بلا کر حالات کا براہِ راست علم حاصل کیا اور پہرے کے نوکروں کو بلا کر جوتے لگوائے۔ جوتے کھا کر انھوں نے اقرار کیا کہ وہ اس رات اس لیے سو رہے تھے کہ جب سے نیلا بڑا ہوا ہے وہ گڑھی میں چور تو چور پڑوسیوں تک کو نہیں آنے دیتا۔ اسی لیے انھیں کوئی ڈر نہیں تھا کہ نیلے کے ہوتے ہوئے کوئی ایسی ہمت کر سکے گا۔

شہر سے قصبے اور قصبے سے دیہات تک آنے میں اودل سنگھ نے صرف اسی بات پر غور کیا تھا کہ علاقے میں کس کی اتنی مجال ہوئی کہ ان کی گڑھی میں داخل ہو کر ان کی بہو کو باندھ کر پناہ لینے والی لڑکی کو اٹھا لے جائے۔ اس بات پر انھوں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ نیلے کے ہوتے ہوئے یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی انھوں نے خود کو اندر سے بہت کمزور محسوس کیا۔ کیا نیلا چوکی داری کے کام میں نکما ہو گیا؟ کیا واقعی یہ نکما ہو گیا؟ انھوں نے باہر آ کر نیلے کے پاس کھڑے ہو کر اسے بغور دیکھا۔ وہ ان کا ہاتھ چاٹنے لگا۔ آج اودل سنگھ کو اس پر پیار نہیں آیا۔ اس کی زبان

Scanned with CamScanner

کے کانٹے ان کے ہاتھ میں چبھے۔ انھوں نے اس کا منھ پکڑ کر ایک طرف کر دیا اور اندر آ کر دالان میں خاموش لیٹ گئے۔

اس کا مطلب، اب کوئی بھی گڑھی یا حویلی میں داخل ہو کر کچھ بھی کر سکتا ہے؟ اس کا مطلب، میں اب پھر گڑھی اور حویلی کی حفاظت کی پابندی میں پھنس جاؤں گا؟ اس کا مطلب، اس نیلے کو پالنا بے کار گیا؟

اونکار باپ کو خاموش دیکھ کر ان کے پاس آ گیا اور مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

"یہ کام کمہار کے جمائی کا نہیں ہو سکتا،" انھوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اونکار سمجھا باپ سوال کر رہا ہے۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا، "پتاجی، ہو نہ ہو اس کے کسی ناتے دار کا کام ہے۔ وہاں اتنی رات کو کمہار کے گھر آ کر کوئی انت جگہ کا آدمی ایسی ہمت نہیں کر سکتا..."

"تم نے رپورٹ کیوں لکھائی؟ میرے آنے کی راہ تو دیکھتے۔"

اونکار چپ رہا۔

"رپورٹ سے بدنامی بھی تو ہوئی۔"

"بدنامی تو نہیں... بھابھی کو کسی نے کچھ... مطلب غنڈوں نے کچھ نہیں کیا..." حالاں کہ وہ اس کی گردن کے نیچے ایک موٹا سا نیل کا نشان دیکھ چکا تھا۔

"بہو کی بات نہیں، گدھے! اصل بات یہ ہے کہ لوگ اب گڑھی میں گھسنے سے ڈریں گے نہیں... میں ہوتا تو نہ رپورٹ ہوتی نہ بڑکی کا رشتہ ٹوٹتا..."

"پھر غنڈوں کا پتا کیسے چلتا؟"

"اب چل گیا کیا؟" انھوں نے غرّا کر پوچھا۔ تھوڑی دیر بعد اونکار اٹھ گیا۔ اودل سنگھ بے چینی سے کروٹیں بدلتے رہے۔ اچھی خاصی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ بہو نے رضائی لا کر پائنتی رکھ دی تھی مگر انھوں نے اوڑھی نہیں۔

باہر آ کر دیکھا تو نیلا زمین پر بیٹھا، بھوسے کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگ رہا تھا۔ انھیں نیلے سے اچانک بیزاری سی محسوس ہوئی۔

گڑھی کے دروازے میں بڑکی داخل ہوئی اور سیدھی بہو کے پاس چلی گئی۔

Scanned with CamScanner

تھوڑی دیر بعد بہو گھونگھٹ کاڑھ کر بڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس آئی۔ "یہ کہتی ہے کہ جس آدمی نے اس کی ماں کو جھوٹے حادثے کی خبر دی تھی وہی آدمی گڑھی میں بھی آیا تھا۔ یہ اس کو آواز سے پہچانتی ہے اور جب وہ مجھے باندھ رہا تھا تو اس نے اس کی صورت بھی دیکھی تھی..."

"کیا اسی نے اس کی عزت لوٹی؟"

"نہیں... وہ کوئی اَور تھا..." بہو نے دھیرے سے جواب دیا۔

"اس کا قد کاٹھ؟"

بڑکی نے نظر نیچے کر کے اس آدمی کا حلیہ بتایا اور بتایا کہ اس کے ماتھے پر گھاؤ کے دو نشان تھے۔ بہو نے بھی سر ہلا کر اس کی تصدیق کی۔

"تُو نے اُس آدمی کو بھی دیکھا جس نے تیرے ساتھ چھیڑخانی کی تھی؟" اودل سنگھ نے گاؤں کی لڑکی سے ذرا نرم الفاظ استعمال کیے۔

"نہیں بابوجی... میری آنکھوں پر پٹی تھی..." وہ آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔ بہو اسے لے کر اپنے کوٹھے میں چلی گئی۔

ٹھاکر اودل سنگھ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ انھیں رہ رہ کر نیلے کے نکے پن پر تاؤ آ رہا تھا۔

شام کو سورج ڈوبنے کے بعد وہ قصبے کی طرف چلے گئے۔ حویلی میں بھی انھیں ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتے ہی انھوں نے تھانے دار صاحب کو ناشتے پر بلایا۔ اسے آنے میں دیر ہوئی تو ان سے صبر نہیں ہوسکا۔ املی کے درخت کے نیچے ایک میز اور تین کرسیاں پڑی تھیں۔ تھانے دار نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور پھر ان رجسٹروں کو غور سے پڑھنے لگا جن میں پڑھنے کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی کیوں کہ سارے اندراجات اس نے اپنے ہاتھ سے کیے تھے۔ تھوڑی دیر مصروف رہنے کے بعد اس نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا:

"نمبردار جی، کیا پیو گے؟ چائے یا کافی؟"

"اماں چھوڑیے چائے کافی... آپ ناشتے پر نہیں آئے۔"

تھانے دار نے علاقے کے چوروں، ڈاکوؤں اور غنڈوں کو ماں کی ایک ہی گالی میں باندھتے ہوئے انھیں بتایا کہ پولیس کو کچھ کاغذی کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

انھوں نے رازداری کے انداز میں تھانے دار کو بتایا کہ جو غنڈے گڑھی میں داخل ہوئے

تھے ان میں ایک کے ماتھے پر زخموں کے دو نشانات تھے۔ وہ کل ملا کر تین تھے لیکن گڑھی میں صرف دو آئے تھے، حالاں کہ اصل کام تیسرے نے کیا تھا۔

تھانے دار نے کچھ پرانے رجسٹر نکالے۔ بڑے منشی جی کو بلا کر سرگوشیاں کیں۔ ایک دو سپاہیوں کو ہم راز بنایا...

"آپ شام کو تکلیف کرو تو میں ایسے تین چار لوگوں کو حاضر کر سکتا ہوں۔"

شام کو جب وہ دوبارہ تھانے میں آئے تو اس وقت بجلی چلی گئی تھی۔ بڑی بڑی دو لالٹینیں جل رہی تھیں اور ان لالٹینوں کی روشنی میں تین لونڈے ڈنڈے کھا رہے تھے۔ تھانے دار نے انھیں بتایا کہ "یہ گلفام کنجڑے کا بڑا بھائی ہے جمعراتی، یہ رام چندر تیلی کا داماد ہے للو، اور یہ ہے کلو پہلوان کا لونڈا او نود... اب آپ پہچانیے۔"

نمبردار اودل سنگھ شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ تھانے کے پھاٹک پر لونڈوں کے عزیز رشتے دار آ کر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ لوگ قصبے کے مقامی وکیلوں کو لے کر آئے تھے۔ تھانے دار صاحب نے وکیل حضرات کو کرسیاں پیش کیں۔

اتنے میں حویلی سے نوکر نے آ کر اودل سنگھ سے کہا کہ انھیں تُرنت حویلی میں بلایا گیا ہے۔

وہ فوراً جیپ میں بیٹھ کر حویلی پہنچے۔ وہاں بھی بجلی نہیں تھی۔ بڑے پھاٹک میں داخل ہو کر جیسے ہی صحن میں آئے ایک آدمی نے اندھیرے سے نکل کر ان کے پیر پکڑ لیے۔ وہ اس کی شکل نہیں دیکھ سکے۔

"کون ہے؟ ابے کون ہے؟ کیا بات ہے، کیا میا مر گئی؟"

"ایسے ہی سمجھو بابو جی... صبح سے پولیس دو دفعہ دوش دے چکی ہے..."

وہ ان کا پیر پکڑے پکڑے دالان تک آیا جہاں لالٹین جل رہی تھی۔ اودل سنگھ بھی ڈیڑھ ٹانگ سے چلتے ہوئے آئے اور لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ جو آدمی ان کے پیر پکڑے ہوئے تھا اس کے ماتھے پر گھاؤ کے دو نشان واضح تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ تھانے میں پہنچے اور انھوں نے گلفام کے بڑے بھائی جمعراتی کی نشان دہی کی کیوں کہ وہ امرودوں والے واقعے کے بعد اودل سنگھ کے پورے خاندان کا دشمن ہو گیا تھا۔ باقی

Scanned with CamScanner

دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔ جمعراتی کے وکیل محمد عمر نے جمعراتی کو کونے میں لے جا کر سمجھایا کہ وہ جرم قبول کر لے تاکہ حوالات کی مار سے بچ سکے۔ ضمانت ہو جائے گی۔ پورا معاملہ دو ہزار میں طے ہوا۔

ٹھاکر اودل سنگھ قصبے میں نہیں رکے۔ ان کے چہرے پہ سرخی چھلک آئی تھی جیسے کئی گلاس بھر کے تاڑی پی لی ہو۔ وہ دگڑے پر تیزی سے جیپ چلاتے ہوئے گاؤں پہنچے۔ رات ہو چکی تھی۔ گڑھی کا دروازہ نوکروں نے کھولا۔ سامنے سے نوکر ہٹے تو ان کے پیچھے نیلا کھڑا تھا۔ اودل سنگھ نوکروں کو گالیاں دیتے ہوئے نیلے سے لپٹ گئے۔ وہ ان کی گردن کو اپنی کانٹوں والی زبان سے چاٹتا رہا جو اس وقت اودل سنگھ کو پھولوں کی پنکھڑی کی طرح نرم لگ رہی تھی۔

اونکار کو جگایا۔ اسے کوٹھے میں بلایا۔ جب اونکار آدھے گھنٹے بعد باہر نکلا تو پہرے کے نوکروں نے اسے قریب سے دیکھا۔ اس کے گال پر انگلیوں کے پانچ نشان بہت واضح تھے۔ مگر وہ چہرے سے خوش اور مطمئن لگ رہا تھا، بلکہ ایک نوکر نے اسے آہستہ آہستہ ہنستے ہوئے بھی سنا۔ اونکار کے سینے پر ایک ہلکا سا بوجھ تھا تو گال کے ایک چانٹے میں اتر گیا تھا۔

صبح اٹھ کر اودل سنگھ نے آدھ سیر کھوئے کے پھیکے پیڑے بنا بنا کر نیلے منہ میں ڈالے اور آدھا سیر سرسوں کا خالص تیل پلایا۔ پیڑے کھا کر اور تیل پی کر وہ اُچھلنے لگا اور پھر چلا تو ایسے چلا کہ عام طور پر نیلے اس طرح نہیں چلتے۔

گاؤں کے پرائمری پاٹھ شالا کے بوڑھے ہیڈماسٹر نے، جو باقی تین ماسٹروں کا کام بھی خود دیکھتے تھے، اس بات پر حیرت کی کہ نیلا کھویا کھاتا ہے اور سرسوں کا تیل پیتا ہے۔

"اس پرکار کی کھاد سے جنگل کا جانور اندر سے بگڑ جاتا ہے..."

ٹھاکر اودل سنگھ نے ان کی بات سنی ان سنی کر کے جیپ اسٹارٹ کی اور ڈیزل کا دھواں ہیڈماسٹر کے چہرے پر دیر تک ناچتا رہا۔

Scanned with CamScanner

۶

نیلا اب اور زیادہ تگڑا ہو گیا تھا۔ پورا دھڑ سیاہ ہو چکا تھا اور سینگ موٹے ہو گئے تھے۔ اب وہ آزادی کے ساتھ بغیر کسی کی مدد کے گاؤں سے قصبے اور قصبے سے گاؤں تک آپ ہی آپ چلا جاتا تھا۔ راستے میں فصل کے اندر سے ہو کر آنے میں اسے خاص لطف ملتا تھا۔ فصل بڑی ہو تو زیادہ نقصان نہیں ہوتا تھا لیکن اگر چھوٹے چھوٹے پودے ہوتے تو نیلے کے کھُروں کی پوری پگ ڈنڈی بن جاتی اور اس حصّے کی فصل بُری طرح ماری جاتی۔

کسانوں نے ایک آدھ بار دبی زبان سے شکایت کی۔ اودل سنگھ ان کی تالیف قلب کے لیے کہہ دیتے کہ میں اسے سمجھا دوں گا۔ جس وقت وہ یہ کہتے انھیں احساس نہ ہوتا کہ وہ ایک جانور کے بارے میں ایسا کہہ رہے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ جو لوگ یہ سنتے انھیں بھی احساس نہ ہوتا کہ یہ بات ایک جانور کے بارے میں کہی جا رہی ہے۔

دیوالی انھوں نے اپنے خاندان کے ساتھ شہر میں منائی۔ دیوالی کے دوسرے دن رات کو وہ سب اپنی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ ہلکا ہلکا جاڑا تھا لیکن بالکل اندھیری تھی۔ آسمان پر چھوٹے چھوٹے مدھم تارے چمک رہے تھے۔ کوٹھی کے گیٹ پر کچھ آہٹ ہوئی۔ نوکر نے پاس جا کر دیکھا اور پوچھا:

"کون؟ ... کون ہے؟"

باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی تیز تیز سانسیں لے رہا ہو۔ نوکر ڈر گیا۔ بھاگ کر اندر آیا۔ ہانپتے ہوئے بولا، "باہر کوئی ہے... آواز کا جواب نہیں دے رہا ہے..."

سب کے چہروں پر ہلکا ہلکا ہراس پھیل گیا۔ اودل سنگھ اپنے دونوں بیٹوں، بندوقوں اور ٹارچوں کے ساتھ گیٹ پر آئے۔ بندوق کندھے پر رکھ کر گیٹ کھلوایا۔ اندھیرے میں کوئی تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ ٹارچ جلائی۔ گھنے اندھیرے میں ٹارچ کی مریل روشنی کا دائرہ اس پر پڑا جس کا رنگ سیاہ تھا اور جس کے سینگ موٹے تھے۔

"ارے!" سب کو بے حد حیرت ہوئی۔

ٹھاکر اودل سنگھ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ نیلے کو شہر کا راستا تو بتایا ہی نہیں گیا تھا۔ یہ

Scanned with CamScanner

اپنے آپ کیسے آگیا؟ پھر بھی انھیں دل ہی دل میں بہت خوشی محسوس ہوئی جیسے نیلے کا یہ کارنامہ ان کی ذاتی کارکردگی ہو۔

"اس کا اس طرح آنا ٹھیک نہیں ہے،" پرتاپ بولا۔ "شہر میں نقصان کرے گا تو مشکل ہو جائے گی..."

"کوئی بات نہیں، اسے سمجھا دیں گے،" اودل سنگھ خوشی سے بولے۔

اونکار نے بھی نیلے کی پیٹھ تھپتھپائی۔

رات بھر نیلا لان کے پھولوں کو کھوندتا رہا اور منی پلانٹ کی بیلوں کو کھاتا رہا۔

صبح سب سے پہلے مالی نے یہ نقشہ دیکھا اور زور زور سے نیلے کو گالیاں دینے لگا۔ اودل سنگھ آنکھیں ملتے باہر آئے اور پھولوں اور بیلوں کا حشر اور مالی کو غصے میں دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اونکار بھی ان کے پیچھے کھڑا ہنس رہا تھا۔ بڑکی کے واقعے بعد وہ باپ کی زیادہ چمچہ گیری کرنے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے نیلا قصبے لایا گیا اور پھر قصبے سے دیہات پہنچایا گیا۔

ہیڈ ماصاب نے جب یہ واقعہ سنا تو انھوں نے بتایا کہ "جب پراکرتی کے خلاف کھان پان ہوتا ہے تو سبھے کی آکرتی بگڑ جاتی ہے اور کچھ ایسی شکتیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو جانور میں پیدائشی طور نہیں ہوتیں..."

معلوم نہیں یہ بات کہاں تک صحیح تھی، لیکن اتنا ضرور تھا کہ نیلے سے اب مویشی بھی ڈرنے لگے تھے۔ سانی کھاتے بیل اسے دیکھ کر رسیاں تڑانے لگتے اور تھان پر بندھے گھوڑے اسے پاس آتا دیکھ کر بجائے اس کے کہ اگلے پیر اٹھا کر حملہ کریں، پچھلے پیر اٹھا اٹھا کر کودنے لگتے تھے۔ گڑھی کے سامنے بندھے کمہار کے گدھے تو اسے دیکھتے ہی ایک دوسرے کے پیٹ کے نیچے گھسنے لگتے تھے۔ وہ ان سب سے بے نیاز، اینٹھتا بررتا، اپنے راستے چلتا رہتا۔ اپنے راستے چلنے سے مراد یہ کہ پڑوس کے گھروں میں گھس کر برتن بھانڈے توڑتا، پاٹھ شالا میں جا کر ہیڈ ماصاب کی کرسی اُلٹ دیتا اور ننھے ننھے بچوں کو سینگوں سے ریلتا دھکیلتا رہتا... وہ اب تک آٹھ بچوں کو زخمی کر چکا تھا۔ ٹھاکر نے ان بچوں کے والدین کو بھری پنچایت میں سمجھایا کہ یہی آٹھ بچے نیلے کو پتھر مار مار کر پریشان کرتے ہیں، ورنہ ڈیڑھ سو بچوں میں صرف انھیں آٹھ کو کیوں پسند کرتا؟ باقی بچوں کے والدین نے اپنے اپنے نیک بچوں کا خیال کر کے اطمینان کا سانس لیا اور ان آٹھ بچوں کے والدین کو دیر تک

سمجھاتے رہے کہ بے زبان پشو کو چھیڑنا کتنی بری بات ہے۔

نیلے نے ایک دن صبح ہی صبح ہرا چارا کھا کر سرسوں کا تیل پیا۔ ٹھاکر نے آج اسے مونگ پھلی کے دانے بھی دو مٹھی بھر کے کھلائے۔ نیلا اچھلتا ہوا گڑھی کے دروازے کے باہر گیا۔ تھوڑی دیر میں شور اٹھا کہ نیلے نے کھیتوں میں گیہوں کی نرائی کرتی بھیکو کی جوان بہو کی آنتیں ایک ہی ٹکر میں باہر نکال دی ہیں۔ ٹھاکر جیپ میں بھیکو کی بہو کو ڈال کر فوراً شہر کے اسپتال پہنچے۔ آپریشن کرا کے دو ہفتے بعد جب گاؤں لائے تو گاؤں والوں نے تیسرے دن پنچایت کا نیوتا دیا۔

اودل سنگھ بھی پنچایت میں موجود تھے۔ پچھلے دو دنوں سے وہ گاؤں کے واحد مندر کے پجاری کے پاس رات کو دیر تک بیٹھے رہے تھے۔

پنچایت میں پنچوں کے پاس ٹھاکر بھی کرسی پر جمے بیٹھے رہے، لیکن انھوں نے سر جھکا رکھا تھا۔ بھیکو کے لونڈے نے بڑی تیز آواز میں نیلے کی شکایت کی تھی اور پنچوں سے کہا تھا کہ اسے جنگل میں چھوڑنے کا ٹرنت پربندھ کیا جائے۔

اودل سنگھ کچھ دنوں سے محسوس کر رہے تھے کہ کچھ برادریاں ان سے خاص طور پر بہت جلنے لگی ہیں۔ بھیکو کی برداری بھی ان میں سے ہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ چپ رہے۔ مندر کے پجاری بھی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انھیں دیکھ کر پنچوں نے اور کئی لوگوں نے کھڑے ہو کر ڈنڈوت کی اور پجاری جی کو برگد کے گھیرے میں بڑے مونڈھے پر بٹھایا۔

سرپنچ ادھیکاری لال کو اودل سنگھ نے ہی سرپنچ بنوایا تھا۔ وہ اس وقت بڑے شش و پنج میں تھا۔ فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے پنچوں سے کچھ مشورہ کیا۔ پھر تھوڑی شرمندگی اور کھسیاہٹ کے ساتھ اس نے اودل سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "نمبردار، آپ تو جانتے ہی ہیں ہم سب لوگ آپ کے جانور سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ پر اب اس کا کچھ پربندھ کرنا آپ بھی ضروری سمجھتے ہوں گے، کیوں کہ پچھلے مہینے اس نے اسکول کے آٹھ بچے زخمی کیے اور بھیکو کی بہو کا پیٹ پھاڑ دیا ... آپ اس بارے میں کیا وچار رکھتے ہیں؟"

وہ اگھن کا آسمان تھا اور اگھن کا آسمان نیلا ہوتا ہے۔ وہ ایسا موسم تھا کہ جاڑا تیز ہونا شروع ہو جاتا ہے، اس لیے اس موسم میں جاڑا تیز ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ سب بڑے برگد کے نیچے بیٹھے تھے کیوں کہ اتنی بڑی پنچایت کے لیے گھر چھوٹا پڑتا تھا۔ برگد پر بہت سے پرندے بیٹھے تھے اور

Scanned with CamScanner

بہت شور مچا رہے تھے کیوں کہ پرندے برگد پر بہت شور مچاتے ہیں۔ ٹھاکر خاموش تھے، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ کبھی کبھی خاموش رہنا بولنے سے زیادہ چیختا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھے تھے، کیوں کہ اس پوز کے بھی کچھ خاص فائدے ہیں۔ اس وقت اچانک پنچوں نے بولنا بند کر دیا... سارے میں سناٹا چھا گیا...

جب اودل سنگھ نے محسوس کر لیا کہ اب سناٹا اتنا گھرا ہو گیا ہے کہ ایک دھیما سا بول بھی اسے کتر کے پھینک دے تو انھوں نے مضبوط اور دکھی لہجے میں فیصلہ کن انداز میں کہا:

"میں تو صرف پشو کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتا تھا۔ پر آپ لوگ اگر آدیش دو تو میں اسے ابھی ابھی گولی مار دوں..." وہ رک کر بڑی زور سے چلائے، "رام دین! بندوق اٹھا کر لا... ایل جی کے چار کارتوس بھی..." پوری پنچایت کانپ اٹھی۔ پنچوں کے سر اپنی اپنی گود میں چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ سناٹا پھر چھا جائے، ایک کڑک دار آواز ابھری:

"کیا بکتا ہے مورکھ! گئو بدھ کا شراپ گاؤں پر ڈالے گا؟"

یہ پجاری کی آواز تھی جو مونڈھے سے کھڑے ہو کر غصے سے کانپ رہے تھے۔ انھوں نے سمرتیوں سے ثابت کیا کہ نیلا بھی دراصل گئوماتا کے خاندان کا جانور ہے۔ اس کی ٹانگیں، اس کے کھُر، اس کے سینگ، سب ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے گائے کے... انھوں نے بتایا کہ اگر گئو بدھ ہوا تو گاؤں میں پہلے تو ہیضے کی وبا آئے گی جو خاص طور سے گود کے بچوں کو چن چن کر لے جائے گی۔ (ماؤں نے ننھے ننھے بچوں کو سینے سے لپٹا لیا۔) پھر تیز موسلادھار بارش ہو گی اور کھیتوں کے پودے جڑ سمیت نکل کر اس سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ (مردوں نے اچک اچک کر اپنے کھیتوں کی اور دیکھا۔) پھر آندھیاں آئیں گی اور درخت یعنی برگد جیسے بڑے ورکش بھی اپنی جٹاؤں کو سمیٹ کر دھرتی سے نکل کر زمین پر بچھ جائیں گے۔ (پوری پنچایت نے سہمے سہمے انداز سے برگد کے درخت کی طرف دیکھا۔) پھر رات کو بے تال آئیں گے اور گئو بدھ کرانے والوں کے گلے میں دانت گاڑ کر سارا رکت پی جائیں گے۔ (پوری پنچایت نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر ہاتھوں کو دیکھا۔ خون کا نشان نہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔) "اب بولو... کون کرائے گا گئو بدھ؟ اودل سنگھ! آخر تو سارے گاؤں پر یہ آفت کیوں ڈالنا چاہتا ہے؟ بول!"

نمبردار اودل سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر بنتی کی۔ "مہاراج! میں پنچوں کے آدیش کا سیوک ہوں۔

میں گاؤں بھر کی بات سے الگ نہیں جا سکتا۔"

مہاراج، جو اَب تک مجمع کو پڑھ چکے تھے، چیخ کر بولے:

"گاؤں میں کون ہے جو نیلے کو مارنے کی بات کہہ رہا ہے؟"

سناٹا چھا گیا۔

"مارنے کی بات نہیں، مہاراج جی... ہم کہتے ہیں کہ اسے جنگل میں چھوڑ دیا جائے..." بھیکو کا لونڈا کھڑا ہو کر کنمنایا۔

"جنگل میں چھوڑ دیا جائے؟ یہاں جنگل کہاں ہیں؟ میدان ہی میدان ہیں۔ اگر کسی مُسلے نے پلے پلائے نیلے کو گولی مار دی تو بدھ کی ذمے داری گاؤں پر سے ہٹ جائے گی کیا؟ بولو... جواب دو!"

ٹھاکر اودل سنگھ سر جھکائے حساب لگاتے رہے کہ پجاری جی نہ صرف یہ کہ مشورے کے مطابق خیالات دہرا رہے ہیں بلکہ تقریباً انھیں الفاظ میں جن کی رہرسل پچھلی دو راتوں سے ہو رہی تھی۔

"میدان میں کتنے جنگلی نیلے بھاگتے رہتے ہیں، کبھی اس کھیت میں کبھی اس کھیت میں۔ کبھی اس کا گیہوں چکھا کبھی اس کی ارہر پر منھ مارا... ان میں سے کسی کو تم نے مارا؟ جواب دو؟"

"للکار تو دیتے ہیں... بھگا تو دیتے ہیں..." بھیکو کا لونڈا آسانی سے ہار نہیں مان رہا تھا، حالاں کہ زور ٹوٹ رہا تھا۔

"تو اسے بھی للکار دیا کرو۔ یہ تو انسانوں میں پلا ہے۔ للکار فوراً سمجھ لے گا..."

نیلا گڑھی کے دروازے سے منھ نکالے پنچایت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ پجاری نے اسے ایک نظر دیکھ کر رام لیلا والے انداز میں کہا:

"بے زبان پشو نے دور سے منشوں کو دیکھا اور اپنے بارے میں ان کی زبان سے بدھ کی بات سن کر ایشور سے کہا کہ ہے بھگون! میں کہاں آ پھنسا ہوں؟ ہے بھگون! میں کہاں آ پھنسا ہوں؟ ہے بھگون! میں کہاں آ پھنسا ہوں؟"

پوری پنچایت نے کھڑے ہو کر گڑھی کے دروازے سے سر نکالے نیلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس بات کا پورا یقین کیا کہ نیلے نے ابھی ابھی آسمان کی طرف دیکھ کر ایشور سے یہی

Scanned with CamScanner

بات کہی ہے۔ سب کے من بھاری ہو گئے اور سر لٹک کر سینے پر آ گئے۔

اودل سنگھ نے دل ہی دل میں پجاری کو داد دی کہ یہ آخری ٹکڑا مشورے کے مطابق نہ ہونے کے باوجود بڑا اثر دار تھا۔

پنچوں نے تھوڑی دیر بعد اپنا فیصلہ سنایا۔

"سبھی لوگوں سے بنتی ہے کہ نیل گائے کو کچھ نہ کچھ کھلاتے رہنا چاہیے۔ جب بھی وہ ان کے پاس سے گزرے تو اسے کچھ کھانے کو دے دیں۔ اگر وہ سینگ سامنے کر کے آئے تو اسے للکار کر ایک طرف ہٹ جائیں... گئو بدھ کے بارے میں کوئی بات دھیان میں نہ لائیں۔ اس سے شراپ لگتا ہے..."

پنچایت جب چھٹی تو سبھی لوگ اودل سنگھ کے شکر گزار تھے جنھوں نے آج نیلے کو گولی نہ مار کر سارے گاؤں کو مختلف آفتوں سے بچا لیا تھا۔ ٹھاکر سر جھکائے سب کا دھنیہ واد خاکساری کے انداز میں قبول کرتے رہے۔ بھیکو کا لونڈا جب پنچایت سے اٹھا تو اس کا دل مطمئن نہیں تھا، مگر وہ بے بس تھا۔ اسے لگا جیسے اندر ہی اندر کوئی نم لکیر دماغ سے آنکھوں تک کھنچ گئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر اپنے گھر کی طرف چلا جہاں اس کی بیوی پیٹ پر پٹیاں باندھے چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر گردن موڑ کر اسے دیکھنا چاہا تو پیٹ کے ٹانکوں میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کا سر دھم سے چارپائی پر آ رہا اور وہ ہولے ہولے سسک کر کانپنے لگی۔ مگر اس حالت میں بھی اس نے محسوس کیا کہ اس کے پتی کی چال سے ایسا لگ رہا ہے جیسے پنچایت سے واپسی پر خلیفہ حجام نے اس کے پتی کو کسی چھپر تلے گرا کر بدھیا کر دیا ہو۔

۷

نیلے کی قصبے والی واردات زیادہ گمبھیر تھی۔

اس واردات کا تعلق بھی دیہات سے ہی تھا، بلکہ شاید جنگل سے تھا... یا ممکن ہے دونوں سے ہو۔ ایک دن جب سورج کچھ اوپر چڑھ آیا تھا اور ہوا میں گرمی آ چکی تھی تو نیلے نے گڑھی سے

نکل کر کھیتوں کا رخ کیا۔ کھیت ویران پڑے تھے۔ گیہوں کاٹ کر دائیں چلا کر اور تھریشر کی مدد سے بوروں میں بند ہو کر کھلیانوں میں آ چکا تھا۔ کھیتوں کے پاس پہنچ کر نیلے نے زمین پر منہ مارا۔ گیہوں کے سوکھے پودے، جو اِدھر اُدھر پڑے رہ گئے تھے، بہت بے مزہ محسوس ہوئے۔ اس نے بیزاری کے ساتھ سامنے میدان کی طرف دیکھا۔ سامنے اس کے ہم جنس کھڑے تھے۔ اس نے انھیں پہلی بار نہیں دیکھا تھا۔ ایک دفعہ، دو موسم پہلے، وہ دو تین گھنٹوں کے لیے ان میں رہ بھی آیا تھا، لیکن ان کی وحشت کا ساتھ نہیں دے پایا تھا۔ داڑھی والے سیاہ نیلے نے اسے دیکھ کر سینگ آگے کر کے پینترا بھی بدلا تھا، مگر وہ اس سے محفوظ فاصلے پر کھڑا رہا تھا۔ بھوری ماداؤں نے اسے پہلے حیرت، پھر خوشی، پھر شوق کی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس نے بھی ان میں کشش محسوس کی تھی۔ اچانک پیچھے سے کھیت والوں نے چلاچلا کر روندنا شروع کر دیا تھا۔ داڑھی والا سیاہ نیلا زمین پر اچھلا تھا اور ماداؤں کے پیچھے تیزی سے دوڑنے لگا تھا جو اس سے بھی پہلے کان ہلا ہلا کر اور دُم گھما گھما کر خطرے کا اعلان کر کے بھاگ چکی تھیں۔ نیلا اضطراری طور پر ان کے پیچھے بھاگا تھا۔ وہ پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا مگر ان کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ اسے اتنا دوڑنے کی عادت بھی نہیں تھی۔ دراصل اسے دوڑنے کی ہی عادت نہیں رہ گئی تھی۔ دوڑنے کی عادت ختم ہو جائے تو بدن کی چربی جلتی نہیں، گانٹھ بن کر رگ پٹھوں میں سما جاتی ہے، اور بھاگنا تو ایک طرف چلنے میں بھی رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اتنی باریکیاں وہ شاید نہیں سمجھ پایا تھا لیکن اتنا وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ ان بھوری، دبلی اور چلبلی ماداؤں اور سیاہ داڑھی والے کے ساتھ ساتھ دوڑنا اس کے بس کی بات نہیں... وہ ایک کھیت میں اچانک رک گیا۔ دوڑتے ہوئے لونڈے اس کے پاس جا کر اسے پہچان کر اپنے ساتھ گڑھی میں لے آئے جہاں اودل سنگھ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اودل سنگھ نے اسے گڑ کھلایا اور سرسوں کا تیل پلایا، تب گانٹھوں کا درد کم ہوا۔ اس دن کے بعد سے اس نے متعدد بار اپنے ہم جنسوں کو دیکھا لیکن کبھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ ان کے پیچھے بھاگے۔ البتہ دل چاہتا تھا کہ دو تین بھوری مادائیں اس کے ساتھ بھی گڑھی اور حویلی میں ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔

آج وہ ایک ٹک ان کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ داڑھی والا کالا اور مادائیں اس کی طرف منہ کر کے ساکت کھڑے تھے۔ وہ گڑھی اور دیہات سے بہت دور، کھیتوں کو پار کر کے میدانوں میں آ گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ غیر ارادی طور پر ان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ان سے تین چار کھیت دور تھا کہ

Scanned with CamScanner

اچانک رک گیا۔ ان ہم جنسوں کے پیچھے کوئی آدمی ہاتھ میں ایک لمبی چیز اٹھائے چپکے چپکے ٹیوب ویل کی گول میں چھپتا چھپتا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ نیلا چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمیوں کے درمیان پلا تھا، اسے آدمیوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مادائیں ایک ایک قدم کر کے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کالا داڑھی والا سب سے پیچھے رہ گیا تھا۔ اچانک وہ آدمی سیدھا کھڑا ہوا اور لمبی سی چیز کالے داڑھی والے کی طرف کر کے زوردار دھماکا کیا۔ کالا داڑھی والا، بھوری مادائیں اور خود وہ، سب کے سب زمین سے ایک ایک ہاتھ اوپر اچھلے۔ کالا داڑھی والا وہیں گر پڑا اور اگلی ٹانگوں سے اٹھنے کی کوشش کی کہ ایک اور دھماکا ہوا اور وہ زمین پر گردان ڈال کر ڈکرانے لگا۔ بھوری مادائیں کنوتیاں بدل کر دم گھماتی ہوئی تیزی سے بھاگیں اور حدِ نظر تک دوڑتی چلی گئیں، کھو گئیں ... اس نے دیکھا کہ کالے داڑھی والے کے بدن سے لال لال خون نکل کر زمین میں جذب ہو رہا ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہیں اضطراری طور پر زمین پر پیر مارنے لگا۔ دو چار آدمی اس پہلے والے آدمی کے پاس بھاگتے ہوئے آئے اور جیپ لا کر داڑھی والے کو اس میں ڈال کر دُھول اڑاتے چلے گئے۔ جس وقت وہ اسے جیپ میں ڈال رہے تھے تو اس کی تھوتھنی اور پچھلی ٹانگیں زمین سے ٹکرا ٹکرا کر گھسٹ رہی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ ڈکرا ڈکرا کر ٹھنڈا ہو رہا تھا... اس کی بے بسی کا یہ منظر دیکھ کر نیلا گھبرا کر پیچھے منہ کر کے جو بھاگا تو گڑھی میں آ کر رکا اور پھر ٹھاکر اودل سنگھ کی چارپائی کے پاس کھڑے ہو کر خود کو دوبارہ محفوظ خیال کر کے اینڈنے لگا۔

دوسرے دن اودل سنگھ نے اونکار کو بتایا کہ پلٹن کمپنی والے گورے نے کل میدان میں سے ایک نیلا مارا جس پر فیکٹری کے لوگوں نے بہت لے دے کی۔ بڑی مشکل سے پولیس کو دے دلا کر معاملہ ٹالا گیا۔ اس دن کے بعد سے اس نے کبھی جنگل میں مادؤں کے پاس جانے کی خواہش تک نہیں کی۔ کسی کسی وقت وہ کھوئی خواہش اس کے سر سے شروع ہو کر ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی اس کی ٹانگوں کے درمیان پہنچتی تھی تو اسے کالے داڑھی والے کی گھسٹتی ہوئی ٹانگیں اور لتھڑتی ہوئی تھوتھنی یاد آ جاتی... وہ سنسناہٹ ٹانگوں کے بیچ سے ریڑھ کی ہڈی سے گزرتی ہوئی واپس سر میں چلی جاتی۔

ٹھاکر اودل سنگھ، قصبے کی واردات والے دن، محمود صاحب کی بیٹی کی شادی کے نیوتے میں گئے ہوئے تھے۔ نیلا بھی ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔ محمود صاحب کی حویلی کے پاس میدان میں بڑا سا

Scanned with CamScanner

رنگین شامیانہ لگا تھا اور چاروں طرف موٹریں اور یکے کھڑے تھے۔ شاید پورے قصبے کی دعوت تھی۔ نمبردار جیپ پر تھے اور آہستہ آہستہ چلا رہے تھے کیوں کہ نیلا بھی ان کے ساتھ ساتھ دُلکی میں چل رہا تھا۔ شامیانے کے باہر محمود صاحب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نمبردار نے ہاتھ جوڑ کر مبارک باد دی۔ تھوڑی دیر بعد بڑے قاضی صاحب نے خطبہ پڑھا کر ایجاب و قبول کرایا۔ دولھا نے اٹھ کر سہرے سے منھ نکال کر سب کو سلام کیا۔ مبارک بادیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹھاکر صاحب نے مرغ کا سالن اور دوسروں کی نظر بچا کر بڑے کے کباب کھائے۔ انھیں باراتیوں کے ساتھ ہی بٹھا دیا گیا تھا حالاں کہ وہ منع کرتے رہے کہ میں تو لڑکی والا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے بٹوے سے ۱۰۱ روپے نکال کر محمود صاحب کو مخاطب کر کے پیش کیے اور ہاتھ جوڑ دیے۔ محمود صاحب نے "اس کی کیا ضرورت تھی!" کہہ کر لفافہ شیروانی کی جیب میں رکھا۔ ایک نوجوان باراتی سہرا پڑھ رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے دیکھا کہ محمود صاحب کا بڑا لڑکا شامیانے کے باہر کھڑے نیلے کو گڑ کھلا رہا تھا۔ وہ اس تواضع سے خوش ہوئے۔ واپسی کی اجازت لے کر وہ رخصت ہوئے۔ نیلا ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ بارات کے بہت سے لوگ بھی نیلے کو دیکھنے کی چاہ میں شامیانے سے باہر آ گئے تھے۔ ٹھاکر صاحب فخر کے ساتھ جیپ میں بیٹھے۔ نیلا دُلکی چلنے لگا۔ راستے میں ایک موڑ کاٹ کر انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، نیلا رک گیا تھا اور کانجی ہاؤس کے پاس طویلے میں ایک گائے کو ہری ہوتا دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ اپنی جگہ سے اُچھلا اور تیزی سے بھاگتا ہوا جیپ سے بھی آگے نکل گیا اور راستے میں ملنے والے ہر خوانچے کو کھدیڑتا، ہر آدمی کو ریلتا، ہر دکان کو سینگوں سے دھکیلتا، حویلی کی طرف بھاگا۔ راستے میں اس نے اڈے کی مسجد سے نکلتے ہوئے بڈھے ملاجی پر کاری وار کیا۔ وہ جا کر سامنے کی پکی دوکان کے چبوترے سے ٹکرائے اور سر کی چوٹ کھا کر وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہونے لگے۔ ٹھاکر تیزی سے حویلی میں آئے اور جیپ کھڑی کر کے دوبارہ وہاں واپس آئے جہاں سیکڑوں آدمیوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کیوں کہ اس دن محمود صاحب کی لڑکی کی شادی تھی اور محمود صاحب ٹھاکر اودل سنگھ کے پرانے مخالف تھے، اور کیوں کہ نیلے کے شکار ہونے والے ملاجی تھے، اور کیوں کہ قصبے میں بہت دن سے کچھ ہوا بھی نہیں تھا، اس لیے معاملہ اتنی جلدی مذہبی رنگ میں رنگا کہ اودل سنگھ نمبردار کو کسی تیاری کا موقع ہی نہیں ملا۔

محمود صاحب کے باراتی بھی بازار میں آ گئے تھے۔ ان کے سامنے محمود صاحب نے سبکی

محسوس کی کہ قصبے میں ان کے ہوتے ہوئے اودل سنگھ کا نیلا ایک مسلمان، وہ بھی مسجد کے موذن، کو یوں مار جائے۔ تھوڑی دیر بعد نعرے لگنا شروع ہو گئے: "جان کا بدلہ جان سے..." "خون کا بدلہ خون سے..." وغیرہ۔ اب اِدھر بھی بھیڑ کی تیاری ہوئی۔ اونکار نے راکیش اور رمیش کو ساتوں محلوں میں دوڑایا۔ بھیڑ چیرتا ہوا، ڈنڈا ہلاتا ہوا تھانے کا انچارج وردی پہنے آیا اور ملاجی کو جیپ میں لدوا کر شہر کے اسپتال بھیج دیا گیا۔ بھیڑ جذبات میں بے قابو ہو رہی تھی۔ تھانے دار نے مشورہ دیا کہ "تھانے چلے چلیے۔ آپ کے لیے اور میرے لیے وہی زیادہ محفوظ جگہ ہے۔" ٹھاکر اودل سنگھ جب تھانے تک بہ حفاظت آ گئے اور تھانے دار کے دائیں طرف والی کرسی پر محمود صاحب کے مقابل بیٹھ گئے تو ان کے ذہن کی بیٹری نے دوبارہ کام کرنا شروع کیا۔ محمود صاحب کا اصرار تھا کہ فوراً دفعہ ۳۰۲ کی رپورٹ لکھی جائے۔ ٹھاکر خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ کبھی کبھی منہ اٹھا کر تھانے کے پھاٹک کے باہر کھڑی بھیڑ کو بھی دیکھ لیتے۔ آہستہ آہستہ ان کے آدمی بھی بھیڑ کا حصہ بنتے جا رہے تھے... پھر انھوں نے پرتاپ اور اونکار کو دیکھا جو اپنے ہم عمر لونڈوں کے ساتھ ایک الگ گوشے میں کھڑے تھے... پھر انھوں نے تھانہ انچارج کو دیکھا جو ابھی ابھی تبدیل ہو کر آیا تھا اور وائرلیس پر ایس پی سے کہہ رہا تھا کہ پولیس ہیڈکوارٹر سے کچھ کمک بھیج دی جائے، حالات بے قابو ہو سکتے ہیں... پھر انھوں نے محمود صاحب کو دیکھا جن کی جیب میں ان کے ۱۰۵ روپے ابھی بھی پڑے ہوں گے۔ پھر انھوں نے سوچا کہ رام دین اتنی دیر میں نیلے کو دیہات کی گڑھی میں جا کر چھوڑ آیا ہو گا۔ پھر انھوں نے بہ آوازِ بلند محمود صاحب سے کہا:

"محمود میاں، میرے دونوں لڑکے بھی یہیں ہیں۔ آپ بھی ذرا اپنے صاحب زادے کو بلا لیجیے تاکہ آپ کو یہ شکایت نہ رہے کہ میرے بیٹوں کو تو میرے ساتھ تھانے میں آنے دیا گیا اور آپ کو محروم رکھا گیا..."

محمود صاحب اس سخاوت کا مطلب نہیں سمجھے، لیکن انھوں نے جلدی جلدی آوازیں دے کر بیٹے کو تھانے میں بھیجنے کے لیے کچھ لوگوں کو ہدایتیں دیں۔ ان کا بڑا بیٹا بھیڑ میں ہی موجود تھا، آ کر ان کے پاس خاموش کھڑا ہو گیا۔

ٹھاکر صاحب نے انچارج کے کان کے پاس جا کر کچھ سرگوشی کی۔ انچارج کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ٹھاکر صاحب نے اس کے منہ کو دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ اب ان کے

Scanned with CamScanner

چہرے پر ان کا پرانا اعتماد لوٹ آیا تھا، کیوں کہ تھانا انچارج کا منھ ابھی بھی اتنا کھلا ہوا تھا کہ اندر سے پان میں رنگی داڑھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

"محمود میاں!" ٹھاکر صاحب نرمی سے بولے۔ "آج آپ کی بیٹی کی شادی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کی تقریب میں کوئی بدمزگی ہو..."

محمود میاں اور ان کا بیٹا دونوں اس جملے کا مطلب نہیں سمجھے۔ ٹھاکر نے ان کی اس نافہمی کا لطف لیا اور ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولے، "آج آپ نے شادی میں بلا کر مجھ سے اپنا سیاسی بدلہ لینے کے لیے، مجھے بدنام کرنے کے لیے، میرے نیلے کو دھتورا کھلوایا... آپ کے بیٹے نے اپنے ہاتھ سے دھتورا کھلایا... سینکڑوں آدمی اس بات کے گواہ ہیں۔ کیوں میاں، تم نے نیلے کو کچھ کھلایا تھا کہ نہیں؟"

محمود صاحب کا بیٹا حیران رہ گیا۔

"میں نے تو گڑ کھلایا تھا..."

"کون یقین کرے گا کہ آپ میرے جانور سے اتنی محبت کر سکتے ہیں؟ آپ تو اس وقت میری عزت کے دشمن ہو رہے ہیں۔"

بازی پلٹتی دیکھ کر محمود میاں کا رنگ فق ہو گیا۔ لیکن انھوں نے پڑھے لکھوں والا ایک پینترا چلا۔

"نیلے کا میڈیکل چیک اپ کروا کر دیکھیں گے۔"

ٹھاکر صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک کونے میں لے گئے۔ بھیڑ خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ انچارج وائرلیس پر ملاجی کی خیریت معلوم کرتا رہا...

ٹھاکر صاحب نے محمود صاحب سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا، "نیلا گڑھی پہنچ چکا ہے اور اب تک اسے برائے نام ہی سہی لیکن اتنا دھتورا کھلایا جا چکا ہو گا کہ میڈیکل رپورٹ میں آ جائے۔ کوئی اس بات کا یقین نہیں کرے گا کہ میں نے اسے دھتورا کھلایا ہے، کیوں کہ قصبے کی آدھی آبادی اور آپ کی پوری بارات نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آپ کے صاحب زادے نے اسے گڑ میں ملا ملا کر خوب دھتورا کھلایا... اب جیسا آپ بہتر سمجھیں، میں تو بہرحال آپ کا شبہ چِنتک ہوں۔ میں نہیں چاہوں گا کہ جس بہن کی آج رخصتی ہو رہی ہے اس کے بھائی کو حوالات

Scanned with CamScanner

میں بٹھا کر سوالات کیے جائیں..."

محمود میاں کی سمجھ کام نہیں کر رہی تھی۔ آج بہت عمدہ موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ بیٹے کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس کم بخت نیلے کو گڑکھلائے، اور وہ بھی سب کے سامنے کھلائے!

ٹھاکر صاحب کرسی کی پشت سے پوری پیٹھ لگائے اطمینان کے ساتھ تنے بیٹھے تھے۔ اس طرح بیٹھ کر جو بات کہی جائے اس میں بڑا وزن پیدا ہو جاتا ہے۔

انچارج نے موقعے کو بڑی جلدی پڑھا اور محمود صاحب سے کہا۔ "۳۰۲ کی رپورٹ تب تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک موت واقع نہ ہو جائے... ۳۰۷ کی رپورٹ لکھی جا سکتی ہے لیکن کون لکھوائے گا؟ میں اپنی طرف سے کیس کو تبھی درج کروں گا جب مجھے یہ علم ہو جائے کہ مارنے والا کون تھا اور اس کی ولدیت کیا تھی۔ ٹھاکر صاحب تو کہتے ہیں کہ اس نیلے سے ان کا اتنا ہی سمبندھ ہے کہ وہ ان کی گڑھی میں حویلی میں آ جاتا ہے تو وہ اسے کھانا دے دیتے ہیں۔ وہ اسے اپنا پالتو ماننے کو تیار نہیں ہیں..."

"یہ سچ بھی ہے،" ٹھاکر اودل سنگھ مضبوط لہجے میں بولے۔ "نہ تو اس کی گردن میں میرا پٹا ہے نہ اسے پالنے کا کوئی نمبری لائسنس میرے پاس ہے!"

"تو اسے گولی سے اڑا دیجیے!" محمود صاحب کا بیٹا جوش میں چلایا۔

"ضرور اڑا دیجیے۔ لیکن قصبے کی آدھی آبادی آپ کی دشمن ہو جائے گی کہ یہ گئوہتیا ہو گی۔ میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے، لیکن آپ کو اپنا سمجھ کر کہہ رہا ہوں..." ٹھاکر صاحب اب ماہر شہسوار کی طرح دلکی چل رہے تھے۔

اب انچارج نے اپنی باری سنبھالی۔

"اہم بات یہ ہے کہ ملاجی کی اصل چوٹ سر کی چوٹ ہے جو دکان کے چبوترے سے ٹکرانے کی وجہ سے لگی۔ پیٹھ پر تو نیلے کا معمولی دھکا لگا تھا..."

"کیا وہ جان بوجھ کر دکان کے چبوترے سے ٹکرائے تھے؟" محمود صاحب کا لڑکا بولا۔

"نہیں..." انچارج رسان سے گویا ہوا۔ "لیکن فوجداری عدالت میں اس قسم کی باریکیاں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں... پھر نیلے پر مقدمہ کیسے چلایا جا سکتا ہے جب کہ ٹھاکر صاحب اسے اپنا پالتو ماننے پر راضی ہی نہیں ہیں..."

Scanned with CamScanner

"واہ! گڑھی اور حویلی کی حفاظت کرے تو پالتو اور کہیں غلط حرکت کر جائے تو شیر..." محمود صاحب کا لڑکا بہت طیش میں تھا۔

ٹھاکر صاحب مسکراتے رہے۔ اس درمیان اپنے بیٹوں اور ان کے ساتھیوں کی مدد سے وہ مجمعے میں یہ شوشہ چھوڑ چکے تھے کہ نیلے کو دھتورا کھلا کر وقتی طور پر پاگل کرنے والا کوئی اور نہیں ان کے قریبی مخالف محمود صاحب کا بیٹا ہے جو اپنے جرم کا اقرار تھانا انچارج کے سامنے کر چکا ہے۔ مجمع کے تیور بھی بدلتے جا رہے تھے۔ جوش و خروش اچانک کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"پھر ایک اہم بات اور..." انچارج نے قانون کی کتاب کا ایک سبق یاد کر کے بتایا۔ "اگر ٹھاکر صاحب آپ کے حوالے نیلے کو کر بھی دیں تو آپ اس کو مار نہیں سکتے۔ ایک تو عوامی رائے آپ کے خلاف ہو گی کیوں کہ یہ گئو پریوار کا مانا جاتا ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کیوں کہ میں تو سرکاری ملازم ہوں، صرف قانون کی بات سمجھ سکتا ہوں اور سمجھا سکتا ہوں۔ ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ اسے یوں بھی نہیں مار سکتے کہ قانون مجریہ ۱۹۷۲ کے مطابق اسے مارنا جرم قابلِ دست اندازی پولیس ہے اور اس کی سزا..." وہ چپ ہو گیا اس سے زیادہ بولنا ضروری بھی نہیں تھا کہ محمود صاحب اب رازداری کے لہجے میں ٹھاکر صاحب سے مشورہ کر رہے تھے کہ اگر ملاجی بچ جائیں تو ٹھاکر صاحب کو کیا خدمت کرنا چاہیے اور خدانخواستہ کام آجائیں تو ان کی بیوہ کو کیا دینا چاہیے۔

انچارج نے پھاٹک پر جا کر پہلے تو سب کو یہ بتایا کہ "ایسے موقعوں پر بدلے اور انتقام سے زیادہ اس بات کی پروا کرنی چاہیے کہ مضروب کو جلد از جلد اسپتال لے جایا جائے۔ آپ میں سے کسی نے یہ کام کیا؟ ان کو اسپتال تک لے جانا تو بڑی بات، اٹھا کر پانی ہی پلا دیا ہوتا۔" مجمعے کو سانپ سونگھ گیا۔

"دھارمک رنگ دینے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اس کا انجام فساد بھی ہو سکتا ہے جس میں دسیوں بے گناہ مارے جا سکتے ہیں۔" مجمعے کو دوسرا سانپ سونگھ گیا۔

پھر اس نے دیسی گالیوں اور بدیسی کرمنل کوڈ کی مدد سے مجمعے کو بتایا کہ مجمعے کا ہر آدمی کم از کم دو تین دفعات کی زد میں ہے۔ جب وہ سارے سانپ سنگھوا چکا تو آ کر اپنی کرسی پر یوں اکڑ کر بیٹھ گیا جیسے تھانا انچارج کو بیٹھنا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

جب وائرلیس پر ملاجی کی موت کی اطلاع ملی تب اس نے پوز میں قدرے فرق لانا مناسب سمجھا۔

اس درمیان مجمع چھٹ چکا تھا۔ وہ رات ٹھاکر صاحب نے حویلی میں نہیں گڑھی میں گزاری۔ ملاجی کے خاندان کو ٹھاکر اودل سنگھ نے خاطر خواہ تاوان دیا اور محمود صاحب نے مشورہ دیا کہ اس روپے کو خاموشی سے لے کر کام میں لے آؤ ورنہ مسلمانوں کو معلوم ہو گیا تو تمھاری عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔

انھوں نے سمجھایا:

"اور ویسے بھی اس واردات میں ٹھاکر اودل سنگھ کا کیا قصور ہے؟ دراصل نیلا ان کا پالتو جانور تو ہے نہیں۔ اس کا مطلب وہ وحشی ہے۔ وہ وحشی اس لیے ہے کہ ٹھاکر صاحب نے اس کے گلے میں اپنا پٹا تو ڈالا نہیں ہے۔ تو اگر وہ وحشی ہے تو وحشت کبھی بھی بھڑک سکتی ہے، اور کیوں کہ وحشت کبھی بھی بھڑک سکتی ہے تو اس میں جانور کا کیا قصور؟ کیوں کہ ایک اعتبار سے جانور ایک الگ چیز ہے اور اس کی وحشت ایک الگ چیز، اس لیے کہ جانور پر وحشت ہمیشہ طاری رہتی نہیں، کبھی کبھی آتی ہے۔ تو جو چیز کبھی کبھی آتی ہے اس کے لیے جانور بھی مستقل مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔ تو جانور اگر وحشت سے الگ ایک چیز ہے تو اسے جانور پہلے سمجھنا چاہیے اور وحشی بعد میں۔ تو اگر وہ پہلے ایک جانور ہے اور وحشی بعد میں، تو اس صورت میں فیصلہ اس کی جانور والی حیثیت سے کرنا چاہیے نہ کہ وحشت والی حیثیت سے۔ اگر وحشت والی حیثیت سے فیصلہ کرنا ہے تو صرف حالتِ وحشت کے وقت ہی وہ فیصلہ مناسب جانا جائے گا نہ کہ ہر حالت میں۔ اور کیوں کہ وہ اس وقت وحشت والی حالت میں تو ہے نہیں، صرف جانور والی حالت میں ہے، تو اس صورت میں..."

ملاجی کے خاندان والے راضی ہو گئے۔

محمود صاحب نے خود پر اندر ہی اندر ناز کیا کہ وہ بھی اگر کوشش کریں تو ٹھاکر اودل سنگھ کے انداز میں خاصی دیر تک گفتگو کر سکتے ہیں، یعنی ایسی گفتگو جس میں جھوٹ کبھی بھی نہیں ہوتا، یعنی ہر لفظ سچا ہوتا ہے، لفظ کے معنی بھی سچے ہوتے ہیں اور ان لفظوں میں جو لفظ ملا کر بولے جاتے ہیں وہ بھی سچے ہوتے ہیں، اور ان لفظوں کے اور ان کے علاوہ جو دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان الفاظ کے معنی بھی سچے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان معنی میں جس خیال کی آمیزش اور آمیزش

میں جو ایک قسم کی معنوی حقیقت ہوتی ہے اور حقیقت میں جو اصلیت...

۸

ایک عرصے سے شہر کی منڈی کا مزاج بدل رہا تھا اس مزاج کا اثر قصبے اور دیہات پر پڑنا بھی لازمی تھا۔ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر تبدیلی آ رہی تھی۔ لیکن حالیہ دنوں میں کچھ تبدیلیاں اچانک اور واضح طور سے سامنے آنے لگی تھیں۔

ٹھاکر اودل سنگھ تبدیلی کو بہت جلد قبول کرتے تھے۔ دیہات میں سب سے پہلے آر آر 21 اور کے 68 گیہوں بیج کے طور پر انھوں نے ہی استعمال کیا تھا۔ یوریا کھاد سب سے پہلے انھوں نے ہی اپنے کھیتوں میں استعمال کی۔ تھریشر اور ٹریکٹر تو ضلعے میں سب سے پہلے ان کے یہاں آیا تھا۔ کس چیز پر کتنی رعایت ملتی ہے، انھیں ازبر رہتا تھا۔ کس شہر میں کیا کیا نئی چیزیں استعمال ہو رہی ہیں، انھیں سب سے پہلے معلوم ہو جاتا تھا۔ وہ ترقی کرنے اور پیسہ کمانے کے ہر ہنر سے واقف تھے۔ بس پیسے کا صحیح استعمال ایک ایسا باب تھا جس میں وہ زیادہ دل چسپی نہیں لیتے تھے۔ وہ اقتدار اور پیسے کو ایک دوسرے کا حامی و مددگار سمجھتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ ان میں کوئی بھی چیز ایک دوسرے کے بغیر نہیں حاصل کی جا سکتی۔ اقتدار کیوں کہ چھو کر محسوس کی جانے والی چیز نہیں (اور اس بات کا انھیں بہت افسوس تھا) اس لیے وہ اس کے بدل یعنی پیسے کو بہت حفاظت سے جمع کرتے تھے۔ اور اسی لیے نفسیاتی طور پر وہ نیلے کی ضرورت کے محتاج تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی وجہ سے بدنامی بھی بہت ہوئی لیکن وہ ساری بدنامیاں پیسے سے دھوئی جا سکتی تھیں ـــــ اور دھوئی جاتی رہی تھیں ـــــ اور پیسے کی حفاظت میں نیلے کا بڑا حصہ تھا۔ کبھی تو وہ بہت سنجیدگی سے یہ بات سوچتے کہ ان جیسے دولت مند اور صاحب اقتدار کے پاس اس قسم کا ایک ہتھیار ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں، کہ کچھ فتنے اسی لیے پالے جاتے ہیں کہ وہ بُرے وقت میں ساتھ دیں یا اچھے وقت کو اَور بہتر بنائیں۔

مال اور اقتدار کی اس بھاگم بھاگ آنکھ مچولی میں وہ کچھ معمولی چیزیں نظر انداز بھی کر گئے تھے

Scanned with CamScanner

— جیسے اپنی خانگی زندگی، ذاتی سکون اور ضمیر وغیرہ۔

جب سے منڈی کے مزاج میں اچانک تبدیلیاں آئی تھیں، وہ دن رات اپنی دیہاتی اراضی کی معیشت اور قصبے کی کاروباری زندگی کو شہر کی نئی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرنے میں لگے رہتے تھے۔ انھیں اتنا اطمینان ہر حال میں رہتا تھا کہ اگر ان کی آنکھیں بند ہو جائیں تو ان کے وارث موجود ہیں جو ان کے اقتدار اور تموّل دونوں کو بہت سبک دستی کے ساتھ خود تک منتقل کر لیں گے۔ جہاں تک اپنی زندگی کا معاملہ تھا وہ مطمئن تھے کہ جب سے نیلا پالا ہے ان کی گڑھی اور حویلی کے علاقے میں دہشت پھیل گئی ہے اور کوئی ان کی دولت اور اقتدار کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔

ٹھاکر اودل سنگھ شہر کی منڈی کی تبدیلیوں سے اپنی معیشت کو ہم آہنگ کرنے اور قصبے کی سیاست میں خود کو مستحکم کرنے اور دیہات کی اراضی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش میں مستقل لگے رہتے۔ ان کے بیٹے بھی ان کے مددگار تھے، حالاں کہ یہ اور بات ہے کہ ان کا مزاج اور عادتیں ٹھاکر کے مزاج اور عادتوں سے قدرے مختلف تھیں۔ خود دونوں بیٹوں کا مزاج ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا۔ بڑا پرتاپ اپنی بیوی کے ساتھ مگن، دیہات کے لوگوں سے زیادہ مصروف رہتا۔ اسے اندازہ تھا کہ ان کے خاندان کی ساکھ کی اصلی بنیاد دیہات کی اراضی ہے۔

چھوٹا اونکار دیہات، قصبے اور شہر تینوں میں دل چسپی لیتا تھا اور نتیجتاً کسی بھی ایک جگہ لگ کر کام نہیں کر پاتا تھا۔ باپ کا زیادہ منظورِ نظر وہی تھا۔ زندگی کے دوسرے مظاہر میں بھی اس کی دل چسپی زیادہ تھی۔ حالاں کہ پچھلے سال اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور بیوی بھی بڑی خوب صورت اور چلبلی ملی تھی، لیکن وہ قدرت کی دیگر نعمتوں کا منکر نہیں بننا چاہتا تھا۔

۹

ادھر کچھ دنوں سے گاؤں کے ایک حصے نے محسوس کیا کہ ان کو ان کا پورا حق بھی نہیں ملتا۔ نہر کا بہاؤ سب کی مشترکہ ملکیت تھا، لیکن اس کی زیادہ تر نالیاں ٹھاکر کے اپنے کھیتوں میں یا اس

Scanned with CamScanner

کی موافقت والوں کے کھیتوں میں کھلتی تھیں۔ پرانی پیڑھی بمبے کی ان نالیوں کو بمبے کی تعمیر کا ایک جز سمجھتی تھی لیکن جب سے لونڈے جوان ہوے تھے، کہنے لگے تھے کہ بمبے میں نئی نالیاں بھی بنائی جا سکتی ہیں اور یہ کہ کچھ پرانی نالیوں کو بند بھی کیا جا سکتا ہے، کہ ان کی وجہ سے کبھی کبھی پانی بہت برباد ہو جاتا ہے۔ وہ اکثر اس قسم کی شکایت لے کر ٹھاکر کے پاس آتے تو گڑھی کے دروازے پر کھڑا نیلا سینگ آگے کر کے انھیں روک دیتا۔ وہ الٹے قدموں واپس تو چلے جاتے لیکن دل ہی دل میں آگے کے منصوبے بناتے ہوے واپس جاتے۔

ضلع پریشد سے کوئی اسکیم اگر گاؤں کے لیے پاس ہوتی تو اس کا فائدہ بھی انھیں گھرانوں کو ملتا جو ٹھاکر کے زیادہ قریب تھے۔ ٹھاکر نے سیاست کے طور پر اپنے گھر سے دور گاؤں کی سرحد پر بنے دو ایک گھرانوں کو بھی مراعات کا حصے دار بنا رکھا تھا تاکہ گرام پنچایت میں کوئی یہ شکایت نہ کر سکے کہ ٹھاکر صرف ان گھرانوں کو فائدہ پہنچاتا ہے جن کی دیواریں اس کی گڑھی سے ملی ہوئی ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ سرحدی گھرانے بھی اس کی حمایت کا دم بھرتے رہتے اور گاؤں میں ایک طرح کا توازن قائم رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ توازن اکثر ٹھاکر کے ہی حق میں جاتا تھا۔ گاؤں کی حد تک ٹھاکر کی کوشش بھی یہی رہتی کہ توازن اس کے اور اس کی حمایت والوں کے ہی حق میں رہے۔ متاثرہ افراد کا سامنا ٹھاکر سے ہو ہی نہیں پاتا تھا کہ گڑھی کے دروازے پر نیلا انھیں روک دیتا تھا۔ غیر فطری غذا کھا کھا کر نیلے کی جبلت میں بھی کچھ حیرت انگیز تبدیلیاں ایسی آ گئی تھیں کہ وہ کبھی کبھی خود بخود گڑھی سے نکل کر ان متاثرہ افراد کے گوشے میں پہنچ کر ان کے گھروں میں گھس کر توڑ پھوڑ مچاتا، اور بچوں اور عورتوں کو کھوندتا ہوا، ایںڈھتا ہوا واپس آ جاتا۔ ٹھاکر کی شہہ، پجاری کی موافقت اور قانون کے ڈر کی وجہ سے کوئی اسے براہِ راست گزند نہیں پہنچا پاتا تھا۔

قصبے میں، جو ٹھاکر کی سیاست کا مرکز تھا، کم و بیش یہی حالت تھی۔ البتہ شہر کے حکام کبھی کبھی ٹھاکر کو تنبیہ کر دیتے تھے۔ شہر کے حکام بھی صرف اسی حد تک تنبیہ کرتے تھے جس حد تک وہ ضروری سمجھتے تھے تاکہ دوسرے قصبے والے زیادہ اُلار نہ ہو جائیں۔

زندگی بہت خاطر خواہ توازن کے ساتھ چل رہی تھی۔ گڑھی میں پرتاپ کی بیوی نے بچوں کی ہنڈکلیا پکوائی۔ محلے پڑوس کے لوگوں کو بھی بلایا۔ کمہار کی بیوہ پچھلے موسم میں اپنے پتی کے پاس جا چکی تھی۔ چھٹکی بیاہ کر اپنی بڑی بہن کے منگیتر کے گھر جا چکی تھی۔ بڑکی اب اپنے خاندان میں اکیلی

Scanned with CamScanner

تھی۔ برتن بنانے کا کام اکیلے اس کے بس کا نہیں رہ گیا تھا۔ میڈیکل رپورٹ کے بعد جب اپنا منگیتر ہی انکاری ہو گیا تو اس سے اور کون شادی کرتا۔ وہ راضی بہ رضا زندگی گزار رہی تھی۔ گدھے بیچ کر اس کا پیسہ بڑی بہو کے پاس جمع کرا کے وہ گڑھی میں ہی چھوٹا موٹا کام کر کے وقت گزار لیتی تھی اور کبھی جھونپڑے میں اور کبھی بہو کے پائنتی سو جاتی تھی۔ اس کا منگیتر، یعنی بہنوئی، مقدمے سے بَری ہو گیا تھا، کیوں کہ ٹھاکر صاحب نے پولیس کے کیس داخل کرنے سے پہلے ذاتی استغاثہ دائر کر دیا تھا اور پھر عدم پیروی میں اپنا کیس خارج کرا لیا تھا۔ ٹھاکر صاحب جانتے تھے کہ اس قسم کے فضول مقدموں کو جیت کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔

نئی بہو زیادہ چھواچھوت نہیں مانتی تھی۔ بڑکی کو خوب اچھی طرح نہا کر آنے کی ہدایت کی تھی اور جب وہ آئی تو اسے پوریاں بیلنے کو بٹھا دیا۔ بڑکی عزت افزائی پر خوش ہو کر جھوم جھوم کر پوریاں بیلنے لگی۔ اوتکار بھی سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پرتاپ کے بچے وہیں رسوئی میں جمے بیٹھے ہنڈکلیا پکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اوتکار کو محسوس ہوا کہ بڑکی اُس رات کے مقابلے میں اب کچھ تگڑی ہو گئی ہے۔ وہ اوتکار کے اس احساس سے بے خبر جھوم جھوم کر پوریاں بیلتی رہی۔ ظاہر ہے جب وہ جھوم جھوم کر پوریاں بیلے گی تو پورا بدن جھُولے گا۔ جب پورا بدن جھُولے گا تو وہ حصے بھی جھولیں گے جن کے بارے میں اوتکار زیادہ متفکر تھا۔ بھائی کے بیٹے کو پیار کرنے کے بہانے اوتکار نے جھک کر اس کی کُرتی پر نظر جمائی اور اگلی پوری بیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ بڑکی کو ہلکا سا احساس ہوا کہ اوتکار بابو بہت قریب آ گئے ہیں، مگر وہ چپ رہی۔ جیسے ہی وہ بیلتے بیلتے آگے جھکی، اوتکار نے بچے کو چومنے کے بہانے اپنا سر آگے کر دیا اور اس دفعہ کامیاب رہا کہ اس نے اپنی فکر کو دو بڑے بڑے میدے کے پیڑوں کی شکل میں مجسم دیکھ لیا تھا۔ لیکن اس بھی زیادہ اہم ایک اور بات ہوئی جس کا اوتکار کو وہم وگمان بھی نہیں تھا۔

جس کا بدن برتتے وقت اس نے آنکھ پر پٹی باندھ دی تھی اگر ناک پر بھی باندھی ہوتی تو بڑکی اوتکار کی سانس کی مہک محسوس کر کے آج چوکنا نہ ہوئی ہوتی۔ اس نے زندگی میں صرف ایک مرد کی سانس کی مہک سونگھی تھی، اس لیے اپنا مجرم پہچاننے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اب اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے آپ کو اور آگے جھکا دیا اور اوتکار کا چہرہ دیکھے بغیر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس وقت اوتکار کے دل کی کیا حالت ہو گی۔ اس طرح

اس نے اونکار کی سانسوں کی مہک کی دوبارہ تصدیق کی۔ اس نے اُس رات جھونپڑے کی اذیتوں کو یاد کیا تو اسے ابکائی سی آ گئی۔ وہ تیزی سے پوریاں بیلتی رہی۔ کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی تو اونکار بچے کو لیے لیے رسوئی کے دوسرے کونے میں جا کر بچوں جیسی باتیں کرنے لگا۔ آنے والی بڑی بھابھی تھی۔ وہ پوریاں بیلتی رہی اور بڑی بھابھی کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

رات کو اس نے بڑی بھابھی کے سر میں خوب طبیعت سے تیل لگایا، اس کی پیٹھ پر مالش کی، پھر اس کی ٹانگوں کو گود میں رکھ کر دیر تک اس کی پنڈلیاں دباتی رہی۔ جب بھابھی بدن دبواتے دبواتے تھک گئی تو بولی، "اب سو جا، بڑکی۔"

بڑکی آہستہ آہستہ رونے لگی۔

"کیا ہوا؟" بھابھی نے اچنبھے سے پوچھا۔

بڑکی نے اس کے دونوں پیر ہاتھوں میں تھامے اور ان پر اپنا سر رکھ کر بولی، "میرو یووَن اونکار بابو نے لُوٹوا ے۔"

وہ زمین پر اور بڑی بھابھی چارپائی پر لیٹی پچھلے موسموں کی وہ خوفناک رات یاد کرتی رہیں۔ اونکار کے دوست نے جہاں جہاں نیل ڈالے تھے وہاں ہاتھ پھیر کر بڑی بھابھی نے دانت پیستے ہوئے رات کاٹی۔

دوسرے دن بڑکی اپنی بہن سے ملنے اس کے گاؤں چلی گئی اور دو تین دن بعد واپس آ کر اپنے کام میں لگ گئی۔ وہ اندر سے آتے جاتے نیلے کو کچھ نہ کچھ کھلا دیتی۔ نیلا بھی اسے دیکھ کر اگر بیٹھا ہوتا تو اٹھ کر اس کے پاس آ کر اس کا ہاتھ چاٹنے لگتا تھا۔

ایک رات جب کہرا بہت شدید تھا اور گاؤں کے دھویں میں مل کر بہت گاڑھا اور ٹھوس ہو گیا تھا اور ہوائیں تیز تھیں اور جاڑا شدید تھا تو گڑھی کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے دو سائے بغیر آواز کے اندر کودے اور سیدھے اونکار کے کوٹھے میں پہنچے۔ اونکار کے پلنگ کے پاس پہنچ کر اس نے، جو زیادہ تگڑا تھا، اونکار کے منھ پر ہاتھ رکھ کر گردن دبائی اور گٹھری کی طرح باندھ لیا۔ دوسرے نے اونکار کی سوتی ہوئی بیوی کو، جو چونکی تک نہیں تھی، اس انداز سے قابو کیا کہ اس کا ایک ہاتھ تو تکیے کے ذریعے اس کا منھ دبائے ہوئے تھا اور دوسرا ہاتھ چاقو تھامے تھا جس کی چمک اونکار کی بیوی کو اندھیرے کے باوجود نظر آ رہی تھی۔ وہ گھگھیانے سی لگی مگر آواز تکیے کی دبازت میں گھٹ

Scanned with CamScanner

کر رہ گئی۔ پھر اس نے اطمینان سے اسے اچھی طرح باندھا اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ تگڑا آدمی بڑی گٹھری کو لے کر گڑھی کے دروازے سے نکل گیا۔ دوسرا آدمی چھوٹی گٹھری کو لے کر سامنے کمہار کے جھونپڑے میں گیا اور اونکار کی بیوی کو پیال پر ڈال کر، آنکھوں پر پٹی باندھ کر، اپنے چہرے کا مڑاسا کھول کر پورا سبق یاد کیا جو اس کی سابقہ منگیتر اور حالیہ سالی نے اس کے گھر آ کر اسے پورا ماجرا بتا کر یاد کرایا تھا...

بڑکی اس درمیان نیلے کو کھوئے کے پھیکے پھیکے پیڑے کھلاتی رہی اور سرسوں کا خالص تیل پلاتی رہی۔ اور پہچلوں سے اندازہ کرتی رہی کہ اب کیا ہو رہا ہو گا...

اگلی صبح بہت سی تازہ خبروں کے ساتھ طلوع ہوئی۔ پہلی خبر تو یہ تھی کہ اونکار گھر سے غائب تھا اور اس کے کپڑے نہر کے کنارے پائے گئے تھے۔

دوسری خبر یہ تھی کہ اونکار کی بیوی کو کوئی زبردستی اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ جان بچا کر بھاگ آئی۔ یہ خبر تو بالکل سچ تھی، کیوں کہ کسی نے اسے اٹھا کر لے جانے کی کوشش تو کی تھی ـــــ یہ اَور بات ہے کہ وہ کامیاب بھی ہوا تھا۔ خبر کا دوسرا حصہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنی جان بچا کر بھاگ آئی، کہ بہرحال اس کی جان تو بچ ہی گئی تھی...

تیسری خبر یہ تھی کہ جب ٹھاکر نے اپنے پہرے کے نوکروں پر جوتے پڑوائے تو اس دفعہ انھوں نے کوئی اعتراف نہیں بلکہ صرف یہ واقعہ بیان کیا کہ بڑکی کے ہاتھ سے رات کو کھانا اور گڑ لے کر، کھانا اور گڑ کھا کر، وہ لوگ لیٹ گئے تھے اور معمول سے زیادہ دیر تک جاگتے رہے تھے کہ گڑ میں بہت کڑواہٹ تھی جیسی کہ پرانے گڑ میں پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر بے خبر سو گئے تھے، جیسا کہ روز سوتے تھے، کیوں کہ اب نیلے کی موجودگی میں انھیں چوکیداری کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔

چوتھی خبر یہ تھی کہ چھٹکی کا پتی گڑھی کے پیچھے مُردہ پایا گیا۔ اس کے سینے پر چاقوؤں کے کئی گھاؤ تھے۔ بعد میں میڈیکل رپورٹ نے بتایا کہ موت چاقو کے زخموں اور زیادہ خون نکل جانے کی وجہ سے ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ معدے میں دھتورے کے بیج بھی پائے گئے۔

پانچویں خبر یہ تھی کہ بڑکی اپنے جھونپڑے میں مُردہ پائی گئی۔ بعد میں میڈیکل رپورٹ سے پتا چلا کہ اس کے معدے میں دھتورے کے بیج پائے گئے۔ اس کے بدن پر چوٹ کا کوئی نشان

Scanned with CamScanner

نہیں تھا۔

ایک معمولی خبر یہ بھی تھی کہ بھیکو کا لونڈا اچانک پاگل ہو گیا ہے اور بار بار ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقلیں کرتا ہے اور ہنستا ہے...

ایک ضمنی خبر یہ بھی تھی کہ بڑی بہو نے پرتاپ سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ یا تو وہ اسے میکے بھیج دے یا پھر اس کے ساتھ آ کر گڑھی میں رہے۔ اس ضمنی خبر میں ایک ضمنی ٹکڑا یہ بھی تھا کہ بڑی بہو کو اب نیلے سے بہت ڈر لگنے لگا ہے۔

علاقے کی پولیس نے اس متعدی قتل کیس میں بہت جی جان سے محنت کر کے تفتیش کی اور ایک ہفتے کے اندر اندر ایک ایک واقعے کی چُول سے چُول بٹھا دی۔

کمہار کی چھوٹی لڑکی، چھٹکی، کے خلاف چارج شیٹ داخل ہوئی جس کا لب لباب یہ تھا کہ چھٹکی بھیکو کے بیٹے کی آشنا تھی۔ ان دونوں کو نامناسب حالت میں دیکھ کر چھٹکی کے شوہر پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے انتقاماً گڑھی میں جا کر کسی بہانے سے بڑکی کو بلایا اور کسی نہ کسی طرح راضی کر کے پہرے داروں کو اور پھر بڑکی کو دھتورا کھلا کر، خود بھی دھتورا کھا کر، بُری نیت سے بڑکی کو اس کے جھونپڑے میں لے گیا۔ لیکن اس درمیان اونکار کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے باہر آ کر جھونپڑے کے پاس جا کر چھٹکی کے شوہر کو للکارا۔ چھٹکی کے شوہر نے اونکار پر قابو پا لیا اور راز کھلنے کے ڈر سے اس کی گٹھری بنا کر نہر میں ڈبو دیا۔ نہر کی پٹری پر بھیکو کے بیٹے نے یہ ڈوبنے والا منظر دیکھا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا اور دوسرے گاؤں جا کر چھٹکی کو بلا لایا۔ چھٹکی نے جب یہ سنا کہ اس کا شوہر بڑکی کی عزت لوٹنا چاہتا تھا تو وہ غصے میں گاؤں آئی اور اس نے اپنے دھتورے کے نشے میں مدہوش شوہر کو اونکار کی بیوی کو اٹھا کر لاتے اور پھر اسے جان بچا کر بھاگتے دیکھا تو یہ سوچ کر طیش میں آ گئی اور سوچا کہ تھوڑی دیر پہلے اس نے میری بہن کی عزت لُوٹنا چاہی اور اب ایک معصوم انسان کا قتل کر کے اس کی بیوی کی عزت لوٹنا چاہتا ہے، یہ سوچ کر تیسے میں آ کر اس نے دھتورے کے نشے میں مدہوش شوہر کو چاقو سے مار مار کر ختم کر دیا اور اور بھاگ کر اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ بھیکو کا بیٹا یہ دو قتل دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ شہادت کے طور پر چھٹکی کے گاؤں کے کچھ لوگوں کا نام دیا گیا تھا جو اس بات کے چشم دید گواہ تھے کہ پچھلے دو روز سے بھیکو کا بیٹا چھٹکی اور اس کے شوہر سے ملنے آ رہا تھا...

Scanned with CamScanner

چھٹکی نے زنانہ حوالات کی سلاخوں سے سر نکال کر سوچا کہ وہ تو کہیں آئی نہ گئی، اس نے اپنے پتی کا خون کیوں اور کیسے کر دیا؟ میں نے تو بھیکو کو بڑکی کے ساتھ تین دن پہلے اپنے گاؤں آتے دیکھا تھا تو پوچھنے پر بڑکی نے بتایا کہ بھیکو اپنی پتنی کو چھوڑ کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اسی لیے دونوں چھٹکی کے پتی کے پاس روز مشورہ کرنے آتے ہیں۔ میں چوکے میں بیٹھی ان تینوں کے لیے کچوریاں بناتی رہتی اور یہ تینوں باہری کوٹھے میں سر جوڑے بیٹھے بیاہ کی بات کرتے رہتے۔ جاتے وقت بڑکی میرے پتی کو بلا گئی تھی کہ وہ آ کر اس کے گاؤں میں بھیکو کے بھائیوں سے بیاہ کی بات کر لے... وہ اپنا دیہاتی دماغ لڑاتی رہی۔

بھیکو کے گھر جانے کے بجائے میرا پتی بڑکی کے جھونپڑے پر پہنچا ہو گا۔ وہاں اسے اکیلا دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی ہو گی ـــــ پہلے تو سگائی اسی سے ہوئی تھی نا۔ بڑکی بھی اب تک میرے پتی کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی تھی۔ میرا پتی بھی اکثر لڑائی میں اُلاہنا دیتا تھا کہ اس سے اچھا تو میرا بڑکی سے بیاہ ہوا ہوتا۔

بھیکو کے گھر بیاہ کی بات کرنے جب دونوں نہیں پہنچے ہوں گے تو بھیکو کا بیٹا ان کی تلاش میں جھونپڑے پر آیا ہو گا۔ جھونپڑے میں دونوں کو ایک ساتھ لیٹا دیکھ کر وہ اونکار بابو کو بلا لایا ہو گا۔ بڑکی کا گرم گرم بچھونا چھوڑنے کے غصّے میں میرے پتی نے اونکار کو مار کر نہر میں ڈبو دیا ہو گا۔ بھیکو کا بیٹا یہ دیکھ کر پورا پاگل ہو گیا ہو گا۔ واپسی میں میرا پتی پھر بڑکی کے جھونپڑے پر گیا ہو گا۔ اتنے میں گڑھی سے اونکار کی بیوی نے آ کر میرے پتی کو چاقو سے گود دیا ہو گا۔ بڑکی یہ سب دیکھ کر دھتورا کھا کر مر گئی۔ اگر وہ بڑکی کے ساتھ سونے کا ایسا ہی شوقین تھا تو اس کا جو انجام ہوا وہ اچھا ہی ہوا۔ یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا، کہ اچانک اسے اپنا اور بڑکی کا بچپن اور لڑکپن اور شروع جوانی کا ساتھ یاد آیا۔ پھر اپنے مرے ہوئے پتی کا گٹھا ہوا مضبوط شریر یاد آیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کا پتی شہر سے اس کے لیے ہمیشہ پیڑے لاتا تھا اور پیڑے کھا کر گرم گرم دودھ پی کر وہ دونوں چھت پر سونے چلے جاتے تھے۔ اچانک اسے اپنے شوہر کے قاتل اونکار کی بیوی سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ سلاخوں کے باہر آہٹ ہوئی۔ پولیس کی زنانی نے آ کر اس سے پانی کے لیے پوچھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے بہتا گدلا گدلا پانی پونچھا اور ہاتھ کے اشارے سے پانی کو منع کیا۔

Scanned with CamScanner

۱۰

باہر سسُر جی نے پہرے کے نوکروں کو ابھی ابھی پٹوایا ہے۔ جٹھانی صبح سے روتے روتے ابھی چپ ہو کر جیٹھ جی کے ساتھ اپنے کمرے میں گئی ہیں۔ نیلا سسر جی کے پاس کھڑا دم کو چکر دے رہا ہے۔

وہ کون تھا جو مجھے باندھ کر جھونپڑے میں لے گیا تھا؟ اور پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر کس بری طرح میرے بدن کی درگت بنائی تھی۔ پھر رک رک کر سوچ سوچ کر کیسے اس نے میرے شریر کی بے عزتی کی تھی۔ پھر کیسے میرے جسم کو بنا ڈھکے وہ جھونپڑے سے نکل کر بھاگا تھا۔ میں کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد رسی کھول کر آنکھوں کی پٹی ہٹا کر خود کو گڑھی کے اندر لے گئی تھی، جہاں دروازے پر نیلا چپ چاپ کھڑا مجھے اپنے کمرے میں جاتے دیکھتا رہا تھا۔ کسی کو خبر نہیں ہو پائی کہ اس رات میری عزت لٹی تھی۔

وہ کون تھا؟ چھٹکی کا پتی یا بھیکو کا لڑکا؟ وہ بھیکو کا لڑکا ہی ہو گا، کیوں کہ اس کی پتنی کو نیلے نے زخمی کیا تھا اور سسر جی نے آخر تک غلطی نہیں مانی تھی۔ اس نے اس طرح اپنا انتقام لیا۔ پھر آخر اوتار کو چھٹکی کے پتی نے کیوں نہر میں ڈبویا؟ اس نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ پھر بڑکی دھتورا کھا کر کیوں مر گئی؟ وہ تو جٹھانی کے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ وہاں سے کب نکل کر آ گئی تھی؟ جٹھانی کو خبر بھی نہیں ہو سکی۔ کیا بڑکی نے جٹھانی کو بھی سونے سے پہلے تھوڑا سا دھتورا کھلا دیا تھا؟ یہ چھٹکی کا میاں اور بڑکی اس واقعے میں کہاں سے آ گئے؟ اور یہ دونوں مر کیوں گئے؟ ان دونوں کو کس نے مارا؟

اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یقیناً ایسا ہوا ہو گا کہ چھٹکی نے رات کو آ کر گڑھی کے پیچھے اپنے پتی اور بڑکی کو بُری حالت میں دیکھا ہو گا۔ دھتورے کے نشے میں چُور اپنے پتی کو چاقو سے مارنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہو گی۔ البتہ بڑکی کو بڑی بہن سمجھ کر معاف کر دیا ہو گا۔ مگر بڑکی شرمندگی سے بچنے کے لیے دھتورا کھا کر جھونپڑے میں آ کر سو گئی ہو گی۔ مگر اوتار کو چھٹکی کے پتی نے نہر میں کیوں ڈبویا؟

باہر کچھ شور سنائی دیا۔ اس نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ گڑھی کے دروازے کے باہر بھیکو کا

Scanned with CamScanner

بیٹا زمین پر پڑا ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقل کر کے گھٹی گھٹی آواز میں چلا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی زور سے بند کی اور پلنگ پر اوندھی لیٹ کر سسکنے لگی۔

۱۱

بڑی بہو نے لیٹے لیٹے کروٹ بدلی۔ اب رات ہو گئی تھی۔ پرتاپ چت لیٹا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ اس نے ظاہر کیا جیسے وہ سو رہی ہے۔ ویسے بھی پچھلے کئی دنوں سے سونے اور جاگنے میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا۔ کھڑکی کے باہر آنگن میں سسر جی ابھی تک ٹہل رہے تھے۔ بڑی بہو کی سمجھ میں جہاں کچھ اور باتیں نہیں آئی تھیں وہیں یہ بات بھی دھند لکے میں تھی کہ کیا واقعی چھوٹی بہو بیچ راستے سے عزت بچا کر بھاگ آئی تھی۔ کیا اس کے شریر پر نیل نہیں پڑے؟ کیا اس کا پنڈا کورا ہی ہے؟ اس احساس سے ہی اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ جب جب وہ یہ سوچتی اسے سانس سینے میں گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی لاج بچانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہو۔ یقیناً یہی بات ہے، ورنہ ایسے ٹانگیں پھینک پھینک کر کیوں چل رہی تھی۔ اس نے پھر کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی کے بالکل نزدیک ایک سایہ کھڑا تھا۔ وہ چیخنے ہی والی تھیں کہ اسے نیلے کی سانسیں سنائی دیں۔ نیلا کھڑکی کے پاس تھوتھنی کیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا...

"اٹھیے... اٹھیے..." وہ تیز سرگوشیوں میں پرتاپ سے مخاطب ہوئی۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" پرتاپ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں... مجھے نیلے سے ڈر لگتا ہے... کھڑکی کے پاس کھڑا ہے..." وہ بیٹھی تھر تھر کانپتی رہی۔

Scanned with CamScanner

۱۲

ٹھاکر اودل سنگھ نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر اپنی سانسیں درست کیں۔ آنگن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ کر انھوں نے یاد کیا کہ اونکار بچپن ہی سے کتنا ضدی تھا۔ میلے میں جاتا تو ہر اچھی چیز کے لیے پسر جاتا۔ مٹی کی ڈھیر ساری گڑیاں، شیر، بھالو، غبارے، رنگین کاغذ کی پتنگیں، اور جانے کیا کیا الابلا گود میں اٹھائے لے آتا اور پھر تھوڑی دیر میں ہر چیز توڑپھوڑ کر برابر کر دیتا۔ چیز حاصل ہونے کے بعد اس کے لیے بے قیمت اور بے وقعت ہو جاتی تھی۔ آج وہ سینکڑوں من پانی کے نیچے دبا ہوا ہو گا۔ مچھلیوں نے بدن پر گوشت کا ریشہ بھی نہ چھوڑا ہو گا۔ کرنی کا پھل تو ملتا ہی ہے مگر اسی جنم میں اسے کیوں مل گیا، اس کا انھیں افسوس تھا۔ انھوں نے آسمان کی طرف دُکھی نظروں سے دیکھا، کیوں کہ اس جنم میں تو وہ اس کے باپ تھے۔ انھوں نے سر اٹھا کر پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک طرف سے مہاوٹ کی بدلیاں بڑھی چلی آ رہی تھیں اور تارے ان بدلیوں میں آہستہ آہستہ کھوتے جا رہے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے سردی کچھ کم لگ رہی تھی۔ پہرے کے نوکر گڑھی کے دروازے پر ان کی طرف پیٹھ کیے بیڑی پی رہے تھے۔ نیلا بڑے بیٹے کے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑکی میں جھانک رہا تھا۔ چھوٹی بہو اپنے مائیکے والوں کے ساتھ اپنے کمرے میں لیٹ چکی تھی اور اس کے کمرے کی روشنی دھیمی ہو چکی تھی۔

اونکار ان کے سامنے کھڑا تھا... اونکار ان سے پیسے مانگ رہا تھا... وہ اونکار کو پیسے دے رہے تھے... اونکار نے ان سے شہر جا کر سینما دیکھنے کی آگیا چاہی، انھوں نے اجازت دے دی... اونکار چلا گیا... اونکار پھر آ گیا... اتنی مدت میں کچھ بڑا ہو گیا تھا... انھوں نے اونکار سے کہا کہ چیئرمینی کا الیکشن جیتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ کچھ تگڑے پٹھے بھی ساتھ میں ہونا چاہیے، کبھی کبھی ووٹوں والا بکسا بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اونکار موٹر سائیکل پر گیا اور ٹریکٹر کی ٹرالی میں تگڑے تگڑے پٹھوں کو بٹھا کر لے آیا۔ یہ نریش ہے، یہ سلطان ہے، یہ رمیش ہے (اور اس کے چہرے پر گھاؤ کے دو نشان تھے)، یہ بلا ہے، یہ بہاری ہے... پھر وہ الیکشن جیت گئے تھے...

Scanned with CamScanner

"اونکار... بیٹا! اسکول کے پاس والے پلاٹ پر اگر کل امبیڈکر جینتی کا سماروہ ہو گیا تو یہ پلاٹ ہمیشہ کے لیے ہمارے ہاتھ سے چلا جائے گا... ہم کسی کو وہاں سماروہ منانے سے روک بھی نہیں سکتے... بس آج کی رات ہمارے پاس ہے..." یہ بات انھوں نے قصبے کی حویلی میں بیٹھ کر کہی تھی۔

اونکار نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ موٹرسائیکل پر بیٹھ کر دیہات جا کر ٹریکٹر لایا... اپنے ساتھ چار پٹھے لیے... راج مستریوں کے محلے میں جا کر بندو معمار کے چاروں نوجوان لونڈوں کو بٹھایا... ٹریکٹر پر گاؤں سے بیس کسان پکڑ کر بٹھا لایا تھا... بھٹے کے مالک لالہ ویریندر کو جگا کر ان کے بھٹے پر لے گیا... ٹریکٹر کی ٹرالی میں بھٹے کی اینٹوں کے چار چکر لگوائے... اتنی دیر میں نیویں کھودی جا چکی تھیں... مٹی کا گارا بن چکا تھا... پو پھٹتے پھٹتے دیواریں اتنی اونچی اٹھ گئیں کہ گاؤں کے کسان ایک دوسرے کو گھوڑا بنا کر ان پر چڑھ کر دیوار پر بیٹھے معماروں کو گاروں کے پرات اور اینٹیں پکڑا رہے تھے... حویلی سے رات ہی رات کچھ پرانے کواڑ قبضوں سمیت نکلوا کر نئے پلاٹ کی بے چھت کی عمارت میں نصب کرائے... جب اڈے کی مسجد کا بڈھا ملا اذان دے رہا تھا تو اس وقت نئی عمارت کے اندر فرش چورس کر کے اینٹیں بچھائی جا چکی تھیں۔ جب صبح ہوئی تو امبیڈکر جینتی والوں نے منھ پھاڑ پھاڑ کر سر پر ہاتھ رکھ کر اس عمارت کو دیکھا تھا... اونکار نے بھور بھئے مجھے جگا کر کسانوں کی شراب اور معماروں کے جوڑے کے پیسے لیے تھے...

"تو نے بڑکی کو کیوں بگاڑا مور کہ؟ اپنا ہی گاؤں محلہ ملا تھا تجھے؟" یہ کہہ کر نمبردار نے ایک کرارا طمانچہ اونکار کے منھ پر مارا اور دیکھا کہ ان کی موٹی موٹی انگلیاں اس کے سرخ گالوں پر واضح طور سے ابھر آئی ہیں... وہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا...

"دور ہو جا میرے سامنے سے..." وہ چلا گیا تھا۔ انھوں نے سنا تھا وہ دروازے سے نکلتے وقت کھسیایا ہوا تھا، مگر اس کے منھ سے دھیمی دھیمی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔ اس کے اس طرح شرمندہ ہونے اور بڑے جرم کی چھوٹی سزا ملنے کی خوشی اور ہنسی پر انھیں روٹھا روٹھا پیار آیا تھا...

انھوں نے آسمان کی طرف پھر دیکھا اور واپس آتے ہوئے سوچا کہ اونکار اب کہاں ہے۔ وہ تو ان بادلوں کے پرے جا چکا ہے، یا ہو سکتا ہے ابھی تک اس کی آتما نہر کے کنارے جھاڑیوں میں بھٹک رہی ہو۔ انھیں اپنے سینے میں ایک بھاری دھسک محسوس ہوئی۔ انھوں نے اس

Scanned with CamScanner

بے چینی کے عالم میں آنکھیں بند کر کے سوچا کہ یہ سیاست، دولت، اقتدار، پرتاپ کے بس کی بات نہیں۔ وہ تو میری زندگی میں ہی ان چیزوں کی حفاظت مشکل سے کر پائے گا۔ اس سوچ نے ان کی بے چینی کو اور گہرا کر دیا۔

برابر میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے اونکار کھڑا تھا ــــ وہ سیاہ رنگ کا تھا، اس کی لمبی سی تھوتھنی تھی اور موٹے موٹے آدھے چندرما کے آکار کے سینگ تھے۔ وہ اٹھے اور نیلے کی گردن سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے...

ان کے رونے کی آوازیں سن کر پہرے کے نوکر بھاگے ہوئے ان کے پاس آئے جنھیں گالیاں دے کر پھر ان کی جگہ بھیج دیا گیا۔ ٹھاکر اودل سنگھ کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ اونکار کا قتل کس نے کیا۔ اس کا قتل چھٹکی کے پتی نے کیا تو چھٹکی کے پتی کو کس نے مارا؟ پھر بڑکی کو دھتورا کھلا کر کس نے ختم کیا؟ بڑکی کو تو معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کی عزت کس نے لوٹی تھی۔ بھیکو کے لونڈے کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟ انھوں نے تھانا انچارج سے بھی گھنٹوں ان معاملات پر گفتگو کی تھی۔ تھانا انچارج یہی کہتا تھا کہ اونکار کا قتل انھیں مقتولین میں سے کسی نے کیا ہوگا، لیکن اب ملزم کی پکڑ نہ ہونے کی وجہ سے چھٹکی کو ہی چارج شیٹ کرنا مناسب ہے، کیوں کہ کیس چاروں طرف سے چوکس بیٹھ رہا ہے۔ وہ دیر تک تانے بانے سلجھاتے رہے مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا... نیلا زمین پر بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا تھا...

۱۳

جب دھرتی پر ہل چلتا ہے تو اس کے سینے پر ایک گہری مانگ پڑ جاتی ہے لیکن ہل کے دوسرے ہی پھیرے میں اس مانگ میں مٹی بھر جاتی ہے۔ زندگی کے زخموں کو وقت بھی اسی طرح بھرتا رہتا ہے۔ شب و روز کا ہل چلتا رہتا ہے اور دکھوں کی گہری لکیریں معاملات کی مٹی سے بھرتی رہتی ہیں۔ یہ انتظام نہ ہو تو زندگی کے کھیت میں فصلیں اگنا ہی بند ہو جائیں... چیئرمینی کے اگلے الیکشن کی تیاری میں ٹھاکر اودل سنگھ کا دکھ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ عدالت نے عینی شاہد نہ

Scanned with CamScanner

ہونے کی وجہ سے چھٹکی کو رہا کر دیا تھا۔ اب وہ چھوٹ کر اپنے پرانے جھونپڑے میں لیپ پوت کر رہنے لگی تھی۔ بھیکو کا بیٹا تین سال پاگل خانے میں رہ کر آ گیا تھا۔ اس نے کھیتی کا کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کھیتوں کے پار میدانوں میں نہر کے پاس چھدری چھدری بیلوں کے سائے میں نسے کی سبز اور کانٹے دار جھاڑیوں میں بیٹھا ایک ٹک آسمان کو دیکھتا رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کی بہت خدمت کی مگر اب وہ مایوس ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی بھیکو کے بیٹے سے کوئی سوال کرتی، بھیکو کے بیٹے پر دورہ پڑ جاتا اور وہ ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقلیں کرتے کرتے بے حال ہو جاتا۔ بیوی وقت بے وقت کھیتوں کی طرف نکل جاتی اور اندھیرا ہونے کے بعد واپس آتی، تب بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

ٹھاکر اودل سنگھ ایک بار پھر الیکشن جیت گئے۔ جیت والی رات حویلی میں جشن منایا گیا۔ نمبردار اودل سنگھ نے مٹھی بھر بادام نیلے کے منھ میں ڈالے جنھیں وہ مزے لے لے کر چباتا رہا۔ اچانک انھیں اونکار یاد آیا۔ انھوں نے ایک مٹھی بادام اس کے منھ میں اور ڈالے۔ دو مٹھی باداموں کا اثر تیسرے دن ظاہر ہوا، رات کو وہ حویلی کے پھاٹک سے نکلا۔ سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں اس نے کچھ سال پہلے گائے ہری ہونے کا سہانا منظر دیکھا تھا۔ طویلے میں خاک اڑ رہی تھی۔ وہ کھڑا اپنے پاؤں پٹختا رہا۔ برابر میں کانجی ہاؤس تھا۔ کانجی ہاؤس کے بوسیدہ ٹین کے دروازے کی جھری سے اس نے دیکھا کہ اندر کچھ مریل اور دو چار گائیں، بیل اور بچھڑے ہیں۔ سینگوں کی ایک ہی ٹکر سے اس نے ٹین کا دروازہ توڑ دیا۔ سارے مویشی کانجی ہاؤس سے نکل کر جہاں سینگ سمایا بھاگ لیے۔ تھوڑی دور پر بھینسوں کا طویلہ تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے بھینسوں کو اپنے سینگوں سے ریلنا شروع کر دیا، بھینس رسیاں تڑا تڑا کر بھاگیں اور قصبے کی سرحد کے پاس کھیتوں میں گھس گئیں۔ نیلا ادھر سے فارغ ہوا تو پینٹھ جانے والے راستے پر جو گھر ملے ان کے اندر گھس کر سوتے ہوئے آدمیوں کو چارپائیوں پر ہی کھوند ڈالا۔ پکار مچی تو محلے کے لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ کچھ زخمیوں کی مرہم پٹی کرانے اسپتال لے گئے۔ باقی لاٹھیاں لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑے جس نے یہ سب کیا تھا... نیلے نے آدمیوں کی پکار سنی تو اندھیرے میں ہی اس نے راستا کاٹا اور بیریوں میں ہوتا ہوا کھیتوں میں اترا اور کھیتوں کھیتوں ہوتا ہوا کہیں گم ہو گیا...

ٹھاکر صاحب کی حویلی پر بہت ہجوم تھا۔ ٹھاکر صاحب نے محسوس کیا کہ اس ہجوم میں

Scanned with CamScanner

سارے لوگ ان کے مخالف نہیں ہیں۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ قصبے کے اکثر لوگ ٹھاکر صاحب کو پسند کرتے تھے، کہ ٹھاکر صاحب جا بے جا معاملے میں اکثر ان کا ساتھ بھی دیتے تھے۔ لیکن نیلے کے سالہاسال کے ہنگاموں اور بربادیوں سے تنگ آکر وہ ہم نوا لوگ بھی ٹھاکر صاحب سے تو نہیں لیکن نیلے سے ضرور نفرت کرنے لگے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے مجمعے کو یقین دلایا کہ وہ آج ہی اس کا انتظام کریں گے اور اس سلسلے میں میونسپل بورڈ کے آفس میں ایک ہنگامی میٹنگ طلب کی گئی۔

آفس کھچا کھچ بھرا تھا۔ سارے ممبران حاضر تھے۔ محمود صاحب پرانی چوٹیں بھولے نہیں تھے۔ آج پھر ایک موقع تھا۔ اس دفعہ انھوں نے اچھی تیاری کی تھی۔ رات ہی رات خفیہ طور پر وہ ضلع کلکٹر سے بھی بات کر آئے تھے۔

میٹنگ بہت شور شرابے میں شروع ہوئی تھی۔ مخالف ممبران اُدھم مچانے میں پیش پیش تھے۔

محمود صاحب نے سارے ممبران کے چہروں کا جائزہ لیا اور اندازہ کیا کہ ٹھاکر صاحب کے مواقف ممبران بھی آج کم سے کم نیلے کے معاملے میں تقریباً ہم نوا ہیں... اس احساس نے ان کے اندر ایک نئی طاقت بھر دی۔

"بھائیو! میں پہلے بھی ٹھاکر صاحب کو کئی بار اس وحشی جانور کے سلسلے میں آگاہ کر چکا ہوں بلکہ میں نے تو اسی وقت منع کیا تھا جب انھوں نے اسے پالنا شروع کیا تھا۔ مگر یہ میری بات نہیں مانے۔ انھوں نے اسے بادام کھلا کھلا کر پاگل سانڈ بنا دیا ہے۔ شہری انسانوں کا اس طرح کے جانور پالنے کا شوق غیر فطری ہے۔ اس نیلے نے فصلیں برباد کی ہیں، غریبوں کے گھروں کے برتن اور چولھے توڑے ہیں، ننھے ننھے بچوں کو کچلا ہے، بوڑھے آدمی کا خون کیا ہے، طویلے کی بھینسوں کو مار مار کر بھگایا ہے، کانجی ہاؤس کے مویشیوں کو آزاد کیا ہے۔ ماؤں بہنوں کی... ماؤں بہنوں کی..." (انھوں نے الیکشن کی تقریر پر دل ہی دل میں لعنت بھیجی اور ایک مناسب جملہ ڈھونڈا۔) "ماؤں بہنوں کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ کون ہے جو آج اس قصبے میں چین کی نیند سو سکتا ہے؟ بولیے، کون ہے؟"

"کوئی نہیں... کوئی نہیں..." ممبران نے جوش و خروش کے ساتھ جواب دیا۔ "نہیں، ایک شخص ہے جو آرام سے سوتا ہے اور چین سے آرام کرتا ہے..." یہ کہہ کر انھوں نے اس جملے

Scanned with CamScanner

کا تاثر جاننے کے لیے سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ سب کی آنکھیں سوال تھیں۔

"وہ شخص ہے ٹھاکر اودل سنگھ... جو ہمارے چیئرمین ہیں۔"

"ٹھاکر اودل سنگھ، مردہ باد!" ممبران چلّائے۔

"انھیں اس بات کی پروا نہیں کہ اس نیلے نے کتنے نقصانات کیے ـــــ مالی اور جسمانی اور جانی..." محمود صاحب خاطر خواہ اثر دیکھ کر آگے بڑھے۔

ٹھاکر اودل سنگھ دل ہی دل میں تاؤ کھاتے رہے۔ آخر میں انھوں نے کڑے دل سے ایک فیصلہ کیا اور پوچھا:

"میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

محمود صاحب نے جواب دیا، "ہم چاہتے ہیں کہ قصبے کو اس آفت سے نجات دلائی جائے۔"

"مگر کیسے؟" ٹھاکر صاحب انھیں اپنی راہ پر لانا چاہتے تھے۔

"جان سے ختم کر کے، اَور کیسے؟" محمود صاحب گرجے۔

ٹھاکر صاحب یہی سننا چاہتے تھے۔

"ٹھیک ہے،" ٹھاکر صاحب نے نرمی لیکن مضبوطی سے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ یہ گئوہتیا ہو گی۔"

محمود صاحب نے اندازہ کیا کہ کچھ ممبران یہ بات سن کر ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔

"دوسری بات یہ کہ قانون مجریہ ۱۹۷۲ کے تحت اسے مارا نہیں جا سکتا۔ اس کی سخت سزا ہے،" ٹھاکر صاحبؔ نے تھانا انچارج کی گفتگو یاد کر کے یہ جملہ بولا۔

جب انھوں نے اندازہ کر لیا کہ اب ممبران راہ راست پر آ گئے ہیں تو انھوں نے کہا، "کیا آپ لوگ قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی رات کو جو کچھ ہوا وہ سب نیلے نے ہی کیا ہے اور کانجی باؤس کے بیلوں، طویلے کی بھینسوں نے کچھ نہیں کیا؟ نیلا بدنام ہو گیا تو کیا سارے الزامات اسی کے سر جائیں گے؟ بد بھلا بدنام برا..." انھوں نے محاورے کا سہارا لیا۔

"لیکن وہ بیل اور بھینس بھی تو نیلے کی وجہ سے ہی مشتعل ہوئے..." محمود صاحب نے دور کی کوڑی لی۔

"تو کیا مشتعل کرنے والا ہی سارا مجرم ہے؟ اشتعال میں آنے والا بالکل معصوم ہے؟" ٹھاکر

صاحب گرجے۔ پھر انھوں نے ایک وکیل ممبر سے کہا:

"وکیل صاحب آپ بتایئے، مشتعل ہونے والے اور مشتعل کرنے والے کی سزائیں کیا مختلف ہیں؟"

ممبر وکیل صاحب کیوں کہ ٹھاکر صاحب کی پارٹی کے آدمی تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وکیل بھی تھے اور پیشے کی لاج رکھنا بھی ضروری تھی، اس لیے ان کا جواب بہت مدلل اور ٹھوس تھا۔

"دراصل اشتعال میں آنا ایک ایسا فعل ہے جس کی جڑیں انسانی لاشعور میں دور تک پیوست ہوتی ہیں۔ اگر لاشعور کا وہ حصہ ذرہ برابر بھی مجرمانہ مادّہ رکھتا ہے تو اشتعال میں آنے کے لیے ایک ہلکی سی تحریک بھی کافی ہوتی ہے۔ لیکن مشتعل کرنے والے کو بھی بے قصور نہیں کہہ سکتے، اور سچ پوچھیے تو قصوروار بھی اس اس وقت تک نہیں کہہ سکتے جب تک کہ اس امر کی تحقیق نہ ہو جائے کہ مشتعل کرنے والے نے مشتعل ہونے والے کے ساتھ وہ کون سا فعل کیا جس کی وجہ سے مشتعل ہونے والا مشتعل ہوا۔ معاملۂ ہذا میں نیلے نے صرف اتنا کیا کہ کانجی ہاؤس کے دروازے سے اپنی پیٹھ رگڑی کیوں کہ جانوروں کو پیٹھ رگڑنے کی عادت ہوتی ہے۔ تو اس دھمک سے پرانا دروازہ ٹوٹ گیا اور دوسرے جانور جو موقعے کا انتظار کرتے رہتے ہیں، آزاد ہو گئے، اور پھر انھوں نے من مانی کی۔ کیوں کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ نیلے نے ان کو ترغیب دے کر فصلیں برباد کرائیں۔ لہذا یہ امر تحقیق و تفتیش طلب ہے کہ نیلے کا پچھلی رات کی بربادی میں ذاتی طور سے کتنا حصہ ہے اور حصہ ہے بھی یا نہیں۔"

اس مدلل تقریر کو ابھی ممبران سن کر ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ ٹھاکر صاحب نے ایک حسبِ منشا فیصلہ سنا دیا۔

"بھائیو! نیلے کو تلاش کرنے کی مہم ابھی سے شروع کی جاتی ہے۔ میں تھانے میں بھی بات کروں گا۔ کچھ رضاکارانہ ٹکڑیاں بھی بننا ضروری ہیں کہ ہر کام میونسپل بورڈ نہیں کر سکتا۔ نیلے کو گرفت میں لے کر اس بات کا اندازہ کیا جائے گا کہ آگے کیا کارروائی ہو۔ آج کی میٹنگ برخاست۔"

محمود صاحب نے آج کی میٹنگ کے فیصلے کو اپنی کامیابی سمجھا۔ انھوں نے اپنے ممبروں اور موافقین کے ذریعے قصبے بھر میں یہ شہرت کرادی کہ نیلا پاگل ہو گیا ہے اور اسے انسانی خون کی

Scanned with CamScanner

چاٹ لگ گئی ہے۔

جس نے بھی سنا دہشت زدہ رہ گیا۔ دہشت کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نیلا چھپا ہوا تھا اور چھپی ہوئی چیز عیاں چیز کے مقابلے میں زیادہ خطرناک محسوس ہوتی ہے۔ لوگوں نے دیواروں پر نیلے کو پکڑلانے پر انعام دینے کے اشتہار لگا دیے۔ نیلے کو پکڑنے کی تیاریاں زوروشور سے ہونے لگیں۔

ضلع کلکٹر نے، جو صبح ہی اپنا نمائندہ بھیج کر ٹھاکر صاحب کو تنبیہ کر چکا تھا، شام کو ٹھاکر صاحب کو ضلع آفس میں بلایا۔ ٹھاکر صاحب بادل ناخواستہ پہنچے، حالاں کہ اندر ہی اندر خوش بھی تھے کہ آج کلکٹر سے بات کرنے کا موقع ملے گا۔ شہر میں کلکٹر کے آفس میں داخل ہوئے تو وہ بڑی سی میز کے پیچھے سنجیدگی کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے ٹھاکر صاحب سے پوچھا:

"اودل سنگھ جی! نیلے نے بہت تباہیاں مچا رکھی ہیں۔ روزانہ کوئی نہ کوئی شکایت آ جاتی ہے۔ اب اس کا انتظام کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟ میرے اوپر رائے عامہ کا بہت زبردست دباؤ ہے۔ دوسرے قصبے والے بھی شکایت کر رہے ہیں کہ ٹھاکر کے نیلے کی وجہ سے گاؤں اور قصبے میں بہت بربادی ہو رہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ کبھی کبھی دوسرے قصبوں اور خود شہر میں بھی آ جاتا ہے..."

ٹھاکر اودل سنگھ خاموش رہے۔

"سنا ہے آپ کہتے ہیں کہ اس کو اگر مار دیا جائے تو لوگ گئوہتیا سمجھ کر جذباتی ہو جائیں گے؟ مجھے آپ سے ایسی بچکانہ باتوں کی امید نہیں تھی۔ ہم سب کو پڑھے لکھوں جیسی بات کرنا چاہیے..."

ٹھاکر صاحب بولے، "پڑھے لکھوں کے سامنے پڑھے لکھوں جیسی باتیں ہوتی ہیں۔ دیہات اور قصبے میں لوگ ان پڑھ ہیں۔ انھیں آپ سے زیادہ میں جانتا ہوں۔"

"پھر بھی،" کلکٹر بولا، "پھر بھی میں اسے صحیح نہیں مانتا کہ بربادی پھیلانے والے ایک وحشی جانور کو، جسے آپ نے پال رکھا ہے، صرف اس وجہ سے نہیں مروایا جا سکتا کہ اَن پڑھ اسے گئوہتیا سمجھیں گے یا دھرم کا اپمان سمجھیں گے۔"

ٹھاکر صاحب نے ایک اَور پینترا چلا۔

"اصل میں بات یہ ہے صاحب کہ آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ نیلے کو مارنا قانون مجریہ

۱۹۷۲ کے تحت جرم ہے۔"

"مگر اس کا علاج ہے،" کلکٹر بولے۔ "میں فارسٹ آفیسر سے بات کر کے چیف وائلڈ لائف آفیسر سے اسے پاگل ڈکلیر کرا کے مروا سکتا ہوں۔"

"مگر یہ تو زیادتی ہو گی۔ نیلا پاگل تو نہیں ہے۔"

"لیکن حرکتیں تو پاگلوں والی ہی کر رہا ہے۔"

"میں اس کا علاج کر رہا ہوں صاحب! آج ہی سے نیلے کو پکڑوانے کی تیاریاں کر لی ہیں۔ آپ مجھے ایک موقع دیجیے۔"

کلکٹر نے بادل ناخواستہ انھیں موقع دے دیا۔

سورج غروب ہونے کے بعد جب وہ قصبے میں داخل ہوے تو قصبے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کر کے رکھے تھے اور گلیوں میں پولیس والے ٹہل رہے تھے۔ رضاکار ٹکڑیاں کھیتوں اور جنگلوں میں نیلے کی تلاش میں نکل گئی تھیں۔

ٹکڑی نمبر ۱ نے بھادوں کی سیاہ رات میں قصبے کے باہر والے بیر کے باغ اور کھیتوں کی پگڈنڈی پر کسی کو کھڑا دیکھا۔ اشارے سے بتایا۔ سب لوگ خاموش ہو گئے۔ لاٹھیاں مضبوطی سے پکڑے پکڑے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے اور بیس گز دور سے اس پر ٹارچ پھینکی۔ تین سیل کی ٹارچ کی روشنی میں دیکھا گیا کہ نیلا دھند لکے میں کھڑا ہے۔ ٹارچ فوراً بند کر لی گئی۔ اس ٹکڑی میں پانچ لوگ تھے۔ قریشیوں کا لونڈا یعقوب، جو ایک ہی سانس میں کبڈی ٹیم کے کسی تگڑے پٹھے کو چھو کر سامنے والی لکیر پر ہاتھ مار کر آ جاتا تھا، آج ہاتھ میں موٹی سی لاٹھی سنبھالے ہوے تھا۔ اس کا پڑوسی منشی فضائی کا بڑا بیٹا ہاتھ میں اسٹک لیے ہوے تھا۔ وہ قصبے کے انٹر کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان تھا۔ اسی محلے کے شیخ جلی سمیع انوار کے ہاتھ میں تین سیل کی جیپ ٹارچ تھی۔ وہ خود کو ٹکڑی نمبر ۱ کا لیڈر تصور کیے ہوے تھا۔ ان کے پیچھے شکروالوں کا لونڈا گلشن والی بال تھا جو والی بال کھیلتے ہوے اتنا اونچا اُچھل کر والی مارتا تھا کہ کبھی کبھی جال کے دوسری طرف مخالف ٹیم کے پالے میں جا گرتا تھا۔ پانچویں تھے بوڑھے نتھو چچا جو اپنی جوانی میں خرگوش اور تیتر میدان میں دوڑا کر، تھکا کر زمین پر بٹھا لیتے تھے اور ان کے چاروں طرف چکر لگا کر لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتے ہوتے

اچانک ڈھیلے یا ڈنڈے سے خرگوش یا تیتر کو زخمی کر کے پکڑ لیتے تھے۔ یہ ٹیم ہر لحاظ سے نیلے کو قابو میں کرنے کے لیے آئیڈیل تھی۔

نتھو چچا نے اشارے سے سب کو کچھ دیر خاموش رہنے کو کہا تاکہ نیلا ان کی طرف سے بے گمان ہو جائے اور پھر آہستہ آہستہ گھیرا ڈال کر اسے لاٹھی اور اسٹک کی مدد سے قابو میں کر لیں۔ بوڑھے نتھو چچا کے ان خاموش مشوروں سے سمیع انوار کو اپنی تین سیل کی ٹارچ اور لیڈری کی بے عزتی محسوس ہوئی۔ اس نے نتھو چچا کو پیچھے دھکیل کر باقی لوگوں کو اشارے سے پلان سمجھایا کہ اب نیلے کو موقع مت دو، چاروں طرف سے گھیر کر ایک دم بلا بول دو۔ منصوبے پر عمل ہوا۔ نیلے کو چاروں طرف سے خاموشی سے گھیر کر ایک ساتھ حملہ ہوا۔ لاٹھی اور اسٹک اُچٹ کر مارنے والوں کے ماتھوں سے ٹکرا کر فضا میں لہرانے لگیں۔

وہ بیری کا ایک موٹا درخت تھا۔

ٹکڑی نمبر ۲ نے آموں کے باغوں میں نیلے کو ڈھونڈنے کا پلان بنایا تھا۔ آموں کے گھنے باغ میں جیسے ہی سب لوگ داخل ہوئے تو باغ کے اندر پھچ پھچ کرتا ہوا کوئی بھاگا۔ بارش سے باغ میں کیچڑ ہو گئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں سب نے واضح طور پر دیکھا کہ وہ نیلا ہی تھا۔ مگر وہ ایک بھورا پٹھا تھا جس کے ابھی سینگ بھی پوری طرح نہیں نکلے تھے۔

ٹکڑی نمبر ۳ نے قصبے کی مشرقی سرحد کے کھنڈروں میں تلاش کا بیڑا اٹھایا۔ کھنڈر میں داخل ہوتے ہی سب نے محسوس کیا کہ کھنڈر میں کوئی ذی روح ہے۔ سب کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ ہمت کر کے آگے بڑھے۔ ملبے پر چڑھ کر کھنڈر کے آخری سرے تک دیکھا تو وہاں ایک سایہ نظر آیا۔ اگر ٹارچ کی روشنی وہیں سے ڈال دی تو وہ بھاگ سکتا ہے، یہ سوچ کر لوگ خاموشی سے ملبے کے نیچے اتر آئے اور پورا چکر کاٹ کر دھیمے دھیمے اس ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے پہنچ گئے جس کی آڑ میں نیلا کھڑا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ٹوٹی ہوئی دیوار سے ہاتھ نکال کر ٹارچ جلائی۔ وہ رام دین تیلی کی دیوی کے نام پر چھوڑی ہوئی بوڑھی گائے تھی۔

البتہ ٹکڑی نمبر ۴ نے جب بڑے پوکھر کے کنارے کی جھاڑیوں میں کھڑے نیلے کو چاروں طرف سے گھیر کر لاٹھیوں سے اچھی طرح پیٹ کر زمین پر لٹا دیا، اور روشنی میں اس کی چوٹوں کا جائزہ لینے کے لیے جب لالٹین جلائی تو معلوم ہوا وہ لڈن ٹانگے والے کا لنگڑا گھوڑا تھا جو اب اپنے

Scanned with CamScanner

لنگڑے پن کی معذوری سے چھٹکارا پانے کی منزل کے بہت پاس پہنچ چکا تھا۔

البتہ قصبے کے اندر پولیس والوں نے نیلے کے دھوکے میں جن پالتو جانوروں کو مارا اس میں اُن کا، یعنی پولیس والوں کا، کوئی قصور نہیں تھا کیوں کہ ان پالتو جانوروں اور نیلے میں بہت چیزیں مشترک تھیں۔ مثلاً بقاتی کی بھینس اس لیے ماری گئی کہ اس کا قد نیلے کے قد سے ملتا جلتا تھا۔ جمن ٹال والے کا بیل اس لیے زد میں آیا کہ اس کی اونچائی نیلے کی اونچائی کے برابر تھی۔ گنگا تیلی کا بھینسا اس لیے نشانہ بنا کہ اس میں اور نیلے میں یہ قدر مشترک تھی کہ دونوں کے دو دو کان تھے۔

ٹھاکر اودل سنگھ اتنی سرگرمی کے ساتھ نیلے کی تلاش کی مہم کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ وہ حویلی میں آئے۔ جیپ میں بیٹھ کر سیدھے دیہات پہنچے اور گڑھی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ انھیں نیلا بہت یاد آ رہا تھا۔ گڑھی میں پہنچ کر انھیں خاص طور سے نیلے کی ساری باتیں یاد آ جاتی تھیں۔ آنگن میں پڑی چارپائی پر لیٹ کر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ انھوں نے سوتے جاگتے کی کیفیت میں دیکھا کہ نیلا ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے اور ان کا ہاتھ چاٹ رہا ہے۔ آہٹ پر آنکھیں کھول دیں۔ وہ خواب نہیں تھا۔ نیلا واقعی ان کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے سینگ اور کھُر پر تازہ لہو کے نشان تھے۔ انھوں نے گھبرا کر معائنہ کیا کہ خون دوسروں کا ہے یا نیلے کے بدن سے نکلا ہے۔ ٹارچ سے دیکھ کر انھوں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا۔ خون دوسروں کا ہی تھا۔

۱۴

نیلا وقت اس گڑھی میں تھا۔ حالاں کہ در حقیقت وہ اس وقت قصبے میں تھا۔ وہ آموں اور امرودوں اور بیروں اور جامنوں کے ہر باغ میں تھا۔ قصبے کا ہر فرد سمجھ رہا تھا کہ نیلا کہیں اَور نہیں خود اس کے دروازے سے لگا کھڑا ہے۔ بس ذرا دروازہ کھلا اور...

Scanned with CamScanner

۱۵

نمبردار اودل سنگھ فیصلہ لینے میں دیر نہیں کرتے تھے، البتہ فیصلہ سنانے میں عجلت سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلہ کرنا اور فیصلہ سنانا دو مختلف عمل ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے میں الجھانا مناسب بات نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلہ جلد لینا عقل مندوں کا شیوہ ہے لیکن فیصلہ ظاہر کرنے میں جلدی کرنا احمقوں کا کام ہے۔ انھوں نے نیلے کے انجام سے متعلق آخری فیصلہ تو نہیں لیا لیکن اتنا ضروری سوچ لیا کہ فی الوقت کیا کرنا چاہیے۔ نیلے کے بارے میں آخری فیصلہ لینے کے لیے انھوں نے اپنے آپ سے وقت مانگا، جو انھوں نے اپنے آپ کو فوراً دے دیا۔ وہ لوگوں کا ردعمل جاننا چاہتے تھے، کہ گڑھی کے باہر گاؤں والے، پنچ، اسکول کا ہیڈماسٹر اور مندر کا پجاری نیلے کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ انھیں اس بات کی بھی فکر تھی کہ قصبے میں حویلی والے اور حویلی کے باہر دیگر افراد نیلے سے کس حد تک بدظن ہیں اور کس حد تک خائف ہیں؛ میونسپل بورڈ کے موافق اور مخالف ممبران کے جوش کا اب کیا حال ہے۔ ضلع کلکٹر شہر میں بیٹھا کن خطوط پر سوچ رہا ہے، اس بات کی فکر کی آنچ بھی ان کے ذہن کے کسی اجاڑ گوشے میں دھیمے دھیمے سلگ رہی تھی۔

نیلے کے انجام کے بارے میں وہ آخری فیصلہ لے سکتے تھے، لیکن انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ فیصلہ نہیں لیں گے؛ پہلے اس معاملے کے ہر پہلو کا باریکی اور گہرائی سے جائزہ لیں گے۔ لیکن باریکی اور گہرائی سے جائزہ لینے کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ نیلے کو کسی غیر نے دیکھ لیا تو وقت ملنا مشکل ہو جائے گا۔ تبھی انھوں نے ایک فیصلہ کیا۔

بڑے کی کھڑکی کے پاس جا کر آواز دی۔

"پرتاپ... او پرتاپ... باہر آؤ بیٹا!"

ان کی آواز سن کر اندر کمرے میں اچانک چوڑیاں کھنکیں۔ وہ کھڑکی سے دور ہٹ آئے۔ تھوڑی دیر بعد پرتاپ باہر آ گیا۔

"نیلا ہماری گڑھی میں آ گیا ہے،" انھوں نے بغیر کسی جذبے کے یہ جملہ ادا کیا۔ دوسروں کا ردعمل جاننے کی ابتدا وہ گھر سے ہی کرنا چاہتے تھے۔ پرتاپ کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بنیادی طور

Scanned with CamScanner

سے اچھا آدمی تھا۔

"باپو! اب اس کا گزارا یہاں نہیں ہو گا۔ گاؤں والے، قصبے والے، یہاں تک کہ شہر کا کلکٹر بھی، سب کے سب اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی غلط بھی نہیں ہے۔ اس نے بہت تباہی مچا رکھی ہے،" پرتاپ نے گڑھی کے آنکھیں میں اندھیرے میں کھڑے نیلے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ بات کہی۔

"لیکن یہ ہمارے کتنے کام آیا ہے اور ابھی بھی کتنے کام آسکتا ہے،" نمبردار نے اس کی طویل گفتگو کا مختصر سا جواب اس انداز سے دیا کہ ان کا جواب ایک سوال بن کر پرتاپ کی آنکھوں کے سامنے آنکھڑا سا بن کر ناچنے لگا۔

"وہ سوچ سوچ کر رک رک کر بولا:

"باپو... یہ گڑھی اور حویلی کی حفاظت کرتا ہے تاکہ ہمارا دھن دولت اور راج بنا رہے... لیکن اتنی بربادی کر دیتا ہے کہ ہمیں اس دھن دولت اور راج کو بھوگنے کا وقت بھی نہیں مل پاتا۔ ہر سمے یہ ذکر سنتے ہیں کہ آج نیلے نے اس کا کھیت اجاڑ دیا... کل نیلے نے اس کا کھلیان بگاڑ دیا... ابھی وہ ننھے بچوں کو کچل کر آیا ہے... اب وہ بڈھے بے قصوروں کو مارنے جا رہا ہے... کبھی اپنے ہی جیسے مویشیوں کو لہولہان کر رہا ہے، کبھی چھوٹی چھوٹی بکریوں پر کھڑا ارا رہا ہے۔ ہمیں اپنی چیزوں کی حفاظت کے لیے اس جنگلی کی مدد نہیں لینا چاہیے۔ ہم خود چوکنا سویا کریں گے..."

"تم مور کھ ہو پرتاپ! اس کا مطلب، تم اس وچار کے آدمی ہو کہ گڑھی میں یا حویلی میں پہلے چور کو آنے کی چھوٹ دے دو۔ جب وہ آجائے تو چونک کر اسے پکڑ لو۔ ارے مور کھ! کوشش یہ ہونا چاہیے، اور یہی کوشش میں نے کی تھی، کہ ایسا نقشہ بن جائے کہ کوئی گڑھی اور حویلی میں گھسنے کا خیال بھی من میں نہ لائے۔"

پرتاپ چپ ہو گیا۔ وہ زیادہ دیر تک اپنے باپ سے بحث نہیں کر پاتا تھا۔ "میں نے سوچا ہے..." انھوں نے پرتاپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا، اور وہ جانتے تھے کہ جب وہ پرتاپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کوئی بات کہتے ہیں تو وہ ہم نوائی کرنے لگتا ہے، "نیلے کو کچھ دن کے لیے مندر والے ارہر کے گھنے کھیت میں چھپا دیتے ہیں۔ پھر اندازہ کرتے ہیں کہ لوگوں کا اس کے بارے میں کیا وچار بن رہا ہے..."

Scanned with CamScanner

انھوں نے صرف پرتاپ اور گڑھی کے دونوں پہرے دار نوکروں کو اپنا ہم راز بنایا۔

کھرا سا ہو گیا تھا۔ دونوں پہرے دار نیلے کو گڑ اور بادام کھلاتے ہوئے آہستہ آہستہ رات کے پھیلے سناٹے میں گڑھی سے باہر لے گئے۔ اس کے زخموں پر ہلدی تھوپ دی گئی تھی جس سے بدن کیسریا ہو گیا تھا۔ تنگ گلیوں سے نکال کر آموں کے باغوں کے برابر سے ہوتے ہوئے مندر والے ارہر کے گھنے کھیت کے پاس پہنچے۔ ایک اسے لیے کھڑا رہا، دوسرا اندر جا کر کھیت کے بیچوں بیچ پودے کاٹ کر جگہ بنانے لگا۔ پھر دھیرے دھیرے نیلے کو کھیت میں داخل کر کے اس جگہ پہنچے۔ نیلا اس کھیت سے مانوس تھا۔ اکثر وہاں آیا کرتا تھا۔ اس نے فی الوقت کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اندر ایک موٹا سا کھونٹا ہاتھ بھر زمین میں گاڑ کر نیلے کی گردن میں رسان کے ساتھ رسی باندھ دی۔ رسی لمبی تھی، اتنی لمبی کہ نیلا آسانی سے چل پھر سکتا تھا۔ دوسرے پہیرے میں بہت سا چارا، بہت سا موٹا ناج اور بہت سا گڑ اور بادام لا کر اس کے پاس رکھ دیے گئے۔ ناند میں اوپر تک پانی بھر کر ناند وہیں مٹی میں جما دی گئی۔

واپسی میں سایوں کی طرح رینگتے ہوئے دونوں پہرے دار گڑھی میں پہنچے اور نمبردار کو نیلے کے اس کچے انتظام کی پکی خبر دی۔ نمبردار اودل سنگھ نے، جو اتنی دیر سے سانس روکے بیٹھے تھے، ایک بڑی سی اطمینان بھری سانس باہر چھوڑی۔ "اب تم باہر جا کر اطمینان سے سو جاؤ... بہو سے کچھ نہ کہنا..." انھوں نے ایسے یقین سے کہا گویا شوہر لوگ بیویوں سے راز چھپا پاتے ہوں۔ ویسے بھی بڑی بہو نے کھڑکی کی اوٹ سے منظر کا آدھا حصہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

نمبردار صبح اٹھے تو سب سے پہلے گاؤں کا ایک چکر لگایا۔ لوگ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی کہ آج بہت دنوں بعد نمبردار کو گاؤں پر ٹوٹ کر پیار آیا ہے، اور وہ بھی ہر گلی پر۔

عورتوں نے انھیں دیکھ کر گھونگھٹ کاڑھ لیے اور مردوں نے ان کے پاس اکٹھا ہو کر نیلے کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ "کیا ہوا نمبردار جی، نیلا ملا کہ نہیں؟"

"بھئی کوشش تو جاری ہے۔ ایک ذرا سے جانور کو ڈھونڈنے کے لیے قصبے میں بیسیوں پولیس والے اور قصبے والے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں،" انھوں نے گول گول بات کی۔

لیکن ان کی اس گول گول بات میں بھی کچھ لوگوں نے اچھے خاصے چوکور مطلب نکال لیے۔ دراصل "ذرا سے جانور" اور "بیسیوں پولیس والے اور قصبے والے لوگوں کی کوشش" والا جملہ ___

نمبردار اودل سنگھ کا سوچا سمجھا جملہ ـــــ اس بات کا متقاضی تھا کہ لوگ کم از کم ان کے سامنے ہمدردی کا اظہار کریں۔

"کئی دن سے دیکھا نہیں تو کچھ عجیب عجیب سا لگتا ہے،" ان کے ایک پڑوسی نے سنبھل سنبھل کر جملہ بولا۔

لیکن اس جملے سے راستا کھل گیا تھا۔ ان کے تمام ہم نوا بھیڑ میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے ان کی طرف ہو گئے تھے۔

"جانے غریب کو اس بیچ چارا بھی ملا کہ نہیں..." دوسرے نے تاسف بھرے لہجے میں اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"پچھلے کئی مہینوں سے وہ بالکل چپ چاپ ہو گیا تھا... چلتے چلتے رک جاتا تھا..." تیسرے نے انکشاف کیا۔

اس انکشاف پر نمبردار کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے اپنا منھ جلدی سے بند کر لیا اور سوچا ٹھیک ہی کہتا ہو گا۔ دراصل یہ بات سچ بھی تھی۔ نیلا چلتے چلتے رک جاتا تھا اور رک کر اس شخص پر حملہ کرتا تھا جو سب سے نزدیک ہو...

چوتھے نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی پندرہ دن پہلے میں کھیت سے ہل چلا کر واپس آ رہا تھا تو دیکھا، نمبردار کا نیلا مندر کے سامنے کھڑا ہے۔ جیسے ہی سورج دیوتا ڈوبے، نمبردار کے نیلے نے مندر کی طرف منھ کر کے ڈنڈوت کی اور دونوں کھُر جوڑ دیے..."

باقی لوگوں کے چہرے پر عقیدت کی روشنی جگمگ جگمگ کرنے لگی۔

ٹھاکر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اندازہ کیا کہ جن جن کے گھروں کے برتن نیلے نے توڑے تھے، جن کے بچوں کو کچلا تھا اور جن جن پر حملہ کیا تھا، وہ ان لوگوں کی ہم نوائی نہیں کر رہے ہیں... خاموشی سے ایک بے بس خاموش تماشبی سے ایک دوسرے کا منھ تک رہے ہیں...

ان کے ہم نوا ان کے ساتھ چلے۔ باقی لوگ پیچھے رہ گئے تھے۔ انھوں نے واضح سنا، وہ نمبردار اور نیلے دونوں کو سرگوشیوں میں گالیاں دے رہے تھے۔

راستے میں مندر کے پاس رک کر انھوں نے ہاتھ جوڑے۔ پجاری جی باہر نکل آئے۔ انھوں نے اپنے ساتھ کے لوگوں کو سنانے کے لیے پجاری جی سے پوچھا، "قصبے میں انکھیلیاں کر کے نیلا

Scanned with CamScanner

بھاگا تھا، آپ نے ادھر تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں بیٹا..." پھر کچھ رک کر انھوں نے جملے کو آگے بڑھایا، "ہو سکتا ہے، پاپیوں کی بستی سے کچھ دنوں کے لیے کچھ دور چلا گیا ہو۔" نمبردار نے سوچا، ساتھ والے دیہاتی خود کو "پاپی" نہ سمجھیں۔ انھوں نے اپنے جملے میں اس کی وضاحت کر دی۔

"ہاں مہاراج! قصبے والے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ دراصل وہ مجھ سے دشمنی نکالنا چاہتے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر چلنے لگے۔

"تو چنتا نہ کر نمبردار، انت میں اچھائی کی برائی پر جیت ہوتی ہے..." پجاری جی نے نمبردار کو چلتے چلتے آشیرواد دیا۔

نمبردار سب کو ساتھ لے کر آگے بڑھ لیے تھے۔ کچھ یاد آیا، رکے اور گھوم کر دیکھا۔ پجاری جی وہیں کھڑے تھے۔ انھیں لگا جیسے پجاری جی کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر ساتھ کے آدمیوں کی وجہ سے کچھ سنکوچ میں ہیں۔

نمبردار کو کچھ یاد آیا۔

"ارے مہاراج، ادھر میں بہت کام کاج میں لگا رہا... دھیان نہیں رہا۔ مندر کے گیہوں، گڑ اور کپڑے ابھی نہیں پہنچا پایا ہوں۔ آج ہی شام کو آدمی دے جائے گا۔"

مہاراج نے اطمینان کی سانس لے کر پھر آشیرواد دیا۔ اس بار انھوں نے ہاتھ اٹھا کر بڑا والا آشیرواد دیا تھا۔

بس اس ہیڈماسٹر کے بچے کے خیالات اور معلوم ہو جائیں، انھوں نے امرائی کے پاس کمر جھکے شکستہ اسکول کو دیکھ کر سوچا۔

ہیڈماسٹر سے ان کے تعلقات عجیب نوعیت کے تھے۔ ضلع کلکٹر اور شہر کے پڑھے لکھوں کو دکھانے کے لیے گاؤں میں اسکول ہونا ضروری تھا، اس لیے اسکول تھا۔ اسکول کا خرچہ گرام پنچایت اٹھاتی تھی جس میں ساری بات نمبردار کی چلتی تھی۔ لیکن ہیڈماسٹر نمبردار اودل سنگھ کی جا بے جا خوشامد نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت ایک معقول حرکت نہیں کہی جا سکتی۔ نمبردار کو دیہات کے بچوں کی تعلیم بہت اکھرتی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ سارے لونڈے جنھوں نے اس اسکول میں تعلیم پائی تھی ان سے اتنے خوش نہیں رہتے تھے جتنے وہ لونڈے جنھوں نے تعلیم

نہیں پائی تھی۔ انھوں نے خفیہ طریقے سے اس بات کی بھی ٹوہ لگائی تھی کہ کہیں یہ ہیڈماسٹر بچوں کو تعلیم دینے کے بہانے، نمبردار کی برائیاں تو نہیں کرتا۔ اس جاسوسی کے نتیجے میں انھیں براہِ راست مثبت جواب نہیں ملا، البتہ ٹوہ لینے والوں نے نمبردار کو یہ ضرور بتایا تھا کہ آج کل اسکول کی جو کتابیں چھپتی ہیں ان میں خواہ مخواہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر لونڈے لوگوں کو نمبردار کا خیال آجاتا ہوگا۔ مثلاً مہابھارت کا وہ حصہ کتاب میں ہونا کیا ضروری ہے جس میں کنس کا ذکر بہت نفرت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس طرح رامائن کا پاٹھ راون کے ذکر کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے تاریخ کی کتابوں پر بھی مدلل اعتراضات کیے اور کہا کہ ہیڈماسٹر جان بوجھ کر ان حصوں کو بہت تفصیل کے ساتھ دانت پیس پیس کر پڑھاتا ہے جن حصوں میں ہٹلر، مسولینی وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ ان لوگوں کی نظروں سے معاشیات کی کتابوں کے وہ مخدوش حصے بھی نہیں بچ سکے جن کو پڑھ کر لونڈے خود کو سب کے برابر سمجھنے لگے ہیں۔ ادب کے وہ حصے بھی مناسب نہیں تھے جن میں غریبی سے نفرت اور انقلاب کی ضرورت وغیرہ پر زور دیا گیا تھا...

نمبردار نے نصاب سے متعلق اصلاحات کی ان تجویزوں کو ہیڈماسٹر کے سامنے رکھا تھا۔ ہیڈماسٹر یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ پھر ہنسنے لگا تھا۔ اس کی حیرانی تو کسی حد تک اودل سنگھ کی سمجھ میں آئی تھی مگر اس ہنسی کو انھوں نے بدتمیزی پر محمول کیا تھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ آپ اس اسکول میں کس کی وجہ سے ہیڈماسٹر ہیں؟ میری وجہ سے، سمجھے۔" تب ہیڈماسٹر نے دھیمی دھیمی آواز میں ان کو بتایا:

"اول تو یہ کہ میں ہیڈماسٹر نہیں صرف ماسٹر ہوں، کیوں کہ میرے علاوہ اسکول میں کوئی ماسٹر نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ میں بچوں کو تعلیم دیتا ہوں اور اس کے بدلے میں گرام پنچایت مجھے مہینہ مہینہ یا کبھی تین تین مہینے بعد تنخواہ دیتی ہے۔ تیسرے یہ کہ اتنی کم تنخواہ میں تین ماسٹروں کا کام اس دیہات میں میرے علاوہ کون کرے گا؟"

نمبردار کو سچائی کے اس قسم کے براہ راست اور بے تکلف اظہار سے بڑی الجھن سی ہوتی تھی۔

"اگر میں گرام پنچایت سے کہلوا کر آپ کو نکلوا دوں تو؟" تو کہنے کے لیے جتنا منہ کھولنا ضروری ہوتا ہے انھوں نے اس سے زیادہ کھولا اور دیر تک کھولے رکھا۔

Scanned with CamScanner

"تو یہ ہو گا کہ گاؤں میں آپ کی ٹھو ٹھو ہو گی اور جب یہ بات قصبے تک پہنچے گی تو اگلے الیکشن میں آپ کے خلاف یہ بھی ایک نکتہ استعمال کیا جائے گا..."

نمبردار نے اپنا بڑا سا کھلا ہوا منہ جلدی سے بند کر لیا۔ کیوں کہ وہاں تک نمبردار اودل سنگھ کی عقل نہیں گئی تھی اس لیے وہ ہیڈماسٹر کی اس اطلاع سے نروس ہو گئے تھے۔ تب انھوں نے پینترا بدل کر کہا تھا:

"میں نے تو ہیڈماسٹر صاحب، آپ کی گہرائی جاننے کے لیے اتنی باتیں کیں۔ آپ کا رہنا اور یہاں رہ کر بچوں کو تعلیم دینا گاؤں کی شوبھا بڑھاتا ہے۔ بلکہ آپ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ یہ گاؤں آپ اور آپ کے اسکول کے بغیر ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

ہیڈماسٹر اپنی چرخ چوں سائیکل پر بیٹھ کر اسکول کی طرف بڑھ گیا تھا۔

انھیں ماسٹر کا ایک جملہ اور یاد آیا۔

"جنگلی جانور کو گڑ بادام کھلا کر اور سرسوں کا تیل پلا کر نمبردار نے اس کی بدھی بھرشٹ کر دی ہے۔ یہ پراکرتی کے خلاف ہے۔"

آج وہ اُسی ہیڈماسٹر کے پاس اُسی نیلے کے بارے میں اس کی تازہ رائے جاننے کے لیے نکلے تھے۔

ہیڈماسٹر اسکول میں بیٹھا بچوں کو سبق پڑھا رہا تھا۔

نمبردار ایک یاد سے بہت بچتے تھے۔ یاد آتے ہی خود کو اِدھر اُدھر بہکا لیتے تھے۔ مگر آج انھیں اس ہیڈماسٹر سے وہ عجیب وغریب پراسرار ملاقات پھر یاد آئی۔ یہ جب کی بات ہے جب بڑکی کی عزت لوٹی گئی تھی۔ اس پراسرار ملاقات سے کچھ دن پہلے کمہار کی بیوہ اور بڑکی اور چھٹکی نے اسکول کی چھٹی کے بعد اسکول کے باہر نیم کے درخت کے نیچے ماسٹر صاحب کا انتظار کیا تھا۔ جب وہ اسکول بند کر کے وہاں سے گزرے تو کمہارن نے ان کے پاؤں پکڑ کر رو رو کر کہا تھا کہ نمبردار کا نیلا روزانہ ان کے محنت سے بنائے ہوئے برتن توڑ دیتا ہے۔ وہ آج شکایت لے کر ٹھاکر کے پاس گئیں تو ٹھاکر نے ہنس کر ان سے کہا کہ "برتن توڑتا ہے، مٹی تو نہیں کھا جاتا ہے۔ اسی مٹی کو پھر سے گوندھ گاندھ کر برتن بنا لیا کرو۔ اس میں اتنی پریشانی کی کون سی بات ہے جو مجھے کلیسو کے وقت پریشان کر رہی ہو۔"

Scanned with CamScanner

ہیڈماسٹر نے ان تینوں کو ڈھارس دی اور گڑھی میں جا کر نمبردار کو سمجھایا۔ نمبردار نے تو ہنس کے ٹال دیا مگر اوتار کا چہرہ سرخ ہو گیا جو وہیں کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔

گڑھی کے دروازے پر تینوں عورتیں کھڑی ماسٹر کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب ماسٹر بڑے دروازے سے نکل رہا تھا تو اس نے اوتار کو غصے کی حالت میں کمہارن اور اس کی بیٹیوں سے بات کرتے دیکھا۔ وہ ان تینوں کو ننگی ننگی گالیاں دے رہا تھا جن کی آج اتنی ہمت ہو گئی کہ وہ پنچایتی اسکول کے ماسٹر کو ان کے باپ کے پاس نیلے کی شکایت لے کر بھیجیں۔ ماسٹر کو آتا دیکھ کر اس نے نسبتاً شائستہ لہجے میں ان دونوں لونڈیوں کو کپڑے اتارنے والی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا:

"اوپر والے کا شکر کرو کہ ابھی نیلے نے ہی برتن توڑے ہیں۔ میں نے تو ابھی برتنوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" وہ جاہل عورتیں کیا سمجھتیں، مگر ماسٹر کا ماتھا ٹھنک گیا۔ وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

جب بڑکی کا جھونپڑے والا واقعہ ہو گیا تو ایک رات ٹھاکر جیپ میں سوار گاؤں کی گڑھی تک آئے اور اتر کر تھکے تھکے قدموں سے جب گڑھی کے دروازے پر پہنچے تو دھندلکے میں انھیں ایک شخص رضائی اوڑھے کھڑا دکھائی دیا۔ وہ آدمی دھیمے دھیمے رو رہا تھا۔ انھیں اس پراسرار شخص سے ڈر محسوس ہوا۔ وہ پہرے داروں کو آواز دینے ہی والے تھے کہ اس شخص نے رضائی سے منہ نکال لیا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں سرخ تھیں اور گیلی تھیں۔ اس نے رندھی رندھی آواز میں ٹھاکر سے کہا، "نمبردار جی! بڑکی کی عزت معلوم ہے کس نے...؟"

"کس نے؟" ٹھاکر نے مری مری آواز میں پوچھا۔ انھیں اس سوال کے جواب اور ہیڈماسٹر کے اس پراسرار روپ سے ڈر لگ رہا تھا۔

"اس نے... ادھر دیکھو..." ٹھاکر نے اس کی انگلی کے اشارے پر نظریں دوڑائیں۔ سامنے اندھیرے میں نیلا کھڑا تھا۔ ہیڈماسٹر انھیں حیران دیکھ کر ہنسا تھا اور پھر اندھیری گلی میں غائب ہو گیا تھا۔ ٹھاکر نے جلدی سے اس یاد کو اپنے ذہن سے جھٹکا۔ نمبردار اور ان کے ساتھ والوں کو دیکھ کر اس نے جلدی جلدی سبق ختم کرایا، سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور سلام کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔

پھر بولا:

"میرا دل چاہتا ہے کہ آپ میرے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چل کر بیٹھیں..."

نمبردار کو اس معمولی گزارش میں ایک طرح کی علامتی قسم کی گستاخی نظر آئی۔

Scanned with CamScanner

"نہیں نہیں ہیڈماسٹر صاحب... بس بہت دن سے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔ سوچا آپ سے سلام دعا کر لیں۔ ہم لوگ ادھر نیلے کی تلاش کر رہے ہیں۔ آپ نے تو نہیں دیکھا؟" نمبردار نے یہ کہہ کر ماسٹر کے چہرے کو گہری نگاہوں سے کریدا اور اپنے ذہن کی داد دی کہ کیسے انھوں نے سمجھ لیا کہ ہیڈماسٹر کے سیڑھیاں چڑھا کر اوپر لے جانے والے جملے کا مطلب تھا کہ نمبردار بھی اس کی شاگردی اختیار کر کے علم کی بلندیاں چڑھ کر اس کی اونچائی تک پہنچ جائیں۔ انھوں نے ایک بار پھر اپنی عقل کو داد دی اور ایک بار پھر ہیڈماسٹر کے چہرے کو اپنی نظروں سے کریدا۔ کیوں کہ ہیڈماسٹر کے چہرے پر شیو بڑھا ہوا تھا اس لیے وہ اس کے چہرے کو اپنی نظروں کی مدد سے زیادہ نہیں کرید پائے۔

"نہیں اِدھر تو نہیں دیکھا۔ لیکن میں نے آپ کو پہلے ہی سمجھایا تھا کہ ایسے وحشی جانور کو اگر پالنا ہی ضروری ہے تو وہی کھان پان دیں جو اسے جنگل میں ملتا ہے اور اسے انسانوں کی صحبت سے دور رکھیں، ورنہ اس کا وہ فطری ڈر ختم ہو جاتا ہے جو ہر جانور کو انسان سے محسوس ہوتا ہے۔"

نمبردار کو اندازہ ہو گیا کہ ہیڈماسٹر کی نیلے کے بارے میں تازہ رائے کیا ہے۔ ہیڈماسٹر کی تازہ رائے ہیڈماسٹر کی باسی رائے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اب نمبردار نے اسے علم کے وار سے گھائل کرنا مناسب سمجھا۔

"ہیڈماسٹر صاحب، میرے بہت سے دوست ہیں، آسام سے لے کر گجرات اور ہمالہ سے لے کر تمل ناڈو تک۔ آسام والے نے قاضی رنگا سے ایک نیلا پکڑ کر پالا، گجرات والے نے گیر کے جنگل سے نیلا لا کر اپنے ساتھ رکھا، ترائی والے دوست نے ودھوا کے جنگل سے نیلا حاصل کیا اور تمل ناڈو والے نے باندی پور کے جنگل سے پکڑ کر اپنا پالتو بنایا۔ مگر آپ کو میرے ہی نیلے میں ساری برائیاں نظر آتی ہیں..."

"نمبردار! آپ سچ سچ بتانا، کیا آپ کے دوستوں نے جو نیلے پالے وہ بڑے ہو کر قیمتی غذائیں کھا کر جنگل میں دوڑنے کی محنت اٹھائے بغیر چارا کھا کر، کیا مست نہیں ہوئے؟ کیا بربادی نہیں مچائی؟"

نمبردار نے اس بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ خود اپنے نیلے میں اتنی بری طرح الجھے رہتے تھے کہ انھیں اپنے دوستوں کے نیلوں کا زیادہ دھیان ہی نہیں آتا تھا۔

Scanned with CamScanner

انھوں نے بات بدلنے کی خاطر پوچھا:

"اچھا تو ماسٹر صاحب، آپ ہی بتاؤ، اب کیا کیا جائے؟"

"پہلے تو آپ نیلا ڈھونڈیے۔ وہ جہاں بھی جائے گا آفت مچائے گا۔ اس کی عادتیں خراب ہو چکی ہیں۔ اسے ڈھونڈ کر اپنے پاس باندھ کر رکھیے، اور آہستہ آہستہ اس کی بُری عادتیں چھڑوائیے۔ اس کی غذا بدلیے۔ اسے پھر سے اس کی فطری غذا پر لائیے۔ حالاں کہ اس میں پریشانی تو ہو گی مگر یہ تو اب کرنا ہی پڑے گا۔ جب وہ اپنی غذا کا عادی ہو جائے تو اس کو میدانوں میں چھوڑ آئیے۔ اس بیچ اس کی چربی بھی کچھ کم ہو چکی ہو گی، اور چربی کم ہونے سے وہ میدان دوڑنے میں تکلیف نہیں محسوس کرے گا۔ میدانوں میں بھاگ دوڑ کر کے جب اسے اپنی جنگل کی غذا ملے گی اور اپنے ساتھی ملیں گے اور مادائیں ملیں گی تو اس کا جنون ختم ہو جائے گا اور پھر اپنی فطری زندگی کا عادی ہو جائے گا..."

"لیکن میری گڑھی اور حویلی کا کیا ہو گا؟" ٹھاکر کے منھ سے نکل پڑا۔

"اس کا کیا مطلب؟"

ٹھاکر کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے منھ سے حماقت کی بات نکل گئی ـــــ یعنی صحیح بات نکل گئی۔ فوراً پہلو بدل کر بولے، "مطلب، گڑھی اور حویلی میں اسے دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ وہ نظر نہیں آئے گا تو کتنا برا لگے گا۔"

"نمبردار جی! گڑھی اور حویلی میں اپنے بیٹے اور بہو اور پوتے پوتی اور گاؤں والوں اور قصبے والوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کیجیے، اور انھیں میں اپنی تفریح کا سامان پیدا کیجیے۔ انھیں میں آپ کی زندگی ہے اور انھیں سے آپ کی زندگی ہے۔ بھگوان کے لیے اب اپنا شوق ختم کیجیے۔ آپ کا یہ شوق اس جانور کو بھی بھاری پڑ رہا ہے اور گاؤں اور قصبے والوں کو بھی۔ گڑھی اور حویلی میں بھی بربادی مچی ہوئی ہے۔ آج جا کر آپ من لگا کر سوچیے کہ کیا کارن ہے جس کی وجہ سے آپ کو نیلے کی چاہ ہے۔ جب وہ کارن سمجھ میں آجائے تو اس کارن کی جڑ کاٹ کر پھینک دیجیے۔"

نمبردار اودل سنگھ جب واپس آئے تو بظاہر وہ اپنے ساتھ والوں سے ہیڈماسٹر کی حماقت آمیز باتوں پر ہنس ہنس کر جملے کس رہے تھے، لیکن اندر سے انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ جاہل ہیڈماسٹر نے ان کی دُکھتی نبض پر انگلی رکھ دی ہے۔

Scanned with CamScanner

گڑھی میں واپس آ کر وہ چھت پر چڑھ گئے اور وہاں انھوں نے دور مندر کے کھیت میں کھڑے نیلے کو محسوس کیا اور اس بات سے مطمئن ہوئے کہ سردیوں کا زمانہ ہے، ورنہ گرمی ہوتی تو نیلا اتنی دیر تک کھیت کی گرمی کی تاب نہ لا پاتا۔ وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے نیلے سے پیدا ہونے والی دہشت کو محسوس کیا اور اس دہشت کے سائے میں قطرہ قطرہ بڑھتی دولت اور انچ انچ بڑھتے اقتدار اور اختیار کا لقمہ لقمہ ہضم کیا، اور جب وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے تو ایک طرف تو ان کا ذہن کہہ رہا تھا کہ نیلے سے چھٹکارا حاصل کر لو اور دوسری طرف کوئی چپکے چپکے کہہ رہا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے کان لگا کر سنا تو یہ دوسری آواز ان کے سینے کے بائیں طرف سے آئی تھی۔

جب وہ آنگن میں آ کر مونڈھے پر بیٹھے تو چراغ جل چکے تھے۔ باہر سے پہرے دار دوڑتے ہوئے آئے اور انھیں اطلاع دی کہ نیلا ارہر کے کھیت میں سے رسی تڑا کر بھاگ لیا ہے۔

ان کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ قصبے میں پہنچ جائے۔ اب کوئی بربادی ہوئی تو بڑی بدنامی ہو گی۔

وہ جیپ پر بیٹھ کر ہوا کی رفتار سے قصبے کی طرف روانہ ہوئے۔ پر تاپ روکتا ہی رہ گیا۔

قصبے کی گلیوں میں اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی تھی۔ لیکن انسان نہیں تھے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں کنڈی لگائے بیٹھے تھے۔ چوراہوں پر پولیس والے کھڑے سیٹیاں بجا رہے تھے اور آوارہ کتے خلاف معمول اتنی جلد بازار سُونا دیکھ کر منحوس آواز میں رونے لگے تھے۔

نیلا قصبے میں کسی بھی گھر کے پاس کھڑا مل سکتا ہے۔ یا ہو سکتا ہے قصبے کے باہر کھیت یا کسی اجڑے ہوئے باغ میں کھڑا ہو۔ حویلی تک جانے والی سڑک کے ایک موڑ پر جیسے ہی وہ مڑے، انھیں ایک سایہ سا نظر آیا۔ خوف کی ایک ٹھنڈی لہر ان کی گدی سے ہوتی ہوئی پوری پیٹھ پر پھیل گئی۔ یہ نیلے کا ہی سایہ ہو گا، کہ انسان تو سارے اسی کے ڈر سے گھروں میں بند بیٹھے ہیں۔

حویلی کے صحن میں جا کر انھوں نے نیلے کو ہر طرف تلاش کیا۔ وہ کہیں نہیں ملا۔ بجلی چلی گئی تھی اور رات بالکل تاریک تھی۔ وہ بیٹھک میں اکیلے بیٹھے سوچتے رہے اور ڈرتے رہے۔ رات بارہ بجے کے بعد کسی وقت ان کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک پورے قصبے میں چیخ پکار کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ حویلی کے نوکروں میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔

Scanned with CamScanner

وہ جلدی سے اٹھے اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اندھیرے میں کوئی جانور تیز تیز سانس لیتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔ وہ اندازہ نہیں کر پائے کہ وہ کدھر گیا۔ اچانک پھر ایک جانور مخالف سمت سے بھاگتا ہوا آیا اور دوڑتا چلا گیا۔

انھوں نے سامنے کی گلی کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہاں بھی ایک سیاہ سایہ کھڑا تھا۔ انسانوں کا شور اور پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں اب بھی تھمی نہیں تھیں۔ انھوں نے گلی کی طرف پھر دیکھا۔ اب وہ سایہ وہاں نہیں تھا۔

۱۶

اس رات ایک ساتھ ۱۲ وارداتیں ہوئیں۔ قصبے کے کونے والے محلے کے ایک ہی خاندان کے تین گھروں کے دروازے ٹوٹے ہوئے پائے گئے۔ بزریا کی پانچ دوکانوں کے شٹر ٹیڑھے ہو گئے تھے اور اندر کی جنس دوکانوں میں چاروں طرف بکھری ہوئی ملی تھی۔ تین پولیس والوں پر پیچھے سے کسی جانور نے اندھیرے میں حملہ کیا جو بڑے نالے کی پُلیا پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میونسپل بورڈ میٹنگ ہال کا دروازہ توڑ کر پندرہ کرسیوں کو سینٹے کے قلم کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔ جو وارداتیں کچی زمین پر ہوئی تھیں وہاں جانور کے کھُروں کے نشان پائے گئے تھے۔

میونسپل بورڈ کے آفس میں ضلع کلکٹر متفکر بیٹھا تھا۔ ٹھاکر اودل سنگھ اور محمود صاحب اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ قصبے کا دورہ کر کے ایس پی صاحب جیپ سے اترے، ان کے ساتھ ہی قصبہ انچارج کودا۔ ہال میں آ کر ایس پی صاحب ایک کرسی کھینچ کر کلکٹر صاحب کے برابر بیٹھ گئے۔ قصبہ انچارج سامنے آ کر اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

"آرام سے،" ایس پی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ آرام سے ہو گیا۔

"آپ نے نتیجہ دیکھ لیا..." کلکٹر نے خاموشی توڑی۔

نمبردار چپ بیٹھے رہے۔ محمود صاحب نے بھی سر جھکا لیا۔ اودل سنگھ کی بدنامی اور

Scanned with CamScanner

بے عزتی اتنی واضح تھی کہ محمود صاحب کی مزید کمک کی ضرورت نہیں تھی۔

"مگر یہ ساری وارداتیں ایک ہی نیلے کی کارستانی نہیں ہیں،" ایس پی نے انکشاف کیا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ کئی نیلے ہیں؟" کلکٹر صاحب نے پوچھا۔

"نہیں، یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن پولیس والوں کا بیان تھا کہ ان پر جو حملہ ہوا اس میں ایک سے زیادہ جانور ملوّث تھے،" ایس پی کے اس جملے سے نمبردار اودل سنگھ کے بدن میں کچھ جان پڑی۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟ کچھ اندازہ؟"

"قصبہ انچارج سے بات چیت کے دوران اندازہ ہوا کہ کچھ روز پہلے کانجی ہاؤس سے نیلے نے جن بجاروں کو آزاد کرایا تھا وہ اس کے ملزم ہو سکتے ہیں۔ کئی دنوں کے بھوکے پیاسے بجار رات کو اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکلے ہوں گے اور پانی پینے نالے پر آئے ہوں گے۔ وہاں سپاہی بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ پانی کے حصول میں مزاحم سمجھ کر حملہ بول دیا ہو گا..."

"کیا نیلے اور بجار کے کھُر کے نشان میں فرق محسوس ہو سکتا ہے؟" کلکٹر صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں سرکار!" قصبہ انچارج بولا۔ "مگر ہوا اتنی چلی کہ ان کے کھُر آدھے ہیں آدھے غائب۔ اب پہچان مشکل ہے۔"

نیلے کے کھُر کی پہچان والی بات سن کر نمبردار اودل سنگھ نے بازی پلٹتی محسوس کی۔ فوراً بولے، اور کیوں کہ اس بار پہلی مرتبہ بولے تھے اس لیے بات دھیان سے سنی گئی:

"صاحب! بزریا کی دو کانیں توڑ کر سامان کون اٹھا لے گیا؟ یہ حرکت جانور نہیں کر سکتا۔"

اس بات کو سن کر ایس پی اور تھانا انچارج نے سر جھکا لیا۔ تھانا انچارج کا لمبوترا چہرا اس کے سینے پر ٹک گیا اور دیر تک وہیں ٹکا رہا۔

کلکٹر نے مسوری کی تربیت کے دوران بڑی نادر و نایاب باتیں سیکھی تھیں، اس لیے وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا:

"اصل معاملے سے توجہ نہیں ہٹنا چاہیے۔ جب جڑ کا علاج ہو جائے گا تو باقی باتیں خود بخود درست ہو جائیں گی۔ اس پورے فتنے فساد کی بنیاد ہے دراصل ٹھاکر صاحب کا نیلا، جو اب پاگل ہو چکا ہے۔ اس وقت اسی کے بارے میں گفتگو کرنا چاہیے... اب آپ بتائیے ٹھاکر صاحب کہ آپ

کا فیصلہ کیا ہے؟"

"جس میں سب کی بھلائی ہو،" ٹھاکر دل کڑا کر کے بولے۔

"اگر وہ ہاتھ آ جائے تو اس کا کیا کیا جائے؟" کلکٹر نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"میرے حوالے کر دیا جائے۔ میں اسے دوبارہ جنگل کی عادت ڈال دوں گا۔ پھر اس کا پاگل پن ختم ہو جائے گا،" ٹھاکر اودل سنگھ نے ہیڈ ماسٹر والا سبق یاد کرنے کی کوشش کی۔

"آپ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ پھر آزاد ہو کر تباہی مچائے!" کلکٹر نے استہزا کے انداز میں کہا۔

ٹھاکر صاحب کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا کلکٹر کو معلوم ہے کہ وہ میرے ہاتھ آ کر نکل چکا ہے؟ پھر انھوں نے خود کو تسلی دی کہ کلکٹر نے یہ بات یوں ہی رواروی میں کہہ دی ہے۔

"سنیے جناب! رائے عامہ کا زبردست دباؤ ہے۔ دیگر قصبوں والوں نے بھی شکایت کی ہے کہ نیلا ان کے یہاں بھی تباہی مچا رہا ہے۔ کل نیلا شہر میں بھی دیکھا گیا ہے۔ اب یہ معاملہ مقامی نہیں رہا۔ لیکن نیلا کیوں کہ آپ سے وابستہ ہے، اور اس کا مقام واردات خاص طور پر یہ قصبہ ہے، اس لیے آپ دونوں حضرات قصبے کے معزز شہری کی حیثیت سے اس کاغذ پر دستخط کیجیے کہ نیلے کی وحشیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے نیلے کو مارنا مناسب ہو گا۔ یہ درخواست وائلڈ لائف افسر کے نام ہے۔ میں ان سے اجازت نامہ پیشگی حاصل کر چکا ہوں۔ یہ دیکھیے..." انھوں نے کوٹ کی جیب سے سرکاری مہر والا ایک کاغذ دکھایا۔

محمود صاحب نے تیزی سے اور ٹھاکر صاحب نے مرے مرے ہاتھوں سے کلکٹر کے دیے ہوئے کاغذ پر دستخط کیے۔ محمود صاحب نے شکر ادا کیا کہ کلکٹر اور ایس پی کسی نے بھی میونسپل بورڈ کے آفس کی توڑ پھوڑ کے بارے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ٹھاکر اودل سنگھ نے دستخط کرنے کے بعد سوچا کہ یہ مرحلہ ختم ہو تو وہ جلد از جلد گڑھی اور حویلی کی ساری دولت نکال کر شہر کے اس بینک میں رکھ دیں گے جہاں پچھلے ہفتے ہی ایسے لاکر تقسیم ہونا شروع ہوئے ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے نام کا اندراج نہیں کرنا پڑتا، بلکہ کوڈ نمبر دے دیا جاتا ہے۔

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جانور واردات کر کے چھپ کہاں گئے ہیں..." ایس پی

Scanned with CamScanner

صاحب بولے۔

"میں کچھ کہوں گا تو کہا جائے گا کہ میں نیلے کی حمایت میں بول رہا ہوں۔ آپ یقین کیجیے، میں نے رات کو چیخ پکار کے بعد اپنی کھڑکی سے تین نیلے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے،" ٹھاکر نے رات کا منظر یاد کیا اور جھرجھری لے کر بولے۔

"کیا وہ نیلے ہی تھے؟" ایس پی نے پوچھا۔

"نہیں... لیکن وہ جانور یقیناً تھے،" ٹھاکر نے جواب دیا۔

"ممکن ہے ٹھاکر صاحب کا نیلا جنگل سے آور وحشی نیلوں کو لگا لایا ہو جو اس کے بدن کی موٹی چربی دیکھ کر لالچ میں آ گئے ہوں،" کلکٹر نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ممکن ہے قصبے کے عام جانوروں نے نیلے کی وحشت کی شہرت کا فائدہ اٹھایا ہو،" ایس پی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"لیکن یہ سب کچھ بہت خطرناک اور پراسرار ہے،" محمود صاحب نے کہا۔ وہ چاہتے تھے کہ گفتگو نیلے اور دیگر جانوروں سے ہی متعلق رہے، میونسپل بورڈ آفس کی توڑ پھوڑ کا ذکر نہ آ پائے۔

"لیکن بنیاد وہ نیلا ہی ہے،" کلکٹر نے کہا لیکن دل ہی دل میں سوچا کہ دوردراز کی ساری بستیوں سے جن بربادیوں کی خبریں آ رہی ہیں ان سب کا سبب تو یہ اکیلا نیلا نہیں ہو سکتا۔ تمام علاقوں میں کل ملا کر کتنے پالتو نیلے ہیں؟

"وہ اگر ختم بھی ہو جائے تو اس کے ساتھ کے نیلے اور کانجی ہاؤس کے بجاروں کا بھی انتظام کرنا ہوگا،" ایس پی نے ان کا دھیان بٹایا۔

"ارے پہلے اس ایک نیلے کو ہی قابو میں کیجیے کپتان صاحب،" کلکٹر نے فکرمند مسکراہٹ کے ساتھ کہا جس میں کچھ کچھ طنز کی چمک بھی تھی۔

اس جملے کے بعد سب نے اپنے اپنے سر جھکا لیے تھے۔ خود کلکٹر صاحب کا سر بھی اٹھا ہوا نہیں تھا۔

دور آفس سے ملحق پارک کی سیڑھیوں پر کچھ شور سا ہوا۔ گڑھی کا پہرے دار بانپتا کانپتا روتا چلاتا بھاگا چلا آ رہا تھا۔

آفس میں گھس کر اس نے نمبردار کے پیر پکڑ کر کہا:

Scanned with CamScanner

"نمبردار جی، نیلا گڑھی میں آ گیا ہے۔ بڑی بہو کے کمرے پہ ٹکر مار رہا ہے۔ پرتاپ بھیا اور بچے بھی کمرے ہی میں ہیں۔"

باہر سے کلکٹر کا باڈی گارڈ ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"شہر سے وائرلیس میسج آیا ہے کہ وہاں وہی واردات ہو گئی ہے۔"

کلکٹر اور ایس پی شہر روانہ ہونے سے پہلے تھانا انچارج کو نیلا مارنے کا اجازت نامہ اور ضروری ہدایتیں دے گئے۔ وہ جیپ پر چڑھتے چڑھتے وعدہ کر گئے کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر پولیس کی مزید ٹکڑیاں بھیج دیں گے۔

ٹھاکر صاحب کے سینے میں پنکھے چل رہے تھے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ کانپتے ہوئے قدموں سے جیپ پر چڑھے اور چند ہی منٹوں میں، لیکن اپنے حساب سے کئی گھنٹوں میں، دیہات پہنچ پائے۔ گڑھی کے سامنے چھٹکی کا جھونپڑا چڑیا کے گھونسلے کی طرح الجھا الجھا پڑا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ دہشت زدہ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ جھونپڑے کے باہر چھٹکی کی کھوندی ہوئی لاش پڑی تھی۔ بچے کمرے میں بند تھے۔ اور پرتاپ اور بڑی بہو گڑھی کے دروازے کی سلاخوں سے لگے کھڑے کانپ رہے تھے۔ نیلے کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

"وہ ہمارے دروازے پر ٹکریں مار مار کر لہولہان ہو گیا تھا۔ دروازہ بہت مضبوط تھا، ٹوٹا نہیں۔ وہ گڑھی میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ شاید آپ کو ہی تلاش کر رہا تھا۔ چاروں طرف سے اس پر یورش ہے، بس آپ کو ہی اپنی پناہ سمجھتا ہے..." پرتاب نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا۔

"جیسے ہی وہ گڑھی سے باہر نکلا ہم نے کمرے سے نکل کر گڑھی کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ چھٹکی کے جھونپڑے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا..." بڑی بہو کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

پھر اس نے ڈر سے کانپتے ہوئے، شرم سے آنکھیں جھکائے ہوئے بتایا، "اپنے جھونپڑے میں چھٹکی ہر مہینے کپڑے کے چیتھڑے اڑس دیتی تھی۔ جیسے ہی وہ اس دفعہ کے چیتھڑے اڑس کر مڑی، نیلا پیچھے کھڑا تھا۔ وہ چیخ کر جھونپڑے میں گھس گئی اور ٹٹر بند کر لیا۔ نیلے نے گردن اٹھا کر ان چیتھڑوں کو سونگھا اور انھیں سونگھتے ہی دو پیروں پر کھڑے ہو کر دیوانوں کی طرح زمین پر لوٹیں لگانے لگا..." بڑی بہو بیان کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

تب پرتاپ نے واقعہ بیان کرنا شروع کیا، "پھر وہ اٹھا اور پیروں پر کھڑا ہو کر کسی ان دیکھے انسان سے لڑنے لگا جیسے کسی پر قابو پانا چاہتا ہو... پھر اس نے چھٹکی کی چیخیں سنیں۔ اس نے سینگوں کے ایک ہی ریلے میں ٹٹر توڑ دیا اور اگلی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر چھٹکی کو کھوندنا شروع کر دیا۔ جب وہ بے دم ہو کر گر پڑی تو نیلے نے چھپر کا تنکا تنکا الگ کر دیا..." پرتاپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جو مسلسل بہہ رہے تھے، مگر بیان کے زور میں وہ انھیں پونچھنا بھی بھول گیا۔

انچارج نے چھٹکی کی لاش کا پنچ نامہ کرایا اور شہر روانہ کر دیا۔ انچارج نے ٹھاکر صاحب کے پاس آ کر سرگوشی کی، "وہ آپ ہی کی چاہ میں ہے۔ شاید آپ کے قابو آ سکے۔ ویسے تو اب اسے مارنے کا اجازت نامہ بھی میرے پاس موجود ہے..."

کھیتوں کی طرف سے ہیڈماسٹر دوڑتے ہوئے آئے اور بتایا کہ انھوں نے ابھی ابھی نیلے کو مندر والے کھیت میں گھستے دیکھا ہے۔

پولیس کی کئی جیپیں رکیں۔ شہر سے کمک آ گئی تھی۔

ٹھاکر اودل سنگھ نے سوچا، اس بیچ نیلے کو اپنی غذا کہیں نہیں ملی ہو گی اسی لیے وہ مندر والے ارہر کے کھیت میں چلا گیا ہے۔ وہاں اب بھی ناج گڑ اور بادام رکھے ہوں گے اور ناند میں پانی بھی بھرا ہو گا... اور وہاں کوئی آدمی بھی نہیں ہو گا...

تھانا انچارج نے گالیاں دے دے کر گاؤں کے مردوں کو ان کے گھروں سے نکالا... سب اس بات پر راضی ہو پائے کہ ارہر کے کھیت تک ٹھاکر اودل سنگھ بھی جائیں گے۔

"کیا میں اسے مرتا ہوا دیکھ سکوں گا؟" ٹھاکر اودل سنگھ نے اپنے دل سے پوچھا۔ ان کے دل نے جواب دیا کہ شہر میں نئے طریقے کے لاکر آ گئے ہیں... انھوں نے کھیت پر جانے کی حامی بھر لی۔

تھانا انچارج نے سپاہیوں کو گاؤں کے چاروں طرف بندوقیں لے کر کھڑا کر دیا اور مختلف ہدایتیں دے کر سب کے مورچے درست کرائے۔

لاٹھی، ڈنڈا، سانٹھا، جو جس کے ہاتھ آیا لے کر ارہر کے کھیت کی طرف چلا...

"تم دونوں بچوں کو لے کر اپنے کمرے میں بند ہو جاؤ، مگر گڑھی کا دروازہ کھلا رکھنا... شاید وہ بھاگ کر ادھر ہی آئے۔ اگر وہ گڑھی میں آیا تو میں دروازہ بند کر کے رام کر لوں گا،" ٹھاکر صاحب

Scanned with CamScanner

نے پرتاپ اور بڑی بہو کو ہدایت کی۔

۱۷

ہانکا ہونے کے بعد ارہر کے کھیت سے نکلتے ہی تھوتھنی اور سر پر لاٹھیاں اور ڈنڈے لگاتار پڑے۔ سیاہ بدن پر جگہ جگہ خون اُبل رہا تھا۔ وہ بھاگا۔ اس کی ایک آنکھ بھی زخمی ہو گئی تھی اسی لیے وہ ٹیڑھا ٹیڑھا بھاگ رہا تھا۔ ٹھاکر اودل سنگھ اسے گاؤں کی طرف بھاگتا دیکھ کر پوکھر والے راستے سے تیزی کے ساتھ گڑھی کی طرف بڑھے۔ لاٹھیاں لیے بھوم لمبے والے راستے سے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ نیلے نے چہرے سے بہتے ہوئے خون کی چادر کے پیچھے سے کچھ اجنبی شکلوں کو گاؤں کی سرحد پر دیکھا۔ اس نے کاوا کاٹا اور گڑھی کے پیچھے والے راستے یعنی ٹوٹی ہوئی دیوار سے داخل ہوا اور گڑھی کے صحن میں آ گیا۔ پرتاپ اور بڑی بہو بچوں کو کمرے کے اندر کر کے خود باہر کھڑے تھے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے رستے سے آ جائے گا۔ دونوں بجلی کی سی تیزی سے کمرے کی طرف بھاگے جس کے دروازے میں بچے کھڑے دیوانوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ بڑی بہو کا پیر ساڑی میں اٹکا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ پیچھے سے آتا ہوا پرتاپ اس سے ٹکرایا اور رک گیا۔ بہو کمرے کے اندر داخل ہو چکی تھی اور پرتاپ نیلے کے سینگوں سے اُلجھا ہوا تھا۔ بڑی بہو اضطراری طور پر کمرے سے باہر آئی تو بچے بھی ماں سے لپٹ کر باہر آ گئے۔ وہ گھوم کر بچوں کو پکڑ کر کمرے میں بھاگی۔ مڑی تو دیکھا کہ نیلا اپنی پچھلی ٹانگوں پہ کھڑا ہوا اگلے کھُروں سے پرتاپ کا سر پاش پاش کر چکا ہے۔ جب دُھول کچھ کم ہوئی تو بڑی بہو نے حیران حیران خالی خالی آنکھوں سے دیکھا کہ پرتاپ زمین پر پرانے لحاف کی طرح اُدھڑا پڑا ہے اور نیلا خون کی دھاریوں کے پیچھے سے اپنی آنکھوں کو پٹ پٹ کھول رہا ہے، بند کر رہا ہے اور پرتاپ کی لاش کے چاروں طرف ٹکراتا، الجھتا، لڑکھڑاتا ہوا چکر لگا رہا ہے، اور گڑھی کے دروازے سے نمبردار اودل سنگھ دیوانوں کی طرح چیختے چلاتے داخل ہو رہے ہیں۔

اسے بہت دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ایک آنکھ شاید بالکل ختم ہو گئی تھی اور دوسری

Scanned with CamScanner

سر سے بہنے والے خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔

نیلے نے خون سے لتھڑی آنکھیں پٹ پٹائیں، اتنے زور سے سانس بھری کہ اس حصے کی مٹی اُڑنے لگی، گردن کو جھٹکا دیا، دُم کو گردش دی اور سینگوں کو آگے کر کے پوری طاقت سے اُس آدمی سے ٹکرا کر دیوار تک روندتا چلا گیا۔ جب دیوار سے اس آدمی کا سر ٹکرا گیا تو سینگوں کو گھونپ گھونپ کر اس کی آنتیں نکال کر اپنے کھُروں سے کھوندتا رہا اور پھر وہاں کسی کو نہ پا کر ٹوٹی ہوئی دیوار کے راستے کو یاد کے سہارے تلاش کرتا ہوا گڑھی سے باہر نکل گیا۔

بڑی بہو اپنے بچوں کو لے کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکلی اور پرتاپ اور بابو جی کی لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر بچوں کو مضبوطی سے پکڑا اور آسمان کی طرف دیکھا۔

پولیس کی ٹکڑیاں اور گاؤں کا مجمع گڑھی کے دروازے پر اکٹھا ہو گیا تھا۔ انھیں علم نہیں تھا کہ اندر کیا ہوا۔ انھیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ نیلا پیچھے والے راستے سے نکل کر، تالاب پار کرتا ہوا، خون کی چپچپاہٹ سے بند ہوتی آنکھیں دھوتا ہوا زخمی حالت میں کدھر بھاگا ہے۔

پھر سب کو اس بات کی خبر ہوئی کہ زخمی، اندھا اور پاگل نیلا غائب ہو گیا ہے۔

تھانے دار نے تھکے تھکے ہاتھوں سے رائفل خالی کی اور سوچا کہ کیوں کہ وہ زخمی ہے اس لیے کہیں بھی مر سکتا ہے۔

گڑھی کے کچے صحن پہ ننگے پاؤں کھڑی بڑی بہو نے دونوں بچوں کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے، آنکھیں بند کیے، دل کڑا کر کے سوچا کہ کیوں کہ وہ اندھا ہے اس لیے اب کسی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔

بوڑھے ہیڈ ماسٹر نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو چھپایا اور سوچا کہ وہ پاگل ہے اس لیے کبھی بھی حملہ کر سکتا ہے۔ اور کیوں کہ وہ غائب ہے اس لیے کسی بھی گلی کو پار کرتے ہوئے، کسی بھی کھیت کی طرف جاتے ہوئے اور کسی بھی راستے پہ چلتے ہوئے اچانک بالکل سامنے، بالکل قریب کھڑا نظر آ سکتا ہے ـــ سینگ آگے کیے، سر نیوڑھائے اور اگلے کھُر فضا میں بلند کیے...

لیکن کسی کو بھی یہ سوچنے کی سکت نہیں تھی کہ نیلا گاؤں میں ہی ہے یا گاؤں کے پاس کسی کھیت میں چھپا ہوا ہے یا گاؤں کی سرحد سے دور قصبے تک پہنچ گیا ہے یا قصبے سے بھی آگے خون کے چھینٹے اڑاتا شہر کی طرف بھاگ رہا ہے یا اس سے بھی آگے...

**

Scanned with CamScanner

اسد محمد خاں

سارنگ

نو عمر گریجانند گنیش نے پلے والا بٹن دبا دیا، سونڈ پھیلا کر آسائش کی سانس لی اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سامنے اسکرین پر جما دیں۔ دیولوک کے وشنو نرسری اینڈ کِنڈر گارٹن وِدّیالئے کا گرُڈ آنے میں ابھی دیری تھی۔ لنچ بکس کا ڈھکنا کھولنے اور دو چار مَودک ــــ لڈّو ــــ پیٹ لینے میں کیا لگتا، مگر گنپتی گنیش کو یاد آیا کہ مَما قالین پر پڑے فُوڈ کرَمبز دیکھ کے چڑ جاتی ہے، "کھامکھا میں یَل کرے گی وہ۔" اس نے ڈھکن لگا لنچ بکس توند پر سے پھسلا دیا اور اپنی چھوٹی آنکھیں اور چھاج ایسے کان پھر سے اسکرین کی اور کر لیے۔

فرش کے بیچوں بیچ ایک گدا پڑا تھا۔ کونے میں ایک مٹکا اور مٹی کا پیالہ دھرا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا، پر سلاخیں لگے اونچے روشن دان سے اندر کچھ اُجالا پہنچ رہا تھا۔ گدّے پر ایک یُووک پڑا آرام کرتا تھا۔

دیکھتے دیکھتے یُووک کسمسایا اور کروٹ بدل کے اٹھ بیٹھا۔ سر جھٹک کے اس نے جماہی لی اور گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ "ہے ماں! یہ کون جگہ ہے؟"

اس کی ماں وہاں نہیں تھی۔ کوئی بھی نہیں تھا جو جواب دیتا۔ یُووک تیزی سے روشن دان

Scanned with CamScanner

والی دیوار تک گیا۔ دیوار پر ہتھیلیاں ٹکا کر اس نے سر اٹھایا۔ دھیمے اجالے کے اس ماخذ کو دیکھا اور چیخ کے بولا، "کوئی ہے؟ ارے کوئی ہے؟" پھر بڑبڑایا، "کوئی بولتا ہی نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ پھر چیخا، "یہ کون جگہ ہے بھائی! بتاتے کیوں نہیں؟" کہیں سے کوئی آواز نہ آئی تو وہ گدّے پہ آ بیٹھا اور اپنی جانگھ کھجانے لگا۔

اسے کھجاتا دیکھ کے گجانن گنیش کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ اپنی ران پر سونڈ مار کے چنگھاڑا۔ کہیں سے عورت کی آواز آئی، "کیا بات ہے؟ گجانن!"

"کچھ نہیں ماں! کچھ بھی تو نہیں۔"

پکارنے والی اُما تھی، شیو اردھانگی، ماں پاروتی۔

یُووک نے جانگھ کھجانی بند کر دی۔ وہ اٹھ کے مٹکے تک گیا، پانی پی کے پھر گدّے پہ آ لیٹا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔

گریجانند گنیش نے سونڈ سے اپنی توند سہلائی اور بڑبڑایا، "بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔"

تھوڑی ہی دیر پہلے اس نے بھاری ناشتا کیا تھا۔

یُووک کچھ دیر کو سو گیا، پھر جو اٹھا تو دن نکلنے والا تھا۔ روشن دان اور زیادہ اُجل گیا تھا۔ باہر سے کسی گاڑی کے بار بار سلف اٹھانے کی آواز آ رہی تھی، انجن اسٹارٹ نہیں ہو پاتا تھا۔ بیٹری کم زور ہو گی۔

گنیش نے کان لگا کے سنا۔ یہ وِدیالئے کا گرُڈ نہیں ہو سکتا۔ اس کے آنے میں ابھی دیر ہے۔ ٹھیک ہے نا۔ گاڑی کی آواز تو اسکرین سے آ رہی ہے۔ اس نے پھر آنکھیں جما دیں۔

Scanned with CamScanner

صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام ہو گئی، کوئی نہ آیا۔ بہت بھوک ستاتی تو یُووک اٹھ کے پانی پی لیتا، مگر خالی پیٹ تو پانی بھی تکلیف پہنچانے لگا تھا۔ یُووک کی بپتا بڑھتی جا رہی تھی۔

گنپتی گنیش نے جماہی لی اور سوفے کی پشت پر اپنا بازو پھیلا دیا۔ سوفہ چرچرا گیا۔

اچانک ہی یُووک کے سرہانے کوئی چیز آ گری۔ اس نے پہلے پہل توجہ نہ دی، پڑا رہا۔ پھر کچھ گرا۔ بہت ہلکی آواز تھی، شیشے کی کھنک جیسی۔ یُووک نے سر گھما کے دیکھا۔ فرش پر سرخ شیشے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ یہ کہاں سے آئے؟ اس نے سر اٹھایا، روشن دان سے اس کے دیکھتے دیکھتے چوڑی کا ایک اور ٹکڑا گرا۔ اُدھر کوئی ہے جو اشارہ دے رہا ہے۔ اس نے گدّے سے اٹھ دیوار سے کان لگا دیے۔ ایک اور ٹکڑا گرا۔ اس نے دیوار پر تھپکی دی، جواب میں دوسری طرف بھی کسی نے ہاتھ مارا۔ آواز ہلکی تھی۔

آواز گنیش نے نہیں سنی مگر اس کی دل چسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے پہلو بدلا۔ سوفہ پھر چرچرایا۔

یُووک نے کھڑے ہو کے روشن دان کی طرف مُنہ کیا اور بولا، "کون ہے؟ ارے، کون ہے اُدھر؟" کوئی جواب نہ آیا۔ آہٹ بھی سنائی نہ دی۔ یُووک نے دیوار پر پھر ہاتھ مارا۔ اُدھر سے بھی دیوار تھپکی گئی۔ یہ آواز بہت صاف تھی۔

"جے پربھو!" گجانن گنیش نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ دوسری طرف بھی کوئی ہے۔

یُووک نے پوچھا، "کون ہو تم؟"

Scanned with CamScanner

کسی نے سرگوشی کی، "سور نہیں کرو... آہستے بات کرو،" یہ لڑکی کی آواز تھی۔
ہے مالک! روشن دان کے پار سے لڑکی بات کرتی ہے!
"کون ہو تم؟" یُووک نے پھر پوچھا۔
لڑکی نے کچھ کہا جو کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔
"پھر سے کہو۔ کیا کہہ رہی ہو؟"
"مَیں ہوں۔ اِدھر اِن کا کھانا بناتی ہوں۔"
یُووک کھانے کا سن کے نہال ہو گیا۔ "میں بھوکا ہوں۔"
"مجھے کھبر ہے۔"
"کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟" یُووک نے التجا کی، "ذرا دیکھ کے بتاؤ۔"
"مُسکل ہے۔ کھیں آ جا نہیں سکتی،" وہ بولی۔ "مجھے بھی تالے میں رکھتے ہیں۔ جب کھانا بنانا ہوتا ہے یا جب جرورت ہوتی ہے میری، تب لے جاتے ہیں۔"
"ضرورت؟ کیسی ضرورت؟"
"رَتی کِریا کے باسطے۔"
لڑکی کے مُنہ سے اتنے کھُلے پن سے کہی گئی یہ بات یُووک کو بُری لگی تھی۔ وہ چپ رہا۔ لڑکی نے سنکوچ سے کہا، "کچھ کھانے بِنا تمھیں بڑا ٹیم گجر گیا۔ ہاں نا؟"
"ہُوں۔"
"دیکھو، پکا نہیں کہتی، پر سبیرے تمہارے باسطے کچھ لاؤں گی۔ کوسِس کروں گی۔"
"سویرے؟ کل نا؟"
"ہاں۔"
وہ بڑبڑایا، "صبح میں ابھی بہت دیر ہے۔"
"ہُوں۔"
"یہ تو بتاؤ، یہ جگہ کیا ہے؟"
"کارکھانہ ہے۔"
"وہ تو ہے۔ دھام کون سا ہے؟"

Scanned with CamScanner

"خبر نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد یُووک نے پوچھا، "اے! تمھیں کہاں سے لائے ہیں؟"

"خبر نہیں۔"

"کیوں لائے ہیں تمھیں؟"

"بتلا تو دیا... کھانا بنواتے ہیں اور رتی..."

"اچھا اچھا،" یُووک نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔ "وہ تم سے کوئی بات چیت نہیں کرتے؟"

"کرتے ہیں، پر کم کم۔"

"ان سے پوچھنا۔ یہاں سے کہاں لے جائیں گے تمھیں ــــ اور مجھے"

"نہیں بتائیں گے۔ مجھے ماریں گے۔"

"مارتے ہیں؟ کیوں؟"

"چُپ! کوئی آرہا ہے۔"

دوسرے کمرے کا دروازہ کُھلا ہو گا۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ بہ مشکل سنائی دی۔ اُدھر کسی مرد نے دھیرے سے کچھ کہا۔ لڑکی نے اونچی آواز میں پوچھا، "کیا ہے رے؟"

مرد کی آواز آئی، گھُوں گھُوں گھُوں۔

"پر کیوں؟" لڑکی نے بگڑے تیوروں سے پوچھا۔

چٹاخ سے طمانچہ پڑا۔ یُووک چونک گیا۔ اس کے سیدھے ہاتھ نے دیوار پر گھونسا بنا لیا تھا۔ دوسری طرف سے اب ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے ہاتھا پائی ہو رہی ہو۔ کپڑے پھٹنے کا چرّاٹا سنائی دیا اور لڑکی کی دبی ہوئی چیخ۔ یوں لگا جیسے اُسے فرش پر گھسیٹا جا رہا ہو۔ کوئی دروازہ کہیں زور سے بند ہوا اور پھر سناٹا۔

یُووک روشن دان کی طرف مُنہ اٹھائے یہ آوازیں سنتا رہا تھا۔ اُس کی گردن اکڑ گئی، جسے سہلاتا ہوا وہ گدّے پہ آن لیٹا اور آنکھیں بند کر کے کھانوں کے خواب دیکھنے لگا۔

گریجانند گنیش توند پر سونڈ پھسلاتے ہوئے میٹھے مہکتے مودک کے بارے

Scanned with CamScanner

میں سوچ رہا تھا جو پلاسٹک کے شوخ رنگ لنچ بکس میں رکھے تھے۔ وہ گوسوامی تُلسی کی لکھی اِستُوتی گنگنانے لگا جس میں خود اُس کی مَیّا کا گُن گان کیا گیا تھا اور اِن لڈّوؤں کا ذکر تھا: مَودک پریہ مُد منگل داتا، مَودک پریہ۔ مگر فوراً ہی اُسے خیال آیا کی وہ بھدّی آواز میں گنگنا رہا ہے۔ وہ چپ ہو گیا۔

یُووک کتنی ہی بار سویا اور جاگا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ اندر دھوپ چلی آ رہی تھی۔ کوئی چیز (نرم اور گرم) روشن دان کے رستے یُووک پہ آ گری۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ سمجھا ہو گا کوئی جانور گرا ہے، مگر دوسری طرف سے دیوار پہ ہاتھ مار کے لڑکی نے پوچھا، "مل گیا؟"

یُووک نے سامنے پڑی چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ اُبلا ہوا آلو تھا، خوب گرم۔ اُس نے چھیلنے کا بھی کشٹ نہ کیا، کھانے لگا۔

شاید اُس کا مُنھ جلا ہو گا تو یُووک نے تکلیف کی آواز نکالی۔

لڑکی سمجھ کے ہنسنے لگی، بولی، "ہُسیاری سے کھا رے، گرم ہے۔"

"کِرپا تمھاری، بڑی بڑی مہربانی۔"

"یہ اَور لے،" ایک اور آلو پھینکا گیا جو واپس اُدھر ہی گر گیا۔

لڑکی خوش دلی سے ہنسی۔ "ٹھیر۔ پھر پھینکتی ہوں۔" اِس بار آلو سیدھا گدّے پہ آن گرا۔ وہ بولی، "پیٹ تو نہیں بھرے گا تیرا۔ پر پانی پینے جوگا ہو جائے گا۔"

"نہیں ٹھیک ہے،" یُووک نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

"سُنو!" دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔ دونوں ہی ہنس پڑے۔

کچھ پیٹ میں پڑا تھا تو یُووک ہنسنے جیسا ہو گیا تھا۔ بولا، "نام کیا ہے تمھارا؟"

"رُوپکا۔"

"اَہو!" یُووک نے حیرت کی آواز نکالی۔

"کیا ہوا؟"

"میرا نام رُوپ ہے۔"

"اررے! اچنبھے کی بات ہے — ہے نا؟"

"پر ٹھیک ہے،" یُووک نے بات بڑھائی، "کوئی اتنی انوکھی بھی نہیں۔ میں رُوپ، تم رُوپکا۔" یہ کہہ کے وہ ہنسنے لگا۔

"کے تُو!" ماں پاروَتی کی دُلار سے بھری آواز آئی۔ کے تُو رے! جا تیرا گرُڈ آگیا۔ جا، دیر نہ کر۔" آج پاروَتی نے گریجانند کو کیتُو کہہ کے بلایا تھا ___ میرا دُم دار تارا! میری روشنی!

"ہہ!" گنپتی بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر گرُڈ رکا ہوا تھا۔ اس کی سَن سَن سنائی دے رہی تھی۔ گنپتی گریجانند لنچ بکس اٹھا کے بھاگا۔ مَودک سَرِیہ مُد منگل دا تا!... مَودک سرِیہ مُد منگل... اور تو اور، جلدی میں اس نے اسٹاپ والا بٹن بھی نہیں دبایا تھا۔

آوازیں سنیں تو جگت ماتا پاروَتی ٹہلتی ہوئی آ گئی۔ وِدّیالئے کا گرُڈ گجانن کو لے کے جا چکا تھا، اب کام کوئی نہیں تھا۔ گریجا ماں اسکرین کے سامنے سوفے پر آن بیٹھی۔

"رُوپکا!"
"رُوپ! ___ ہاں رے؟" لڑکی کی آواز اب بہت سُرسَ تھی۔
"مَیں سمجھا تم چلی گئیں۔"
"اب نہیں جاتی۔ اب کہیں نہیں جاتی۔ سُنا تو نے؟"
"ہُوں"
"اور یہ بھی سُن لے۔ مَیں آؤں گی۔ اُدھر تیرے پاس ہی آؤں گی۔"

ماں پاروَتی نے لمبی پتلی انگلیوں سے اپنے رخسار چھوئے جو مہیشوَر شِو شنکر کے خیال سے گلابی ہوئے جلتے تھے اور تپ رہے تھے۔ جے اُماوَر!
جے دِگمبر! جے مہیشوَر!

Scanned with CamScanner

"ایسے کیوں ہنستی ہو؟"

"تیری عُمر کتنی ہے؟"

"اٹھارہ کا ہوں۔"

"چھوٹا ہے نا۔"

"چھوٹا؟ تم کتنی بڑی ہو؟"

مہیشی کا دھیان اُدھر نہیں تھا۔ یُووک اور کماری پہلے کچھ ایسا کہہ گئے تھے جو اس نے سُنا نہیں تھا، یا سُنا ہو گا تو دھیان نہیں دیا۔ وہ سوچنے لگی، پلٹ کے سُن لوں۔ پر ایسا بھی کیا ہو گا۔ اُما اب سیدھی ہو بیٹھی۔ کماری سے یُووک اُس کی عُمر پوچھتا تھا۔

"سترہ برس کی ہوں میں، مگر..."

"اگر مگر کیا؟ چھوٹی ہو مجھ سے۔"

"میں نہیں، تُو چھوٹا ہے۔ ابھی کچھ دیکھا ہی نہیں تُو نے"۔

یُووک چڑ گیا۔ کہنے لگا، "تم نے ایسا کیا دیکھ لیا؟"

دیوار کی اوٹ سے آتی آواز میں دُکھ بھر گیا۔ "بہت کچھ... جو تُو دیکھ سہہ لیتا تو چودھے برس کی عُمر میں ایک دم بڑھ جاتا ــــ ایک ہی راتری میں۔"

"ایک ہی... رات... میں۔" یُووک نے ٹھہر ٹھہر کے دُہرایا۔

دیوار کے پار اب وہ سسکیاں لیتی تھی۔ "وہ اٹھانے آئے تھے مجھے۔ مَیں پُکاری، بچاؤ، مجھے بچاؤ! کوئی ایک نہیں بولا۔ کوئی آگے نہیں آیا۔"

یُووک نے افسوس کی آواز نکالی، کہا کچھ نہیں۔

اب جو وہ بولی تو آواز میں ایک ذرا ٹھیراؤ تھا۔ "یہاں اِس وَکت جتنے ہیں، سب کی روٹی بناتی ہوں، چِیرے دھوتی سُکھاتی ہوں۔ روج رات میں دن میں، جبی مَرجی ہو، کھینچے لے جاتے ہیں۔ تین برس سے ایسا ہی ہے۔ اِن سے پہلے دوسرے تھے۔ اُن سے پہلے دوسرے ــــ سب

سکتی مان، سبھی تاکت بَر۔ جب تک جی کرتا ہے رکھتے ہیں۔ جی بھر جاتا ہے، کسی اور کے ساتھ ہنکا دیتے ہیں۔" وہ روئے جا رہی تھی۔

یہ کیا کر دیا میں نے؟ یُووک دیوار سے لگا بیٹھا دُبدھا میں سر جھٹکتا تھا ـــــ چپ رہوں یا دلاسا دوں اِسے؟

وہ خود ہی چپ ہو گئی۔

یُووک دھیرے سے بولا، "دُکھ ہوا سب سُن کے۔"

لڑکی کی آواز میں چمک تھی۔ "ارے سب چلتا ہے۔ تو دُکھی مت ہو۔ سال پیچھے سنا کے روئی ہوں۔" اُس نے ہنسنے کی بھی کوشش کی تھی۔

"سال پیچھے کسے سنایا تھا؟"

"دیباروں کو۔"

یُووک چُپ ہو گیا۔

لڑکی نے آواز دی، "رُوپ! ـــــ رُوپمان!"

"ہُوں۔"

"کوئی بات کر۔"

"بات؟ ـــــ میں یہ بات بھولوں گا نہیں، جو تُو نے کہی، بھولوں گا نہیں۔"

"کون بات؟"

"کہ رُوپکا کشٹ جھیلتی ہے، مصیبت میں ہے۔"

"مصیبت تو رُوپمان اتنی دیر کی تھی، جتنی دیری تجھے سنایا۔ اب ٹھیک ہوں، پروا نہیں ـــــ پکی ہو گئی ہوں۔ اِن چنڈالوں سے بدلہ بھی چکا لیتی ہوں اب تو۔"

"بدلہ؟ وہ کیسے؟"

"ابھی دو کو لڑا دیا نا۔ ایک نے ایک کے چُھری مار دی۔ گاڑی اِدھر تجھے لے کے آئی، اُدھر اُسے لے گئی۔ بچے گا نہیں۔ گردن کی نَڑی کٹ گئی ہے۔"

"کس طرح لڑا دیا؟"

"بس ـــــ لڑا دیا۔"

Scanned with CamScanner

"بتاؤ نا، کیسے؟ کیا کیا تم نے؟"

"نہیں بتاؤں گی۔"

"رُوپکا! یہ کیا بات ہوئی؟ بھلا دوست نہیں ہیں ہم؟"

"دوس؟ ـــــ دوس کا تو پتا نہیں... پر بتاؤں گی نہیں۔ بڑی بے شرمی کی بات ہے۔ تجھے تو بالکل نہیں بتانے کی۔"

"اچھا۔ رہنے دو پھر۔"

"بُرا کیوں مناتا ہے؟ ـــــ بس نا، کھتم کر۔"

"ہاں۔ ختم کر دیا۔ پر ایک بات ہے۔"

"کیا؟"

"اُنھیں پتا چل گیا کہ وہ رُوپکا کی وجہ سے جھگڑے ہیں تو بُرا حال کریں گے تمھارا۔"

"اور کیا برا کریں گے چنڈال؟ ویسے کسی کو مالُم نہیں ہوئے گا کی جھگڑا کیسے، کس وَجے سے ہوا۔"

"وہ پوچھ لیں گے۔ ایک تو زندہ بچا ہو گا۔ وہ جس نے مارا ہے۔"

"وووہ نہیں بتائے گا۔ کوئی مَرد ایسی بات نہیں بتاتا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے بات وہ کھی کی دونوں لڑ پڑے، پر ایک نے دوسرے کو بتائی نہیں۔ چُپ کی ـــــ کھاموسی کی بات ہے۔"

"خبر نہیں کیا کہہ رہی ہے!"

"اسی لیے کہا تھا ابھی تُو چھوٹا ہے۔"

"چل پھر وہی مت شروع کر ـــــ جا سو جا۔"

"کھفا ہو گیا؟"

"نہیں نہیں، سوچتا ہوں تُو پھر نہ رونے لگے۔ اب سو جا۔ میں تھک گیا ہوں۔"

"ہاں۔ تھک گیا ہے تو سو جا ـــــ دوس!"

"دیکھا! آخر تُو نے دوست کہا نا مجھے۔"

Scanned with CamScanner

لڑکی دیوار کے پار سے ایسے ہنسی کہ یُووک کی کوٹھری میں بسنت آ گئی۔

"دیکھا؟ دوست بنا لیا تجھے۔ مجھے دوست کہا نا تُو نے،" یُووک اِترا کے بولا۔ وہ پھر ہنسی۔ "وہ تو ایسے ہی کہہ رہی تھی ــــ جُھووو ٹھ۔"

ماں جگدمبے نے سیس کا چندر کرن پُشپ اُتارا اور رُو پکا کی اور پھینک دیا۔

"یہ کیا تھا؟"

"کیا؟" وہ کِھلکھلا کے بولی۔

"جو ابھی دیوار کے پار تیری طرف گیا؟"

"چندر کرن پُشپ۔ یہ تُو نے پھینکا ہے نا؟"

"میں نے؟ ــــ نہیں تو۔"

"جیادہ مت اِتراوَ، جُھوٹھے!"

شیو اَردھانگی پاروتی ایک مَند مُسکان لیے اسکرین پر نظر ڈالتی رسوئی میں چلی گئی۔ یہاں بہت کچھ ہوتا رہا۔

یُووک پوچھ رہا تھا، "کیا بازار جا رہی ہے؟"

لڑکی بولی، "ہاں بزار لے جا رہے ہیں سُسرے۔ ناج، مسالے کھتم ہو گئے۔"

"اچھا ہے، چلی جا۔ جتنی دیر یہاں سے دور رہے، اچھا ہے۔"

"دیر دُور کیسا۔ اِدھر سے دُور اب نہیں رہنا۔ اور جو بزریا جاوُں گی تو تُو بھی سنگ ہوے گا میرے۔"

"وہ کیسے؟"

"پیا میں ــــ پیا سَرتا ہے؟ ــــ ہِردئے، دِل۔"

یُووک ہنس پڑا، "آہ!"

"ہنستا کیوں ہے؟ ایتبار نہیں؟"

"ہے۔ اعتبار ہے۔ اچھا بتا کیا لائے گی؟ میرے لیے بازار سے کیا لائے گی؟"

لڑکی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی، "سارنگ۔"

"سارنگ کیا؟"

وہ بولی، "سب چیج۔"

"کیا سب چیز؟"

"سُن ـــ سارنگ بولتے ہیں جب کسی اپنے کو کچھ دنیا ہووے اور سمَز نہیں آوے کی کیا دے۔ جی کرے اِس دُنیا سنسار کی، برہمانڈ کی سبھی چیج دے دیو۔ تبھی بولتے ہیں کی تیرے لیے سارنگ لاؤں گی۔"

"اچھا۔ پر یہ سارنگ ہوتا کیا ہے؟ چیز کیا ہے؟"

لڑکی بولی، "سب چیج! کمَل کا پھول سارنگ۔ کاجل، کپڑا، موتی، سونا، چراگ دِیوا، یہ سب سارنگ۔ باج، بنس، مور، گھوڑا سبھی سارنگ اور جیسا تُو ہے باگھ، سیر ـــ تو تُو بھی سارنگ۔ تال، سنکھ، پپیہا، ہرنی، کویل ـــ آے آے! تیرے کو کویل لادوں؟ کُواُو، کُواُو ـــ ہاں؟"

"باولی ہے تُو تو۔"

"ابھی سُن نا۔ سارنگ بولتے ہیں رات کو، چندرما کو، سُوریہ کو، جَمِین کو، بھنورے کو، اور آکاس کو، کبوتر کو، بل کو، راجے کو، سِر کے چھتر کو اور تیرے چرن لگانے چندل کو۔"

"چندل؟"

"ارے ہاں نا۔ جسے صندل بولتے ہیں اور چڑیا بھی سارنگ ہے اور عورت بھی ـــ عورت چیتے تیرے کو؟"

"ایک دم مَستک اُلٹ گیا ہے تیرا!"

لڑکی رو پڑی۔ "ہاں رے رُوپ! مہادیو میرا ساکشی۔ تُو نے تو میرا مَستک ہی اُلٹ دیا رے۔"

اور ٹھیک اُسی وقت ایک بھیانک گتی سنائی دی۔ مہادیو کا ڈمرُو بجتا تھا۔ ایک دامِنی کے شکارے میں یُووک اور کماری کے بیچ کی دیوار ڈھے گئی۔

کوٹھری میں پڑے (کتنی ہی رَتی کِریاؤں سے چکٹے) مَیلے کُچیلے گدّے پر باگھمبر بچھ گیا۔

جے ہو!

Scanned with CamScanner

رُوپ اور رُوپکا پہلی بار ایک دوسرے کے سامنے آئے۔

"تُو رُوپ ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"اور تم رُوپکا ــــ تم نِرملا ہو اور اُجولتا بھی۔"

"مَیں چنڈالوں کی رکھیل رُوپکا۔"

"تم ستیہ ہو، شِو اور سُندر بھی۔"

"میری جنگھاؤں کے بیچ اَپوتر آگ کی دلدل ہے۔"

یُووک نے اُس کے دونوں ٹخنوں کو چُھوا۔ "تم تجاوَنتی اور پوِتر ہو اور نِرمل بھی۔"

یُووک نے اُس کے مَستک کو ہاتھ لگایا۔ "جے ہو!"

لڑکی نے اُس کے چرَن تھام لیے۔

وہ اُسے باگھمبر پر لے آیا۔

کسی آخری نِرتیہ کے پچھواڑے، جہاں کچھ نہیں بچا تھا، زانیوں چنڈالوں کا رستا روکے ہوئے اب ایک نئی اور بے خوف زندگی سر اٹھا رہی تھی۔

رُوپ اور رُوپکا، کرونامَے گرِہاپتی مہیش کے باگھمبر پر تھے۔ دُنیا بھر کے مَسلے مَسلائے پٹے ہوئے یہ دِلت پُرش اور استری مَنتھن کرتے تھے۔ ان کی دھمنیوں میں گرِہاپتی مہیشوَر کے شوکت و جلال کا ڈمرُو بجتا تھا۔

**

رابندر ناتھ ٹیگور

انگریزی سے ترجمہ: حسن منظر

آرٹ کا مفہوم

اَتھروَوید میں ایک عجیب اشلوک ہے جو ہر اُس چیز کو جو انسانی دنیا میں عظیم ہے، "زائد" (superfluity) سے منسوب کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے:

رتم ستیم تپو راشٹرم سرمو دھرمس سکرک
بھُوتم بھوِشیت اُچیشٹے ویریم لکچھمی بلم بلے

(راست شعاری، سچائی، بڑی کاوشیں، فرماں روائی، مذہب، کارِ عظیم، دلیری اور تن آسودگی، ماضی اور مستقبل، سب بستے ہیں زائد کی قوتِ نہایت میں)

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنا اظہار بہتات کے ذریعے کرتا ہے جو اس کی ضرورتِ محض کو کم و بیش ڈھانپے ہوئے ہوتی ہے۔

ویدوں کے مشہور شارح ساین آچاریہ کہتے ہیں: چڑھاوے کا بھوجن جو بلیدان کی رسوم کے مکمل ہونے کے بعد بچ رہتا ہے، اس کا بکھان اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ برھما کی علامت ہے جو

کائنات کا اوّل منبع ہے۔

اس شرح کے مطابق برھما اپنی بہتات میں بے انت ہے جو لامحالہ اپنا اظہار کبھی ختم نہ ہونے والے دنیوی عمل میں کرتا رہتا ہے۔ یہاں ہمیں تخلیقِ کائنات کا قانون نظر آتا ہے، اور اسی لیے آرٹ کے آغاز کا بھی۔ دنیا کی تمام ذی روح مخلوقات میں انسان کے پاس اس کی حیاتی اور دماغی قوّت اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اور یہ قوّت اسے مختلف النوع تخلیقی کاموں پر، خود اُن کاموں کے لیے، اُکساتی ہے۔ خود برھما کی طرح وہ ایسی تخلیقات میں مسرت محسوس کرتا ہے جو اس کے اپنے لیے غیر ضروری ہیں، اور اس لیے اس کے اسراف کی علامت ہوتی ہیں نہ کہ آمدوخرچ برابر جیسی قلاشی کی۔ جو آواز محض کافی ہے، وہ جتنا روز کے استعمال کے لیے ضروری ہے بول سکتی ہے، رو سکتی ہے، لیکن جو آواز مالامال ہے وہ گاتی ہے اور اس میں ہمیں اپنی شادمانی ملتی ہے۔ آرٹ انسانی زندگی کی دولت کو ظاہر کرتا ہے جو اپنی آزادی کمال کو پہنچی ہوئی شکلوں میں ڈھونڈھتی ہے جو بذاتِ خود اپنی علّتِ غائی ہیں۔

جو کچھ بھی بے حرکت اور بے جان ہے، محض "ہونے" کی حقیقت تک محدود ہے۔ زندگی مستقل تخلیق کار ہے، کیوں کہ اپنے اندر وہ وہ بے چین "زائد" رکھتی ہے جو بغیر رُکے، فوری زمان ومکاں کی حد بندیوں کو اپنے بہاؤ میں پار کرتا، اپنی آگاہیِ وجود کے لیے، اپنے بوقلموں اظہار کی مہم میں لگا رہتا ہے۔ ہمارا زندہ جسد اپنے اندر وہ اعضار کھے ہوئے ہے جو اس کی کارگزاری کے لیے اہم ہیں، لیکن یہ جسم بہرحال معدے، دل، پھیپھڑوں اور دماغ رکھنے کی سہولت کے لیے ایک تھیلا ہی نہیں ہے؛ یہ جسم ایک تمثال ہے اور اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ اپنی شخصیت کا پتا دیتا ہے۔ اس میں رنگ ہے، وضع قطع ہے، حرکت ہے، جن کا بڑا حصّہ "زائد" کی ملکیت ہے اور جن کی ضرورت اپنے اظہار کے لیے ہے نہ کہ اپنی بقا کے لیے۔

تمام تخلیق کی نیو میں ایک سچائی ہے جو بظاہر لغو ہے ــــ ایک منطقی تخالف۔ اس کا عمل دو مخالف قوّتوں کی مسلسل مصالحت میں ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ "زائد" کا فطری اصرار، یعنی اُچھٹا، ہی ہر آمادہ بہ تکمیل عمل کی طاقتِ حرکی ہے۔ لیکن زائد کے اس بے حدود بہاؤ کو، خود کو ظاہر میں لانے کے لیے، اپنے آپ کو متناہیت کی حدود کے سپرد کرنا ہوتا ہے؛ سچ کے حقیقت میں منتقل ہونے کے لیے بے حدود کو حدود میں آنا پڑتا ہے۔ ہمارے سامنے ہر شے کے مبدا کے بارے میں

اُپنشد کے دو مخالف کتھن ہیں۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا ہے کہ آنندا دھیوا کھلویمانی بھوتانی جنتنے (کائنات مسرّت سے پیدا ہوئی ہے)؛ دوسری طرف وہ اشلوک ہے جو کہتا ہے: ساتاپو تپیتا سا تپستپتوا سروم اسرجنا یدا دِم کِنچا (برحما نے تپسیا کی، اور تپسیا سے جو گرمی پیدا ہوئی اس سے اُس نے ہر اُس کی تخلیق کی جو ہے)۔ مسرّت کی آزادی اور تپسیا کی بندش، دونوں ہی برحما کے تخلیقی اظہار میں مساوی طور سے سچ ہیں۔

یہ بےحدود کا حدود میں آنا فرد کا ہونا ہے۔ برحما جہاں تخلیق کرتا ہے، فرد ہے۔ جہاں وہ زیست کی اندرونی ضرورتیں صحیح وزن میں اور ہمیشگی کے لیے بہم پہنچاتا ہے، وہ شاعر ہے، دماغ کا بادشاہ، مطلق العنان طاقت اور خود کو تخلیق کرنے والا۔ وہ اپنے قانون کی حدود کو تسلیم کرتا ہے اور یوں کھیل چلتا رہتا ہے جو کہ یہ دنیا ہے، جس کی حقیقت اس کے اصل شخص (برحما) سے رشتے میں ہے۔ اشیا ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اپنی ماہیت میں نہیں، اپنے ظہور میں، بہ الفاظِ دیگر اپنے اس تعلق میں جو وہ اُس سے رکھتی ہیں جو انھیں دیکھتا ہے۔ یہی آرٹ ہے، جس کی سچائی مادّے یا منطق میں نہیں ہے بلکہ اظہار میں ہے۔ تصوراتی سچائی سائنس اور مابعدالطبیعیات کا حصّہ ہو سکتی ہے، لیکن حقیقت کی اقلیم آرٹ کی ملکیت ہے۔

دنیا، بہ حیثیت ایک آرٹ کے، پرم پُرش کا ناٹک ہے جو تمثال سازی کی رنگ رلیوں میں لگا ہے۔ تمثال کے عناصر کی کھوج لگانے کی کوشش کیجیے، وہ آپ کو جُل دے جائیں گے۔ وہ کبھی بھی اظہار کے ابدی راز کا آپ کو پتا نہیں دیں گے۔ زندگی کو گرفت میں لانے کی کوشش میں، جیسی کہ وہ زندہ خلیوں کے سلسلوں اور بافت میں ظاہر ہوتی ہے، آپ کو کاربن، نائٹروجن اور کتنی ہے حیات سے قطعاً غیرمماثل چیزیں ملیں گی لیکن خود زندگی کبھی نہیں۔ روپ رنگ خود اپنے پر، اپنے اجزا کے ذریعے، کوئی شرح پیش نہیں کرتا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مایا کہہ لیجیے اور اسے تسلیم نہ کرنے کا بہانہ کیجیے۔ لیکن اس سے اُس بڑے آرٹسٹ مایاوِن کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، کیوں کہ آرٹ مایا ہے۔ اس کی کوئی اور توضیح نہیں ہے سوائے اس کے کہ یہ ویسا لگتا ہے جیسا کہ ہے۔ یہ کبھی اپنی اس ہاتھ نہ آنے والی خاصیت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتا ہے، بلکہ خود اپنی پہچان پر ٹھٹول کرتا ہے اور چھپنے ڈھونڈھنے کے اپنے کھیل کو اپنے مستقل تغیرات کی اُڑان میں کھیلتا رہتا ہے۔

اور یوں زندگی کو، جو آزادی کا ایک کبھی نہ تھمنے والا دھما کا ہے، اپنی بحر (metre) بار بار موت میں ڈوب کر ہاتھ آتی ہے۔ ہر روز ایک موت ہے، اور ہر لمحہ بھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ نامُردنی کا ایک بے شکل، ابداً گونگا اور بے حرکت ریگستان۔ کیوں کہ زندگی خود مایا ہے، اور جیسا کہ معلّمِ اخلاق کہتے نہیں تھکتے، ہے بھی اور نہیں بھی۔ ہمارے ہاتھ اس میں سے جو کچھ آتا ہے وہ وہ لَے، تال یا تناسب ہے جس میں وہ خود کو پیش کرتی ہے۔ کیا چٹانیں اور معدنیات اس لحاظ سے بہتر ہیں؟ کیا سائنس نے یہ حقیقت ہم پر آشکار نہیں کی ہے کہ ایک عنصر اور دوسرے عنصر میں مختتم فرق محض لَے یا تال کا ہے؟ سونے اور پارے میں بنیادی امتیاز محض ان کی اُس تال یا لے کے فرق میں ہے جو ان کی اپنی اپنی جوہری ساخت میں مضمر ہے۔ جیسے شاہ اور رعیت میں امتیاز ان کے مختلف عناصرِ ساخت میں نہیں ہے بلکہ مختلف اوزانِ مقام و حالت میں ہے۔ یہاں آپ کو سین کے پیچھے چھپا ہوا آرٹسٹ ملتا ہے، تال اور لے کا جادوگر جو بے حقیقت کو حقیقت کا ایک ظاہرہ بخشتا ہے۔

اور یہ تال یا لَے (rythm) ہے کیا؟ یہ وہ حرکت ہے جسے ہم ساز (harmonious) بندش پیدا کرتی ہے اور جس پر ضبط و قیود بھی عائد کرتی ہے۔ یہ تخلیقی قوت ہے جو آرٹسٹ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جب تک الفاظ ایک بے زیر و بم نثری شکل میں رہتے ہیں، وہ ہمیں حقیقت کا کوئی پائیدار احساس نہیں بخشتے؛ جب انھیں اٹھا کے لَے یا تال کے حوالے کر دیا جاتا ہے، ان میں ارتعاش سے تابندگی آجاتی ہے۔ یہی حال گلاب کا ہے؛ اس کی پنکھڑیوں کے گودے میں آپ کو ہر وہ چیز ملے گی جس سے گلاب بنا ہے، لیکن جو گلاب مایا ہے، ایک تصور، ایسا کرنے میں وہ گم ہو جائے گا، اس کی قطعیت جس میں لامحدودیت کا لمس ہے وہ کھو جائے گی۔ مجھے گلاب ساکت لگتا ہے لیکن اپنی ترتیب کے وزن یا بحر کی بنا پر اُس میں، اُس کی گہری خاموشی کے میان، حرکت کا ایک گیت موجود ہے اور یہ ویسا ہی ہے جیسے ایک ایسی تصویر کی محرک خوبی جس میں مکمل طور سے ترتیب کی ہم آہنگی ہو۔ یہ حقیقت ہمارے شعور میں، اُسے حرکت کا ایک ایسا جھونٹا دے کر جو اس کی اپنی حرکت کے ساتھ ہم وقت ہو، ایک موسیقی پیدا کرتی ہے۔ اگر تصویر رنگوں اور لکیروں کے بے آہنگ، بے ترتیب جمگھٹے پر مشتمل ہو تو وہ کسی میّت کی طرح ساکت ہو گی۔ بے عیب حسنِ ترتیب میں آن کر آرٹ کی وہ صورت تاروں جیسی بن جاتی ہے جو اپنے بظاہر سکوت میں

کبھی ساکت نہیں ہیں، جیسے ایک بے حرکت لَو جو جُز حرکت کے کچھ اور نہیں ہے۔ ایک مہان تصویر ہمیشہ گویا رہتی ہے، لیکن اخبار میں چھپنے والی خبر، چاہے وہ کسی اندوہ ناک واقعے ہی کی ہو، مُردہ تن وجود میں آتی ہے۔ کوئی خبر کسی جریدے کی گم نامی میں پڑی محض روزمرّہ کی ایک بات ہو سکتی ہے، لیکن اسے صحیح لے یا تال عطا کیجیے، پھر وہ کبھی جگمگانے سے عاجز نہیں رہے گی۔ یہ آرٹ ہے۔ اس کے پاس جادو کی وہ چھڑی ہے جو ہر اُس چیز کو جس سے وہ مَس ہوتی ہے، کبھی نہ مرنے والی حقیقت بخش جاتی ہے؛ وہ اُن چیزوں کا ہماری درُونی ہستی سے تعلق پیدا کر دیتی ہے۔ ہم اس کی تخالیق کے مقابل کھڑے ہو کر کہتے ہیں: میں تمھیں ویسا ہی جانتا ہوں جیسا خود اپنے آپ کو۔ تم حقیقی ہو۔

یہاں مجھے موقع دیجیے کہ اپنے ایک پچھلے مقالے سے آرٹ کے فرضِ منصبی پر اپنی رائے کو دُہراؤں۔ جب ہم جمالیات کا آرٹ کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں تو ہمیں جاننا چاہیے کہ یہ خوب صورتی کی، اس کے عام معنوں میں، بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ اُن گہرے معنوں میں ہے جس کا اظہار ایک شاعر نے اپنے الفاظ میں یوں کیا ہے: خوب صورتی سچائی ہے، سچائی خوب صورتی۔ ایک آرٹسٹ ایک خستہ حال شخص کی ایسی تصویر پینٹ کر سکتا ہے جو آنکھوں کو بھلی نہ لگے لیکن پھر بھی ہم اسے مکمل یا بے عیب کہتے ہیں جب اس کی سچائی کی ہمیں گہری آگہی ہو جاتی ہے۔

زندگی کے امید سے تہی المیوں کو اصطلاحاً کبھی بھی خوب صورت نہیں کہا جا سکتا ہے، لیکن آرٹ کے پس منظر کے مقابل ظاہر ہو کر وہ ہمیں مسرّت بخشتے ہیں اور اس کی وجہ حقیقت کا وہ تیقّن ہے جو وہ ہمارے دماغ میں پیدا کرتے ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز جو اپنے اندر پنہاں قطعیت کی بنا پر اپنی ہستی کا لوہا ہم سے منوا لیتی ہے، خوب صورت ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے سنسکرت میں "منوہر" (لغوی معنی: دماغ کو چُرا لینے والا) کہا جاتا ہے؛ "من" (دماغ) جو معلوم کرنے والے اور معلوم کے درمیان ایستادہ ہے۔ ہماری پہلی ہم دردی اُن تمام اشیا کے لیے ہے جو زندہ ہیں، کیوں کہ اگر سمجھا جائے تو وہ ہماری زیست کی آگاہی کی محرک ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت کہ ہم موجود ہیں، اس کی سچائی اس حقیقت میں مضمر ہے کہ دوسری ہر چیز بھی وجود رکھتی ہے۔ مجھ میں کا "میں ہوں" اپنے پھیلاؤ سے، اپنی لامتناہیت سے تب ہی پوری طرح آگاہ ہوتا ہے

Scanned with CamScanner

جب وہ کسی دوسری شے کا صحیح معنوں میں ادراک کرتا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اپنی محدود دستوں اور بے شمار ذہنی مشغولیتوں کی وجہ سے ہماری دنیا کا ایک بڑا حصہ، باوجود نزدیک سے ہمارے گرد ہونے کے، ہماری توجہ کی روشنی کے کھمبے سے بہت دور رہتا ہے۔ اور یہ بڑا حصہ جو دھندلا ہے، ہمارے پاس سے گزرتا جاتا ہے، سایوں کا ایک کارواں جیسے ایک لینڈاسکیپ جو ایک روشن ریلوے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی سے رات میں نظر آتا ہے۔ مسافر جانتا ہے کہ باہر کی دنیا اپنا وجود رکھتی ہے، یہ کہ وہ اہم ہے، لیکن وقتی طور سے ریلوے کا ڈبا اس کے لیے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر اس دنیا کی ان گنت چیزوں میں سے چند ایک ایسی ہوں جو ہماری روح کی پوری تابانی میں آجائیں اور یوں ہمارے لیے حقیقت کا روپ اختیار کر لیں تو وہ مسلسل ہمارے تخلیقی دماغ کو ابدی نمائندگی بخشے جانے کی دُہائی دیتی رہتی ہیں۔ وہ اُسی اقلیم سے تعلق رکھتی ہیں جس سے ہماری وہ خواہش جو ہمارے اپنے آپ کی دوامیت کی تمنا کی نمائندگی کرتی ہے۔

میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جن چیزوں سے ہم ذاتی منفعت کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں ان میں حقیقت کا وجدان ہے۔ اس کے برعکس ایسی چیزیں ہمارے اپنے سائے سے گھنا جاتی ہیں۔ پیش خدمت ہمارے لیے اس سے زیادہ حقیقی نہیں ہے جتنا محبوب۔ افادیت پر تنگ نظر زور ہماری توجہ کو پورے انسان سے ہٹا کر محض کار آمد انسان پر منعطف کر دیتا ہے۔ بازار کی قیمت کا دبیز لیبل حقیقت کی واقعی قیمت کو مٹا دیتا ہے۔

"ورھد آرنیکا" میں کہا گیا ہے: یہ خواہش کہ بیٹا ہوا سے پیارا نہیں بناتی ہے؛ بیٹا خود اپنی ذات میں پیارا ہے۔ یعنی بیٹے میں باپ ایک حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے جو اس کے اندر بلاواسطہ اور گہری ہے۔ وہ اس لیے خوش نہیں ہے کہ اس کا بیٹا بے عیب اور خوب صورت ہے، بلکہ اس لیے کہ اس کا بیٹا بلاشبہ اس کے لیے حقیقت ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ہماری مسرت حقیقی کے بے لوث ادراک میں ہے۔ یہ منبع ہے تمام فنون اور ادب میں ہماری سرخوشی کا جہاں حقیقت ہمارے سامنے اپنی مطلق قیمت کے پایہ ستون پر رکھ کر پیش کی جاتی ہے۔

ہمارے دماغ کے تمام گہرے نقوش کے ہمراہ کچھ جذبات ہیں جو اپنی مختلف النوع تھرتھراہٹ ہمارے شعور میں بپا کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہلچل ہماری آواز اور حرکات کو تناسب سے گھٹاتی بڑھاتی ہے اور ہمیں رنگوں، شکلوں اور آوازوں کی تخلیقی نمود پر برانگیختہ کرتی رہتی ہے۔ اس

Scanned with CamScanner

پر مجھے وہ موقع یاد آتا ہے جب میں نے ایک اسکول کی عمارت کی دیوار پر بڑے بڑے حروف میں لکھا دیکھا تھا: "بپن پرلے درجے کا گدھا ہے۔" اس بات پر مجھے ہنسی بھی آئی اور ساتھ ہی اس سوال کا جواب بھی مل گیا کہ آرٹ کیا ہے۔ کوئی بھی بے وجہ یہ اعلان کرنے کی رتی بھر تکلیف گوارا نہیں کرے گا کہ بپن لمبا ہے یا یہ کہ اُسے زکام ہے۔ عام حالات میں ہمارے دماغ پر بپن کا جو نقش بنے گا وہ متانت آمیز اور غیر جانبدار ہو گا، لیکن جب ہم اس سے محبت یا نفرت کرتے ہیں تو بپن کی ہستی کی حقیقت جذبات کے اس ہیجانی پس منظر پر دمک کر عیاں ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں ہمارا دماغ غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ وہ بپن کے تصور کو اس جمِ غفیر سے جو ہمارے لیے غیر اہم ہے، علیحدہ کرتا ہے اور اپنی صلاحیت کے مطابق اُسے دوسروں کے لیے بھی اتنا ہی ناقابلِ تردید، حقیقی بنانے کی کوشش کرتا ہے جتنا وہ ہمارے لیے ہے۔ وہ لڑکا جو غصّے میں بپن کے بارے میں اپنی برہمی بھری رائے کو دوامیت دینا چاہتا تھا، اور چاہتا تھا کہ ساری دنیا بھی اسے تسلیم کرے، اس کے پاس سوائے اپنے ناکافی لکڑی کے کوئلے اور اپنی بے اثر ٹریننگ کے اور کچھ نہ تھا، جب کہ اس کے زمانۂ قدیم کے آباواجداد جب جوش دلائے جانے پر غصّے میں آجاتے تھے تو اس غصّے کو وہ نہ صرف پُراثر طریقے سے پیکار میں نکال سکتے تھے بلکہ زرق برق طریقے سے جلال کے اظہار میں بھی جس کے لیے قدرتی رنگ، پَر، چمکیلی اشیا اور لڑائی کے ناچ اُن کے ہتھیار ہوتے تھے۔ وہ دیوارِ مدرسہ کی تحریر جو بقائے دوام کے لیے تڑپ رہی تھی، رنگوں اور لَے بھری لکیروں کی افسوس ناک حد تک بھکاری تھی جو اُسے ایک شہرہ آفاق ہم جنسوں کی صف میں جگہ دیتے ـــــ مشہورِ زمانہ گپھاؤں کی آبی رنگوں والی تصاویر کی صف میں جن میں فنکاروں نے بعض شخصیتوں اور متعدد واقعات کے اپنے جائزے پر زور دیا ہے اور انھیں ابدیت بخشنے کی کوشش کی ہے، کیوں کہ آرٹ کی تخلیقات مشتمل بہ جذبات اظہار ہوتی ہیں حقائق اور تصورات کا۔ وہ کبھی بھی فوٹوگرافک کیمرے کی کاریگری کی مانند نہیں ہو سکتی ہیں جو روشنیوں اور پرچھائیوں کو بلاامتیازِ تفصیل منفعل طور سے قبول کرتا جاتا ہے۔ ہمارا سائنسی دماغ ہر طرح کی طرف داری سے آزاد ہے۔ اس کے روبرو جو حقائق آتے ہیں اُنھیں وہ بے رحم تجسّس سے، بغیر کسی ترجیح کے، قبول کرتا جاتا ہے۔ آرٹسٹک دماغ شدید طور سے جانبدار واقع ہوا ہے اور وہ جانبداری نہ صرف یہ کہ اس کی، نک چڑھے پن سے، موضوع کے انتخاب میں رہنمائی کرتی ہے بلکہ اس کی تفاصیل کے انتخاب میں بھی۔ آرٹسٹک دماغ

زورِ احساس اور اہمیت کی رنگین روشنیاں اس طرح اپنے موضوع پر ڈالتا ہے کہ وہ ایک فرد یا کردار بن جاتا ہے، اور یہ سبھاؤ اسے اپنے ساتھیوں سے ممیز کرتا ہے۔ سائنس کے لوے (skylarks) اپنی شہادت اپنے ایک جیسے ہونے میں دیتے ہیں، آرٹسٹوں اور شاعروں کے لوے ایک جیسے نہ ہونے میں۔ اگر شیلی کی نظم اس پرندے کے بارے میں ویسی ہی ہوتی جیسی ورڈزورتھ کی تو اُسے سچائی سے عاری ہونے کی بنا پر رد کر دیا جاتا۔

چوں کہ آرٹ کسی چیز، کردار یا واقعے کے ہمارے ذاتی جائزے کا حامل ہوتا ہے، آرٹسٹ اپنے عمل میں فطرت کے پھیلے ہوئے بے میل پن کے طور کو نہیں اپناتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ اپنی انسانی سرشت کا تابع رہتا ہے جو آمادہ بہ انتخاب ہے۔ جو کچھ اس کے اپنے مقصدِ اظہار کے لیے غیر ضروری ہے اس سے دامن چھڑا کر، اور جو اہم ہے اُس پر زور دے کر، وہ اپنی تخلیق کی سچائی کو زیادہ وضاحت سے پیش کر سکتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ حقیقت کی نقل کرے جو ہر موجود چیز کے بارے میں قطعاً غیر جانبدار ہے۔ خدا کی تخلیق کی سالمیت بڑی بے کراں ہے، اور یہ کسی شے کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اس سے اپنے رشتے میں حد سے زیادہ سرکشانہ طور پر مختلف ہو جائے، لیکن انسانی اظہار کا پس منظر چھوٹا ہے اس لیے یہ کبھی بھی ممکن نہیں ہو گا کہ ہم فطرت کی تفاصیل کو اپنے آرٹ کی تخلیقات میں سمو سکیں۔ قبل از تاریخ کے جنگل کو اپنے باغیچے کے تختوں کے تناظر میں ڈھونڈنے کی کوشش کرنا کود کی ہے اور تاریخ حیوانات و نباتات کی ہمارے فن پاروں میں تصویر کشی بھی جو حقائق کو ہماری شخصیت کے سُر میں کم و زیادہ کرتی ہے۔

ایک دفعہ مجھ سے سوال کیا گیا تھا کہ میں موسیقی کو اپنے فن کے نظریے میں کیا مقام دیتا ہوں۔ مجھے اس سوال کا جواب دینا ہے اور اس موقعے کو میں اپنی توضیح پیش کرنے کے لیے کام میں لا رہا ہوں۔

اقلیم سائنس میں ریاضی کی مثل، موسیقی تمام فنون میں سب سے زیادہ خیالی ہے۔ در حقیقت دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔ ریاضی، بہ حیثیت ہندسے اور ابعاد (لمبائی، چوڑائی اور گہرائی یا موٹائی) کی منطق، ہماری سائنسی معلومات کی بنیاد ہے۔ جب اسے اس کے کائناتی مظاہر سے مادّی رشتوں سے علیحدہ کر کے علامتوں میں محدود کر دیا جائے تب ریاضی اپنے عظیم ساختیاتی کروفر کو ــــ یعنی اپنی مکمل ہم آہنگی کی ناگزیریت کو ــــ ظاہر کرتی ہے۔ لیکن

Scanned with CamScanner

ایک چیز ریاضی کا جادو بھی ہے جو تمام ظہور کی بیخ میں کارفرما ہے اور جو وحدت کی ہم آہنگی کو پیدا کرتا ہے؛ اشیا کا ایک دوسرے سے رشتے کا زیر و بم جو انھیں کلُ کی قلمرو میں لے آتا ہے۔ ہم آہنگی کی اس لے کو اس کے عام سیاق و سباق سے نکال کر آواز کے وسیلے سے ظاہر کیا گیا، اور یوں اظہاریت کا خالص عطر جو وجود میں آیا، اُسے موسیقی میں پیش کیا جاتا ہے۔ آواز میں اسے کم سے کم مزاحمت ملتی ہے اور اسے ایسی آزادی میسّر آتی ہے جس پر حقائق اور خیالات کا بوجھ نہیں ہوتا۔ یہ چیز اسے ایسی قوّت عطا کرتی ہے جو ہم میں حقیقت کے شدید احساس کو بیدار کرتی ہے، جو ہمیں تمام اشیا کی روح تک لے جاتی ہوئی لگتی ہے اور ہمیں وجدان کے سانس کو عظیم ترین تخلیقی مسرّت سے آتا ہوا محسوس کراتی ہے۔

مصوّری، پیکر سازی اور صوتی فنون میں مادّی شے اور اس سے متعلق ہمارے احساسات ایک دوسرے سے بہت نزدیک آ جاتے ہیں، جیسے گلاب اور اس کی خوشبو۔ موسیقی میں صوت میں نچوڑا ہوا احساس بذاتِ خود ایک مستقل شے بن جاتا ہے، وہ لَے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو واضح ہوتی ہے لیکن ایسا مفہوم جس کی تعریف ممکن نہیں، لیکن جو پھر بھی ہمارے دماغ کو ایک مطلق سچائی کے احساس کے ساتھ اپنے بس میں کر لیتا ہے۔

صدیوں پہلے بنگال میں ایک وقت آیا جب نارائنی پریم ناٹک جس کا ابدی کھیل انسانی روحوں میں تھا، اس کا واضح اظہار ایک ایسی شخصیت میں کیا جانے لگا جو پرم آتما سے اپنی پوری آگاہی کے گہرے تعلق کی ضوافگنی کرتی تھی۔ ایک پوری قوم کا دماغ دنیا کے ایسے دیدنی پیکر کی شکل میں پیش کیے جانے سے، جو ایک آکہ تھا جس کے ذریعے ہمیں مسرّتِ کامل سے ملاقات کی دعوت دی جا رہی تھی، ہلچل میں آ گیا۔ پرم آتما کی محبّت کی پکار کے ناقابلِ بیان راز نے ـــــ جو رنگوں اور ہیئتوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا مسلسل منظر تھا، جسے اپنا ہم نوا طائفہ انسانی احساسات میں مل رہا تھا ـــــ موسیقی میں ایسی تخلیقی حرکت کو جگایا جو کلاسیکی تقلیدیت کی بندشوں کو پار کر گئی۔ ہمارے کیرتن سنگیت نے بنگال میں ایسے جنم لیا جیسے ایک جذبے کے آتش گرفتہ بھنور نے ایک ستارے کو ایک پوری قوم کے دل میں اٹھا پھینکا ہو۔

ہماری تاریخ میں ایسے مواقع آتے ہیں جب عوام الناس کے ایک بڑے گروہ کا شعور ایکا ایکی کسی ایسی چیز کی معرفت سے جو روزمرّہ کے واقعات کے معمولی پن سے کہیں بالا نظر آتی ہے، منوّر

ہوا اٹھتا ہے۔ ایسا ہی ایک موقع تھا جب (گوتم) بدھ کی آواز، تمام مادّی اور اخلاقی رکاوٹوں کے پار، دور کے ساحلوں تک پہنچی۔ اس وقت ہماری زندگی اور ہماری دنیا نے اپنے حقیقت کے گہرے مفہوم کو اس مرکزی شخص سے اپنے تعلق میں پایا جس نے ہمیں محبت کی آزادی عطا کی تھی۔ اور آدمی اس مہان انسانی تجربے کو دائمی یادگار بنانے کے لیے ناممکن کو کر گزرنے کا عزم کر بیٹھا۔ انھوں نے چٹانوں کو گویا کرایا، پتھروں کو گوایا اور گپھاؤں کو حافظہ دیا۔ خوشی اور امید کی آواز نے پہاڑیوں، ریگستانوں، کُنڈمُنڈ تنہائیوں اور گنجان آباد شہروں میں امر شکلیں اختیار کیں۔ ایک جنّاتی تخلیقی مہم نے اُن رکاوٹوں کو، جن میں مغلوب کر لینے کی طاقت تھی، خاطر میں نہ لا کر عظیم الشان تراشوں کو جنم دے کر اپنی فتح منائی۔ یہ جوشیلا عمل جو براعظم کے پوربی بڑے حصّے پر پھیلا ہوا ہے، اس سوال کا واضح طور سے جواب دیتا ہے کہ آرٹ کیا ہے۔ آرٹ انسان کی تخلیقی روح کو حقیقت کی پکار کا جواب ہے۔

لیکن انفرادی دماغ کا، اپنے مزاج اور تربیت کے لحاظ سے، حقیقت کا اس کے بعض پہلوؤں میں اپنا ادراک ہوتا ہے۔ ہم گندھارا کی بدھ کی مورتیوں میں یونان کے فنّی اثر کو دیکھ سکتے ہیں جن میں سائنسی پہلو، بالخصوص تشریحِ ابدان کی صحت، پر زور دیا جاتا تھا، جب کہ خالصتاً ہندوستانی دماغ علامتی پہلو پر قائم رہا اور اس نے بدھ کی آتما کے اظہار کی کوشش کی اور ایسا کرنے میں کبھی بھی حقیقت نگاری کی محدودیت کو تسلیم نہیں کیا۔ یوروپ کے عظیم مجسمہ ساز روداں (Rodin) کی مہم جُو روح کے لیے حقیقت کا سب سے اہم پہلو اس کی کبھی نہ تھمنے والی، نامکمل کے اپنی کوتاہیوں کی بیڑیوں سے رہائی پانے کی جدوجہد ہے، جب کہ مشرقی آرٹسٹ کے دماغ کے لیے، جو فطرتاً آمادہ بہ مشاہدۂ نفس ہے، جو کچھ حقیقی ہے وہ تکمیل کی آدرشی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس لیے جب ہم اس حقیقت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جسے ہندوستانی آرٹ کہا جاتا ہے تو اس سے اشارہ ایک ایسی سچائی کی طرف ہوتا ہے جس کی نیو ہندوستانی روایت اور مزاج پر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ انسانی تہذیبوں میں مکمل ذات پات کی قیود جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ انسانی گروہوں میں آمیز ہونے اور نئی متنوع تخلیق کی قوت سدا رہتی ہے، اور ایسے امتزاج جگوں سے چلے آ رہے ہیں اور یہ اس صداقت پر دال ہے کہ انسانی نفسیات اپنی گہرائی میں ایک ہے۔ اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی آرٹ میں ایرانی عنصر کو

رکاوٹیں نہیں ملیں اور دیگر بیرونی اثرات کے بھی نشانات ملتے ہیں۔ چین اور جاپان کو اپنی آرٹسٹک اور روحانی زندگی کی بالیدگی کے لیے ہندوستان کا زیرِ بار ہونے کو تسلیم کرنے میں کبھی قباحت پیش نہیں آئی ہے۔ ہماری تہذیبوں کی خوش بختی سے ایسی تمام آمیزش اُس دور میں ہوئی جب آرٹ کے پیشہ ور ناقدوں کی بھرمار نہیں تھی اور درجہ بندی کرنے والے ہمہ وقت تنبیہ کی انگلی سے آرٹسٹ کو یہ نہیں بتاتے رہتے تھے کہ وہ اپنے وجدان میں سے کس کا انتخاب کرے؛ نہ ہی ہمارے آرٹسٹوں کو یہ عیاں حقیقت بیزار کر دینے کی حد تک یاد دلائی جاتی تھی کہ وہ ہندوستانی ہیں، نتیجتاً باوجود اَوروں سے تمام تر اخذ کرنے کے، انھیں خود قدرتی طور سے ہندوستانی ہونے کی آزادی رہتی تھی۔

بڑے اختراعی قابلیت رکھنے والوں کی عظمت کی پہچان، بسااوقات ان کے علم میں آئے بغیر، ان کی اخذ کرنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ ان کی ساکھ دنیا کے تہذیبی بازاروں میں لامحدود ہوتی ہے۔ صرف اوسط درجے والے اخذ کرنے سے جھینپتے اور ڈرتے ہیں کیوں کہ انھیں اپنا قرضہ اپنے سکّے میں لوٹانا نہیں آتا۔ ناقدین میں سے کسی انتہائی بےوقوف کو بھی شیکسپیئر کو اپنے قومی ورثے کے باہر سے کھلم کھلا تصرّف کرنے کا اُلاہنا دینے کی ہمّت نہیں ہوتی ہے۔ انسانی روح کو اپنی ہمہ گیر حسّاسیت پر فخر ہے؛ جب وہ پوری طرح بیدار ہوتی ہے تو اپنی ہر جگہ رسائی کا اعلان کر رہی ہوتی ہے۔ ہم اس امر پر خود کو مبارک باد دیتے ہیں اور اسے روحانی طور سے اپنے زندہ ہونے کی علامت گردانتے ہیں کہ یوروپی خیالات اور ادبی ہیئتوں کی، ہمارے ذہن سے اوّلیں اتصال ہی سے، بنگالی ادب میں فوری پذیرائی ہوئی۔ اس سے ہمارے ادبی اظہار کی اقلیم میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ بنگالی ادب میں زبردست تبدیلیاں آئیں لیکن ہماری ہندوستانی روح اس تصادم کو جھیل گئی، اور اس طغیانِ عظیم پر بڑے پُرزور طریقے سے پھلی پھُولی ہے۔ اس سے صرف یہ پتا چلتا ہے کہ گو انسانی ذہنیت، کرۂ ارض کی آب وہوا کی مثال، اپنے مختلف جغرافیائی خطّوں میں اپنے مختلف ٹمپریچر رکھتی ہے لیکن ایسے مختلف کمروں میں دیوار بستہ نہیں ہے کہ ایک سے دوسرے میں اس کا گزر نہ ہو سکے، اور یوں مشترک ہوا کی حرکت پورے کرے پر اپنے صحت بخش اثر کے ساتھ جاری ہے۔ سو ہمیں دل بڑا کر کے جرأت مندانہ تجربات کرنے چاہییں، تمام خطروں کے مقابل کھلی سڑک پر نکل آنا چاہیے، ناپاک ممانعتوں کو، جن کے ادبی مبلّغ ادنیٰ درجے کے محتاط

ناقدین ہیں، للکارتے ہوئے انسانی دماغ کی عظیم دنیا کے تجربات سے گزرنا چاہیے، اور جب وہ نزاکت سے ہمارے آرٹسٹوں کو اچھے بچوں کی طرح رہنے اور کبھی ان کے اسکول کے کمرے کی دہلیز سے باہر قدم نہ نکالنے کی تلقین کریں تو اُن پر ہنسنا چاہیے۔ ڈرے ڈرے ایک روایتی ٹائپ سے سدا مطابقت رکھنا ناپختگی کی علامت ہے۔ صرف چھوٹے بچوں میں خط و خال کی انفرادیت دھندلی ہوتی ہے اور اس لیے ذاتی پہچان زیادہ واضح نہیں ہوتی ہے۔ بچپنا ایک ذہنیت ہے جس کی بہ آسانی تعمیم کی جا سکتی ہے، بچوں کی غاؤں غاؤں ہر جگہ ایک ہی صوتی لرزش پر مبنی ہوتی ہے، ان کے کھلونے بھی تقریباً ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن بلوغت کی عمر کی درجہ بندی مشکل ہے: بلوغت کی عمر مشتمل ہوتی ہے افراد پر جو اپنی ذاتی انفرادیت کے پہچانے جانے پر مصر ہوتے ہیں؛ یہ ذاتی انفرادیت نہ صرف اپنے مخصوص رویّوں میں نظر آتی ہے بلکہ تمام بیرونی محرکات پر اپنے خصوصی ردِ عمل یا تاثر میں بھی۔

میں اپنے تمام آرٹسٹوں سے شدّت سے اس بات پر اصرار کرتا ہوں کہ وہ تدبّر سے کام لے کر ایسی چیز کے تخلیق کرنے کی اپنی ذمے داری سے انکار کر دیں جس پر ہندوستانی آرٹ کا لیبل لگایا جا سکے اور جس کی مطابقت پچھلی دنیا کے کسی مخصوص ڈھب سے ہو۔ انھیں داغے ہوئے جانوروں کی طرح کھدیڑ کر باڑے میں بند کیے جانے سے فخر کے ساتھ انحراف کرنا چاہیے جن سے مویشیوں کا سلوک کیا جاتا ہے، گیتوں کا نہیں۔ سائنس غیر ذاتی ہے؛ اس کا ایک پہلو ایسا ہے جو محض آفاقی ہے اور اس لیے تصورِ مجرّد۔ لیکن آرٹ ذاتی ہے اور یوں اس کے ذریعے جو کچھ آفاقی ہے وہ فرد کے روپ میں خود کو آشکار کرتا ہے: افعال، اعضا، چہرے مہرے میں، زبان اور ادب کی شکل میں۔ سائنس تعمیم کی ریلوے ٹرین کا ایک مسافر ہے؛ وہاں ہر سمت سے استدلال کرنے والے دماغ ایک ہی جیسی گاڑی میں ایک ساتھ سفر کرنے کے لیے آتے ہیں۔ آرٹ ایک تنہا پیادہ پا ہے جو بھیڑ بھڑکّے میں اکیلا ارد گرد کے مختلف النوع تجربات کو، جنھیں نہ قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے نہ کسی ترتیبی فہرست میں ڈالا جا سکتا ہے، اپنے میں ضم کرتا ہوا چلتا رہتا ہے۔

ایک وقت تھا جب انسانی نسلیں ایک دوسرے سے نسبتاً علیحدگی میں رہتی تھیں اور اس بنا پر آرٹ کے کارنامے انجام دینے والوں کو اپنا تجربہ محدود کی ایک تنگ وسعت میں، بعض عمومی خصوصیات کی گہری لکیروں کے درمیان، میسّر آتا تھا۔ لیکن آج وہ وسعت بہت بڑھ چکی

ہے اور ہم سے اُس تاثر پذیری کی نسبت جسے قدیم زمانوں میں ہم خود میں پیدا کرنے پر مجبور تھے، آج کہیں زیادہ تاثر قبول کرنے کی طاقت کی متقاضی ہے۔ آج اگر ہم میں ایک زندہ روح ہے جو تصورات اور ہیئت کی خوب صورتی کی حس رکھتی ہے تو اسے اپنی استعداد کا ثبوت ہر اس چیز کو اپنا کر دینا چاہیے جو اپنائے جانے کے لائق ہو، کسی رسم و رواج کے اندھے حکم امتناعی اور چلن کے مطابق نہیں، بلکہ دائمی قدر کے اپنے وجدان کے تعاقب میں ــــ اُس وجدان کے جو ہر حقیقی فنکار کو پرم آتما کی دین ہوتا ہے۔ اس کے باوصف ہمارے آرٹ میں یقیناً ایک خصوصیت ہوگی جو ہندوستانی ہے، لیکن اسے ایک اندرونی خصوصیت ہونا چاہیے، کوئی مصنوعی طور سے پالاپوسا ہوا تکلف نہیں، اور اس لیے اُسے نہ تو مخل ہونے کی حد تک عیاں ہونا چاہیے نہ ہی خلافِ معمول طور سے اپنا احساس دلانے والا۔ جب ہم ہندوستانی آرٹ کے نام پر سوچی سمجھی جارحیت کے ساتھ، جو بذاتِ خود ایک گزری ہوئی نسل سے آنے والی عادت پر مشتمل ہوتی ہے، ایک کٹرپن کو جنم دیتے ہیں تو ہم اپنی روح کو دفنائی ہوئی صدیوں سے کھود کر نکالے ہوئے مخصوص اسالیب کے تلے دبا دیتے ہیں۔ گزشتہ کے یہ مخصوص اسالیب مبالغہ آمیز نقوش والے مصنوعی چہروں کی مثال ہیں جو سدا بدلتی ہوئی زندگی کے کھیل کا تاثر پیدا نہیں کر سکتے۔ آرٹ گم شدہ برسوں کی تنہا ابدیت پر اپنی جا سے ہلے بِن غور و خوض میں ڈوبی ہوئی کوئی رنگ برنگی سمادھی نہیں ہے۔ آرٹ زندگی کے جلوس میں شامل ہے، مستقل پیش آنے والے اچنبھوں سے خود کو کم و بیش کرتا ہوا، مستقبل کی یاترا کے اپنے پتھ پر، حقیقت کی نامعلوم سمادھیوں کی کھوج لگاتا ہوا، ایسا مستقبل جو ماضی سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا درخت بیج سے۔

آرٹ کبھی نہ ختم ہونے والی تخلیقی روح کی رونق و شان کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ مانگنے میں بھی سخی ہے اور سرفراز کرنے میں بھی سخی۔ وہ اپنی ہیئت میں یکتا ہے اور اثراندازی میں آفاقی؛ وہ کلُ کے لیے مہمان نواز ہے کیوں کہ اس کے پاس وہ دولت ہے جو اس کی اپنی ہے۔ اس کا زاویۂ نظر نیا ہوتا ہے چاہے منظر پُرانا ہو۔ عمدگی کا اس کا اپنا خاص معیار اس کے اپنے اندر ہوتا ہے اس لیے ایسوں کے فصیح و بلیغ ڈراووں سے جنھیں تخلیق کے نازک رازوں کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، جو اپنے درسی ضابطۂ قانون سے اس کو آسان بنانا چاہتے ہیں جو خود اپنی بے ساختگی میں قطعاً آسان ہے، بجائے مطابقت اختیار کرنے کے انھیں حقارت سے رد کر دیتا ہے۔

ایک قوم کے آرٹ کا آدرش روایت کی محدود مٹی میں مضبوط جڑ پکڑ کر اپنے میں نبات کی خصوصیت پیدا کر سکتا ہے اور پھر وہ اکتا دینے والی یکسانیت سے پتّے اور پھول پیدا کرتا رہے گا۔ چوں کہ ہر اس آرٹ کے پیچھے ایسا دماغ کلبلاتا نہیں ملتا ہے جو حاصل نہ کیے ہوئے کو حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہو، اور چوں کہ اسے ایسی عادت جو بڑی پارسائی سے تجربوں کی ترغیبوں سے باز رکھتی ہے استحکام بخشتی ہے، نہ اُسے عوام کی ترقی پذیر زندگی سے مدد ملتی ہے نہ ہی وہ اُس زندگی کو نہال کر سکتا ہے۔ وہ ماہرین کے حلقوں میں محدود رہتا ہے جو نازک توجہ سے اس کی پرداخت کرتے ہیں، اس کی لطیف قدیم مہک پر فخر کرتے ہیں جو اُن کے نزدیک اس کی اس شان میں ہے کہ وہ خواص کے لیے ہے۔ وہ ایسا دھارا نہیں ہے جو جس زمین میں بہتا ہے اس کی آبیاری کرتا ہے، بلکہ ایک طرفہ شراب ہے جسے اندھیرے تہ خانے میں زیرِزمین رکھا گیا ہو اور جو اپنی مصنوعی پرورش سے پیدا کی ہوئی بانجھ کھنگی کی وجہ سے ایک خاص اُبھارنے والی خصوصیت اپنے میں پیدا کر لے۔ حرکت کی آزادی کے بدلے میں جو زندگی سے بھری ہوئی جوانی کا حق ہوتی ہے، ہمارے ہاتھ غیر متحرک بوڑھی کاملیت آتی ہے جس نے اپنی دانائی کو ٹھوس گول مول مقولوں میں ڈھال رکھا ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے ایسے بھی ہیں جو ایک بچے کو اس کے دادا دادی کی عمر کا لگنے کو سودمند سمجھتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ بڑے ہونے کے جوکھوں اور تکلیف سے بچ جائے اور ان کے خیال میں ایک آرٹسٹ کے لیے یہ عزت کی معراج ہے کہ وہ آہستہ آہستہ، روایت کی جوڑ جوڑ کر بنائی ہوئی کسی میراث کی مدد سے، یکسانیت کی آسان کامیابی اپنے لیے پیدا کر لے۔

لیکن اگر ہم آرٹ کی پرورش میں روایت کو یکسر ٹھکرا دیں تو یہ سمجھیے ہم دوسری سمت میں بہت آگے نکل گئے ہیں اور یہ کہنا بھی کہ عادات کا واحد اثر ہمارے ذہن کو مُردہ کر دینے میں ہے، سچائی کا ادھورا بیان ہو گا۔ جو روایت مددگار ہے وہ اس نالے کی طرح ہے جو دھارے کے بہنے میں معاون ہوتی ہے۔ جہاں پانی تیزی سے آگے کو بہہ رہا ہوتا ہے وہ کھلی ہوتی ہے؛ جہاں اس کے اِدھر اُدھر مڑنے کا خطرہ ہوتا ہے وہ اس کی حفاظت کرتی ہے۔ مگس کی زندگی اپنی عادت کی بند نالی میں کہیں سے کھلی ہوئی نہیں ہے۔ اس کی زندگی بس کاملیت کے تنگ دائرے میں گھومتی رہتی ہے۔ انسانی زندگی بھی وقت کے آزمودہ اپنے اصول رکھتی ہے جو اس کی ترتیب یافتہ عادات پر مشتمل ہیں۔ جب یہ قوانین باڑھوں کا کام کرتے ہیں تو نتیجہ تمام و کمال ہو سکتا ہے ــــ

شہد کی مکھی کے چھتے کی طرح ہیئت کی درستی میں بے عیب، لیکن اُس دماغ کے لیے نامناسب جس کے اندر ترقی کے ان گنت امکانات ہوتے ہیں۔

[خطبے کو] ختم کرنے سے پہلے میں اس موقعے سے کام لیتے ہوئے اپنے آرٹسٹوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے پیشے کی عظمت کو پہچانیں۔ ان کا پیشہ زندگی کے تیوہار میں تخلیقی طور سے حصہ لینے کا ہے اور یہ تیوہار ہے درونِ انسان موجود لامحدودیت کے اظہار کا۔ اپنی روزمرہ کی دنیا میں ہم عُسرت میں گزارا کرتے ہیں، اس میں ہمیں اپنے وسائل کو کفایت شعاری سے تصرّف میں لانا پڑتا ہے، ہماری توانائی پست پڑ جاتی ہے اور اپنے خدا کے سامنے جب ہم پہنچتے ہیں تو بھکاری ہوتے ہیں۔ تیوہار کے دنوں پر ہم اپنی دولت کی نمائش کرتے ہیں اور اُس سے کہتے ہیں ہم بھی ویسے ہی ہیں جیسا وہ ہے، اور خرچ کرتے ہوئے گھبراتے نہیں۔ یہ وہ دن ہوتا ہے جب ہم اُس کو اپنی مسرّت کا تحفہ پیش کرتے ہیں، کیوں کہ خدا سے ہم حقیقت میں اُس وقت ملتے ہیں جب ہم اس کے حضور اپنے نذرانے لیے آتے ہیں نہ کہ حاجتیں، اور وہ نذرانے اپنے اظہار کے لیے آرٹ کے طلبگار ہوتے ہیں۔

جس وِشال دنیا میں مَیں نے جنم لیا ہے اُس کے بارے میں میرے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سورج اس کا انتظار نہیں کرتا ہے کہ میں اُسے کتروں۔ لیکن صبح سویرے ہی سے میرے وجود کی چھوٹی سی دنیا سے میرے خیالات بھر جاتے ہیں۔ اس کی اہمیت اس حقیقت میں ہے کہ مجھے ایک دنیا دی گئی ہے جس کا دارومدار اپنی کاملیت کے لیے میری اپنی تخلیقی روح پر ہے۔ یہ دنیا مہان ہے، کیوں کہ میرے پاس وہ شکتی ہے جو اُسے اُس ناتے کے یوگیہ بناتی ہے جو اُس میں اور مجھ میں ہے؛ یہ دنیا اس لیے مہان ہے کہ اس کی مدد سے میں اپنی میزبانی تمام دنیا کے خدا کے حضور پیش کر سکتا ہوں۔

صبح کو سورج چمک دمک لیے آتا ہے، جھُٹ پُٹے میں ستارے اپنی روشنیاں دکھاتے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے لیے کافی نہیں ہیں۔ جب تک ہم اپنے چھوٹے چھوٹے دیے نہیں جلا لیتے ہیں آسمان میں روشنی کی دنیا عبث ہے، اور جب تک ہم اپنی تیاریاں نہیں کر لیتے ہیں دنیا کی تیاریوں کی دولت ایسے منتظر رہتی ہے جیسے ایک بنسری انگلیوں سے چھُوئے جانے کی۔

ایسی تیاری ساری دنیا میں جاری ہے، غار میں رہنے والے دور سے لے کر ہمارے زمانے

تک۔ آرٹسٹ انسان خدا آرٹسٹ کو اپنے گھر مدعو کر رہا ہے۔ خدا اس کی اپنی تخلیق میں گھر رکھتا ہے اور انسان سے اس کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنا ماحول بھی تخلیق کرے اور اپنے رہنے کی جگہ بھی جو اس کی روح کے شایانِ شان ہو۔ ایک مکمل تخلیق کے لیے اس کے اندر بیٹھے ہوئے آرٹسٹ کو آزادی ہونی چاہیے، ایسے آرٹسٹ کو جس کا ایک مدّعا کاملیت ہوتا ہے منفعت نہیں، جس کے تئیں قیمت کی وہ توقیر ہوتی ہے جو مادّی کامیابی کو حقارت سے دیکھتی ہے اور جس کے پاس وہ اولوالعزمی ہوتی ہے جو مشکلات، ہمّت شکنی اور احتیاج کے مقابل درُونی تکمیل کے آدرش کی جُویا رہتی ہے۔ اور تب کہیں جا کے اس کی دنیا خدا کی دنیا کا سچا جواب دے پاتی ہے جیسے اپنے پریمی کی مہتو (بڑائی) کے جواب میں ایک استری کی مدُھرتا۔

یہ آرٹسٹ کی ذمے داری ہے کہ وہ دنیا کو یاد دلائے کہ اپنے اظہار کی سچائی سے ہم سچ میں پنپتے ہیں۔ جب انسان کی ترتیب دی ہوئی دنیا اس کی تخلیقی روح کی کم اور کسی طاقت کے مقصد کے لیے بنائیے ہوئے مشینی آلے کی مظہر زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ کرختگی اختیار کر لیتی ہے اور زندہ بڑھوتری کی نازک معنی خیزی کے عوض اس کے ہاتھ مہارت آتی ہے۔ اپنے تخلیقی کاموں میں آدمی فطرت کو اپنی زندگی اور محبّت میں جذب کر لیتا ہے۔ لیکن اپنی افادیت کی طاقتوں کو وہ فطرت سے جنگ کرنے کے کام میں لاتا ہے، اُسے اپنی دنیا سے نکال باہر کرتا ہے، اپنی ہوَسنا کی کی بدصورتی سے اُسے بدوضع اور غلیظ کر ڈالتا ہے۔ آدم کی ساخت کی ہوئی یہ دنیا اپنی بے تال اور بے سُر چیخوں اور خود پسندی سے اس کے دماغ میں ایک ایسی کائنات کا مقصدی خاکہ ثبت کر دیتی ہے جس میں فرد کا لمس نہیں ہوتا اور، اس لیے، نہ ہی بالاخر اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ تمام عظیم تہذیبیں جو معدوم ہو چکی ہیں اپنے انجام کو اسی طور انسانیت کے اظہار میں پہنچی ہوں گی: دولت سے جنم لینے والے بہت بڑے پیمانے کے ایک دوسرے کے جسم پر پلنے سے، آدمی کے مادّی وسائل سے چمٹے رہنے کے اعتقاد سے، حقیقت کو جُھٹلانے، اس سے انکار کرنے کے تضحیکی جذبے اور سچائی کی راہ کے ہمارے آزوقے کو ہم سے چھین لینے سے۔

یہ آرٹسٹ کے کرنے کا کام ہے کہ وہ قائم و دائم اثبات میں اپنے اعتقاد کا اعلان کرے، کہ میرا ایمان اس میں ہے کہ ایک آدرش دھرتی کی فضا میں بھی پر مار رہا ہے اور دھرتی میں بھی سرایت کیے ہوئے ہے، ایک پرلوک کا آدرش جو محض تصور کی پیداوار نہیں ہے بلکہ آخری

Scanned with CamScanner

حقیقت ہے جس میں تمام چیزیں بستی ہیں اور چلتی پھرتی ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ پرلوک کا یہ درشن سورج کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے اور دھرتی کے سبزے میں، آدمی کے چہرے کی سُندرتا میں اور انسانی محبت کے دھن میں، اُن چیزوں میں جو بظاہر غیر اہم اور نہ بھانے والی ہیں۔ دھرتی میں ہر جگہ سورگ کی آتما جاگ رہی ہے اور اپنی آواز سنا رہی ہے۔ وہ ہمارے بھیتر کے کان میں بلا ہمارے جانے پہنچتی ہے۔ وہ ہمارے جیون کی دنیا کے سُر ملاتی ہے جس سے ہماری سنگیت کی ابھیلاشا انت سے پرے پہنچتی ہے، صرف پرارتھناؤں اور آشاؤں میں نہیں، مندروں میں بھی جو پتھر میں اگنی کی لپٹیں ہیں، چتروں میں جو سپنے ہیں جنھیں امر بنا دیا گیا ہے، نِرت میں جو حرکت کے اچل مرکز میں والہانہ دھیان ہے۔

**

آئندہ صفحات میں مشرقی یوروپ کے چار شاعروں کی چند نظمیں پیش کی جا رہی ہیں جنھیں افضال احمد سید نے انگریزی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔

تادیوش بوروسکی (Tadeusz Borowski) ۱۹۲۲ میں پولینڈ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۱ میں وفات پائی۔ ان کا بچپن یوکرین میں گزرا اور تعلیم انھوں نے وارسا یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۲ میں شائع ہوا۔ اگلے سال انھیں گرفتار کر کے آوشوٹز اور پھر داخاؤ کے کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں وہ پولینڈ کے نازیوں کے تسلط سے آزاد ہونے تک قید رہے۔ ۱۹۴۵ میں ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ شائع ہوا اور ۱۹۴۶ میں کنسنٹریشن کیمپ کی کہانیوں کا مجموعہ میونخ سے چھپا۔ بعد میں ایسے دو اور مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۵۱ میں بوروسکی نے گیس سے دم گھونٹ کر خودکشی کر لی۔

مارین شورسکو (Marin Sorescu) کا تعلق رومانیا سے ہے جہاں وہ ۱۹۳۶ میں پیدا ہوئے۔ یاسی یونیورسٹی میں فلسفے کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی انھوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ مختلف اخباروں اور رسالوں سے وابستہ رہے۔ آج کل وہ *Ramuri* نامی جریدے کے مدیر ہیں۔ شورسکو کی نظموں کا پہلا باقاعدہ مجموعہ ۱۹۶۵ میں شائع ہوا۔ اب تک ان کے متعدد مجموعے اور انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ نظموں کے علاوہ وہ ڈرامے، مضامین اور بچوں کے لیے کتابیں بھی لکھتے ہیں اور ترجمے سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ ان کا ڈراما *Jonah* کئی یوروپی ملکوں میں پیش کیا جا چکا ہے۔ شورسکو کو رومانیا میں اور اس سے باہر کئی اعزازات مل چکے ہیں۔

جان پروکوپ (Jan Prokop) ۱۹۳۱ میں پولینڈ میں پیدا ہوئے۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ مترجم، مضمون نگار اور ادبی مورخ بھی ہیں۔ ان کی نظموں کی صرف تین مختصر کتابیں ۱۹۷۱، ۱۹۷۸ اور ۱۹۸۰ میں شائع ہوئیں۔ پروکوپ پولینڈ کے شہر کراکو اور اٹلی کے شہر تورینو کی یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں۔ ۱۹۸۰ کے عشرے میں ان کی نظموں یا تو پولینڈ سے باہر ورنہ خفیہ طور پر شائع ہوتی تھیں۔

وسلاوا شیمبورسکا (Wislawa Szymborska)، جنھیں ۱۹۹۶ میں ادب کا نوبیل انعام پیش کیا گیا، ۱۹۲۳ میں پولینڈ میں پیدا ہوئیں۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۲ میں شائع ہوا اور اس کے بعد سات اور مجموعے چھپے۔ وہ فرانسیسی شاعری کے ترجمے کر چکی ہیں اور ان کے مضامین کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کی جو دو نظمیں یہاں شامل کی گئی ہیں ان میں سے ایک ("یاسلو کے قریب فاقہ کیمپ") اس سے پہلے "آج" کے شمارہ ۳ (بہار ۱۹۹۰) میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

Scanned with CamScanner

تادیوش بوروسکی

انگریزی سے ترجمہ : افضال احمد سید

پروجیکٹ : پرچم

ہم قومی رنگوں سے تنگ آ چکے ہیں
ہم زندگی کا رنگ چاہتے ہیں
وہ نہیں جس کی چھٹیوں کے دن نمائش کی جاتی ہے
ہم ہر پرچم کو نئے رنگ دیں گے :
پولینڈ کا جھنڈا دھاری دار ہو گا
دھاریاں، بے شک، جیل کی سلاخیں ہیں...

**

Scanned with CamScanner

مارین شورِسکو

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

شیکسپیئر

شیکسپیئر نے دنیا سات دنوں میں بنائی

پہلے دن اس نے آسمان اور پہاڑ اور روح کی ندیاں بنائیں
دوسرے دن اس نے دریا، چھوٹے بڑے سمندر اور دوسرے جذبات بنائے
اور انھیں ہیملٹ کو، جولیس سیزر کو، کلوپیٹرا، اوفیلیا
اور دوسروں کو دیا
تاکہ وہ ان پر اپنی اولادوں اور بعد کی نسلوں کے ساتھ
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حکومت کر سکیں

تیسرے دن اس نے تمام لوگوں کو مختلف ذائقوں کی تعلیم دینے کے لیے طلب کیا
خوشی کا ذائقہ، محبت کا، ناامیدی کا ذائقہ،
رشک کا، شہرت کا ذائقہ، وغیرہ
یہاں تک کہ کوئی ذائقہ تقسیم کرنے کے لیے نہیں بچا
پھر کچھ لوگ آئے جو دیر سے پہنچے تھے، ان کے لیے افسوس کیا جا سکتا ہے،
شیکسپیئر نے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور انھیں بتایا کہ

Scanned with CamScanner

ان کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا کہ وہ ادبی نقاد بن جائیں
اور اس کی تخلیقات کو بُرا بھلا کہا کریں

چوتھے اور پانچویں دن کو اس نے قہقہوں کے لیے مخصوص کیا
مسخروں کو کھلی چھٹی دی، انھیں قلابازیاں کھانے کی اجازت دی
کہ وہ حکمرانوں، شہنشاہوں اور دوسرے بد قسمت لوگوں کے لیے
دل لگی کا سامان فراہم کر سکیں

چھٹے دن اس نے انتظامی معاملات کو چھیڑا
اس نے ایک طوفان پیدا کیا، اور کنگ لیئر کو بتایا
کہ کانٹوں کا تاج کس طرح پہنتے ہیں

ساتواں دن اس نے اس بات کی تصدیق میں لگایا کہ کوئی چیز
بنے بغیر تو نہیں رہ گئی
اس وقت تک تھیٹر کے مینیجر تمام دنیا کو اپنے اشتہارات سے لیپ چکے تھے
اور شیکسپیئر نے سوچا اتنی سخت مشقت کے بعد
وہ ایک ڈراما دیکھنے کا مستحق ہے
مگر اسی دوران وہ شدید غنودگی محسوس کرتے ہوئے لیٹ گیا
تاکہ موت کی مختصر سی نیند لے سکے

Scanned with CamScanner

شطرنج

میں ایک سفید دن آگے بڑھاتا ہوں
وہ ایک سیاہ دن چلتا ہے
میں ایک خواب کے ساتھ تیزی سے بڑھتا ہوں
وہ اسے جنگ میں مجھ سے حاصل کر لیتا ہے
وہ میرے پھیپھڑوں پر حملہ کرتا ہے
ایک سال تک میں سوچتا ہوا پڑا رہتا ہوں
ذہانت سے پیش بندی کرتا ہوں
اور ایک سیاہ دن جیت لیتا ہوں
وہ بد قسمتی کو حرکت دیتا ہے
اور مجھے کینسر کا خوف دلاتا ہے
(جو اس وقت ترچھی چال چل رہا ہے)
مگر میں ایک کتاب سے اس کی تواضع کرتا ہوں
اور اسے واپس جانے پر مجبور کر دیتا ہوں
میں کچھ اور مہرے چلتا ہوں
اور دیکھتا ہوں کہ میری آدھی زندگی بساط سے غائب ہو چکی ہے
"میں شہ دوں گا اور تم اپنی امید ہار جاؤ گے،"
وہ دعویٰ کرتا ہے
"فکر نہ کرو، "میں مذاق کرنے کی کوشش کرتا ہوں،
"پھر میں جذبات کو آگے بڑھاؤں گا اور تمہارے بادشاہ کو گھیرے میں لے لوں گا"
عقب میں میری بیوی، میرے بچے، سورج، چاند اور دوسرے تماشائی
میری ہر چال پر لرزتے رہتے ہیں

Scanned with CamScanner

میں ایک سگریٹ جلاتا ہوں
اور کھیل کو جاری رکھتا ہوں

سینیکا

جب سورج ڈوبنے لگے گا
وہ مجھے بتاتے ہیں
مجھے اپنی نسوں کو کاٹنا ہو گا
ابھی صرف دوپہر ہوئی ہے
میرے پاس زندہ رہنے کے لیے کچھ گھنٹے بچے ہیں

کیا میں لوکولس کو خط لکھوں؟
اس وقت میرا دل نہیں چاہ رہا ہے
سرکس کو جاؤں؟
مجھے اب کھیل تماشے کی ضرورت نہیں، نہ روٹی کی ہے
کیا میں فلسفے کے مستقبل کے بارے میں بتاؤں؟

ایک گھنٹا اور گزر گیا
میرے پاس مکمل چار گھنٹے اور ہیں
میرے حمام میں پانی گرم ہو رہا ہے
میں جمائی لیتا ہوں اور کھڑکی سے باہر جھکتا ہوں
اور اس سورج کے راستے کو دیکھتا ہوں جو پھر نہیں ڈوبے گا
اور ناقابلِ بیان حد تک بیزاری محسوس کرتا ہوں

**

جان پروکوپ

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

وکٹری اسکوائر، سابق سیکسونین اسکوائر، پر گمنام سپاہی کی قبر کے پاس چڑیوں کے لیے پھینکے گئے روٹی کے ٹکڑے کا نغمہ

میں نے مائلیک کے قصبے سے لے کر یہاں تک کا تمام سفر
غیر ہنر مند، پوچھا لگانے والی ضوفیان ــــ کی (جس کا کوئی شوہر نہیں ہے) جیب میں کیا
اگرچہ میں مازووین کے دھوپ بھرے میدانوں میں پیدا ہوا تھا،
جس کی شاعر برونیسوسکی نے، جو انقلاب کا عوامی نغمہ خواں تھا، تمنا کی تھی
ہماری بس ایک تعطیلی سنیپر کو پہنچی، لوگ دکانوں کی کھڑکیوں میں جھانکنے لگے
ضوفیان ــــ بچیوں کی ٹائٹس اور ڈائپرز کی تلاش میں تھی کیوں کہ وہ
آٹھ ماہ کی ماریوز کی بن بیاہی ماں ہے
ڈیر، مسٹر، کامریڈ، چیئرمین، سر... اُس نے ہزاوریں بار لکھا
براہِ مہربانی اپنی توجہ میری نامساعد حالت پر مبذول کریں
میں ایک باورچی خانے میں رہ رہی ہوں، مجھے ایک مکان الاٹ کیا جائے
نرم حصے کو جس پر چکنائی لگی تھی، کھانے کے بعد، اُس نے مجھے
انگلیوں میں اُسی غیر واضح انداز میں تھامے رکھا

Scanned with CamScanner

جو اس نے اُس وقت اختیار کیا تھا جب زازیسلاوس ــــ، ڈپٹی ڈائرکٹر، نے
اپنے دفتر کا دروازہ بند کیا اور اسے وود کا پیش کی
مگر جب اس نے انتظامیہ کی تبدیلی کا اچانک حکم سنا
وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مَیں آہستہ سے
اس اسکوائر کے پتھروں پر گر گیا
جو تاریخ اور غموں سے اس قدر بھرا تھا
کہ جب چڑیوں کی سخت چونچوں نے مجھے زخمی کیا
میں نے سوچا: یہ ضرور گرے ہوئے پرچموں سے بھاگ کر آنے والے
عقاب ہوں گے

**

وِسلاوا شِمبورسکا

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

ایک ریزیومے کا لکھنا

کیا کیا جانا چاہیے؟
درخواست بھرو
اور ایک ریزیومے منسلک کرو

فائل کی ضخامت سے قطع نظر
ریزیومے کو مختصر ہونا چاہیے

جامع، اچھی طرح منتخب کیے ہوئے حقائق ضروری ہیں
لینڈاسکیپ کو مکانوں سے بدل دیا گیا ہے
قابلِ اعتبار تاریخیں لرزاں یادوں کی جگہ لے لیتی ہیں

اپنی تمام محبتوں میں سے صرف شادی کا ذکر کرو
اور اپنے تمام بچوں میں سے صرف اُن کا جو پیدا ہوئے

جو لوگ تمھیں جانتے ہیں وہ اُن سے زیادہ اہم ہیں جنھیں تم جانتے ہو

Scanned with CamScanner

صرف بیرونی ممالک کے کیے گئے سفر
ممبر شپ کن کن اداروں کی، مگر اس کی وجہ بتائے بغیر
اعزازات، یہ بتائے بغیر کہ وہ کس طرح حاصل کیے گئے

اس طرح لکھو جیسے تم نے کبھی خود سے گفتگو نہ کی ہو
اور ہمیشہ اپنی ذات کو فاصلے پر رکھا ہو

اپنے کتّوں، بلّیوں، پرندوں، گرد آلود نشانیوں، دوستوں اور خوابوں کے پاس سے
دبے پاؤں گزر جاؤ

قیمت، مگر خوبی نہیں
اور خطابات، مگر یہ نہیں کہ ان کے اندر کیا ہے
اُس کے جوتوں کا نمبر جسے تم
اپنے آپ کی حیثیت سے متعارف کراتے ہو
مگر یہ نہیں کہ وہ کہاں جانے والا ہے

اس کے علاوہ ایک تصویر، جس میں ایک کان نمایاں ہو
جس چیز کی اہمیت ہے وہ کان کی ساخت ہے، نہ یہ کہ وہ کیا سنتا ہے
کاغذ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والی مشین کی گڑگڑاہٹ کے سوا
یہاں پر سننے کو ہے بھی کیا!

Scanned with CamScanner

یاسلو کے قریب فاقہ کیمپ

اس کو لکھ ڈالو۔ اس کو لکھو۔ عام سیاہی میں
عام کاغذ پر: "انھیں کوئی خوراک نہیں دی گئی تھی
وہ سب بھوک سے مر گئے۔"
"سب؟ کتنے؟
یہ چراگاہ اتنی بڑی ہے۔ گھاس کی کتنی پتّیاں فی کس؟"
لکھو: "میں نہیں جانتا۔"
تاریخ کے پنجر مکمل اعداد میں درج کیے جاتے ہیں
ایک ہزار اور ایک
صرف ہزار رہ جاتا ہے
غیر ضروری شخص شاید کبھی تنہا ہی نہیں
ایک خیالی جنین، ایک خالی گہوارہ
کسی کے لیے نہ کھولا گیا ایک قاعدہ
ہَوا، جو مسکراتی ہے، شور کرتی ہے اور بڑھنا جاری رکھتی ہے،
خالی پن کے باغ میں تھک جانے کو قدم رکھتی ہے
قطار میں کسی کی جگہ نہیں ہے

ہم اس چراگاہ میں ہیں جہاں ہَوا گوشت بن گئی
یہ ایک جھوٹے گواہ کی طرح خاموش رہتی ہے
دھوپ سے روشن، سبز۔ قریب ہی ایک جنگل ہے
ایک قطرہ پانی کے لیے چھال کا چوسنا
نظارے کا یومیہ راتب
جب تک بینائی کھو نہ جائے

Scanned with CamScanner

اونچائی پر ایک پرندہ
جس نے اپنے نرم پَروں کے سائے کو
ان کے منہ سے گزارا
جبڑے کھلے
اور فوراً بند ہو گئے
دانت دانتوں پر زور سے ٹکرائے
رات کے آسمان پر ایک ہلالی درانتی
خیالی روٹیوں کی فصل کاٹ گئی
سیاہ کی ہوئی مقدس تصاویر سے نکلے ہوئے ہاتھ
خالی پیالہ تھامے
خاردار تار کی بنچ پر
ایک آدمی نے پہلو بدلا
انھوں نے ایک نغمہ پیش کیا، ان کے منہ مٹی سے بھرے ہوئے
"جنگ سے متعلق ایک زندگی سے بھرپور نغمہ
جو سننے والے کے دل میں اُتر جاتا ہے"
لکھو، یہاں کی خاموشی کے بارے میں:
"ہاں۔"

**

The Annual of Urdu Studies

Editor:
Muhammad Umar Memon

Associate Editor:
G. A. Chaussee

Published by:
University of Wisconsin-Madison
Center for South Asia
1220 Linden Drive
Madison, WI 53706, USA.
Fax: 608/265-3538
Internet: mumemon@factstaff.wisc.edu
chaussee@students.wisc.edu

Number 11 (1996)
is available in Pakistan

Special price : Rs 500

Please call or write to:
aaj ki kitabain
A-16, Safari Heights,
Block 15, Gulistan-e-Jauhar,
Karachi 75290.
Phone: 8113474
e-mail: aaj@biruni.erum.com.pk

Scanned with CamScanner

افریقا کے ملک روانڈا (Rwanda) میں پچھلے چند برسوں میں ہونے والے واقعات انسانوں کی بار بار اُبھر آنے والی حیوانیت اور سفاکی کی ایک تازہ یاددہانی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ بات صرف روانڈا تک محدود نہیں کہ انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کو خود سے مختلف پا کر اپنا حریف بنا لیتا ہے اور اسے زندہ رہنے کے حق سے محروم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اختلاف کی نوعیت الگ الگ ہو سکتی ہے، اس دشمنی کے اسباب میں بھی فرق ہو سکتا ہے، لیکن اس قسم کے تمام غیر انسانی واقعات میں مشترک عنصر یہ ہے کہ یکسانی اور اشتراک کے بے شمار پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اختلاف کے ایک پہلو کو سب سے اہم سمجھ لیا جاتا ہے۔ روانڈا میں بسنے والے دو گروہ ـــــ ہُوتُو اور تُوتسی ـــــ آپس میں اتنا کچھ مشترک اور یکساں رکھتے ہیں کہ کسی غیر ملکی کو ان کے درمیان تمیز کرنے کا کوئی واضح طریقہ سمجھ میں نہیں آتا؛ اس کے باوجود ان میں سے ایک (اکثریتی) گروہ نے چند سال پہلے دوسرے (اقلیتی) گروہ کو صفحۂ ہستی سے مکمل طور پر صاف کر دینے کا ارادہ کر لیا، اور اس میں ہولناک حد تک عملی کامیابی بھی حاصل کر لی۔ اپنے سے ـــــ نسلی، مذہبی، لسانی، قبائلی یا کسی اَور اعتبار سے ـــــ مختلف گروہ کے وجود کو برداشت نہ کر پانے کا غیر انسانی رویّہ انسانی ذہن میں صورت حال کا نہایت سادہ، حتمی حل (Final Solution) نکالنے کی شدید ترغیب پیدا کرتا رہا ہے: دوسرے گروہ کو رُوئے زمین سے بالکل مٹا ڈالنے کی ترغیب۔ یہ تماشا تاریخ نے بار بار دیکھا ہے، اور حالیہ برسوں میں اس کی نوعیت پہلے سے کہیں زیادہ ہولناک ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن کامیابی کے درجات سے قطع نظر، ان کوششوں کا حاصل محض یہ سبق ہی رہا ہے کہ یہ حتمی حل دراصل کوئی حل نہیں؛ یہ کوششیں مصائب کا ایک سلسلہ شروع کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے ہاں بھی عدم رواداری کا شوق بہت سے نسلی، مذہبی، لسانی اور فرقہ وارانہ گروہوں کے ذہنوں اور دلوں میں اپنے ہدف گروہ کے مکمل خاتمے کو ممکن اور مفید خیال کرنے کی اُکساہٹ پیدا کرتا رہتا ہے۔

روانڈا میں جو کچھ ہوا اُسے نہایت بجا طور پر "نسل کُشی" (genocide) کا نام دیا گیا ہے۔ آئندہ صفحات میں شائع کیے جانے والے دو مضامین اسی صورتِ حال اور اس کے پیدا کردہ نتائج کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ پہلا مضمون برطانوی خبر نگار لنڈسے ہِلسَم (Lindsey Hilsum) کی تحریر کا ترجمہ ہے جو لندن کے سہ ماہی جریدے "گرانٹا" کے شمارہ ۵۱ (خزاں ۱۹۹۵) میں شائع ہوئی تھی۔ ہلسم فری لانس صحافی ہیں اور اخبار "آبزرور" اور بی بی سی ریڈیو ۴ کے لیے باقاعدگی سے کام کرتی ہیں۔ دوسرے مضمون "کیپٹن مبایے دیا گنے" کے مصنف مارک ڈائل (Mark Doyle) بھی بی بی سی سے وابستہ ہیں۔ وہ جنگ شروع ہونے سے پہلے سے روانڈا کی خبر نگاری کرتے رہے ہیں اور اس دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ روانڈا میں مقیم واحد غیر ملکی صحافی تھے۔ ان کا مضمون "گرانٹا" کے شمارہ ۴۸ (خزاں ۱۹۹۴) سے لیا گیا ہے۔

ان دونوں مضامین کے درمیان صفحہ ۱۹۰ سے ۲۰۰ تک وہ سب کچھ تصویری جھلکیوں کی صورت میں دکھایا گیا ہے جسے ظاہر کرنے سے الفاظ قاصر ہیں۔ یہ تصویریں بھی "گرانٹا" کے شمارہ ۴۸ میں شائع ہوئی تھیں۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لِنڈسے بلسَم

انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

کیگالی کہاں ہے؟

ا

ایوارِستے رات کو چوکیداری کرتا تھا۔ میں اور وہ روانڈا کے صدر مقام کیگالی کے اُس مکان میں اکیلے تھے جب قتلِ عام شروع ہوا۔ یہ ۶ اپریل ۱۹۹۴ کی رات کا ذکر ہے۔ ایک جہاز جس میں روانڈا اور اس کی ہم سایہ ریاست بُرونڈی کے صدر سوار تھے، مار گرایا گیا تھا اور اس میں سوار تمام لوگ ہلاک ہو گئے تھے۔ کیگالی میں ہر طرف اُلجھاؤ کی کیفیت تھی۔ چاقوؤں، پتھروں اور ڈنڈوں سے مسلح آدمیوں کے گروہ شہر بھر میں گھوم رہے تھے۔ ہمارے مکان کے باغ کی حد بندی کرنے والی سبز باڑھ کے دوسری طرف کیگالی راکٹوں کے چلنے اور دستی بموں کے پھٹنے کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

میں مکان کے پچھلے حصّے سے آتی ہوئی ایوارِستے کی جھاڑو کے فرش پر گھسٹنے کی آواز سن رہی تھی۔ وہ اپنا فالتو وقت صفائی کرنے، چاے بنانے اور ریڈیو سننے کے مشغلوں میں گزارتا تھا۔ میں عموماً فون پر شہر کے دوسرے حصوں میں رہنے والے لوگوں سے بات چیت کر کے یہ پتا چلانے کی کوشش میں رہتی تھی کہ اُدھر کیا ہو رہا ہے، اور یا پھر لندن فون کر کے تازہ ترین حالات کی رپورٹیں دیا کرتی۔

کوئی ایک ایک گھنٹے کے وقفوں سے میں باہر برآمدے میں چلی جاتی اور ہم دونوں گولیاں

چلنے کی آوازیں سنتے اور تشویش بھرے کلمات کا باہم تبادلہ کرتے۔

"یہ سب کتنا ہولناک ہے، ہے نا؟"

"ہاں، بہت ہولناک۔"

"لگتا ہے حالات اور خراب ہو رہے ہیں۔"

میں نے سامنے کا پھاٹک کھول کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ کچی سڑک پر گشت کرتے ہوئے دو سپاہیوں نے اپنی رائفلوں کی نالوں کو جھٹکا دے کر مجھے واپس گھر میں لوٹنے کی ہدایت کی۔

دن کے وقت اپنی مصروفیت میں مجھے خوف کا احساس نہ ہوتا۔ رات میں بستر میں لیٹ کر مجھے یہی خیال آتا رہتا کہ کیا میں کیگالی سے کبھی باہر نکل سکوں گی۔ ایوارِ ستے باہر سوتا تھا۔ ہر دن کا آغاز بندوق چلنے کی آوازوں سے ہوتا۔ مگر اُس کے انداز سے کسی خوف کا اظہار نہ ہوتا تھا۔

اُس سال روانڈا میں کتنے لوگ ـــــ مرد، عورتیں اور بچے ـــــ قتل ہوئے؟ پانچ لاکھ؟ دس لاکھ؟ مختلف تنظیمیں اور ادارے اپنا الگ تخمینہ پیش کرتے ہیں، لیکن یقین سے کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا؛ یقین سے کچھ کہنے کے قابل ہونے کے لیے لاشوں کی گنتی کرنے والے، قبریں کھول کر دیکھنے والے قابلِ اعتبار لوگوں اور ہلاک ہونے والوں کی تعداد کو بڑھا یا گھٹا کر دکھانے کی سیاسی ضرورت سے آزاد غیر جانبدار سائنس دانوں کی ٹیموں کی ضرورت ہو گی۔ اور ہلاک ہونے والوں کی تعداد میں مسخ کر دیے گئے لوگ شامل نہیں ہوں گے: بازو کٹے مرد، ٹانگ کٹے بچے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ قتلِ عام کا آغاز اُس دوران ہوا جب میں ایوارِ ستے کے ساتھ اُس مکان میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ میری نوٹ بک اُن دنوں کے بارے میں کچھ زیادہ انکشاف نہیں کرتی؛ چند ایک فقرے، اکا دکا "حقائق" جنھیں میں نے بی بی سی تک پہنچایا اور جو بعد میں (جیسا کہ دہشت اور الجھاؤ کے نرغے میں آئے ہوئے مقامات سے بھیجے جانے والے حقائق کے ساتھ بالعموم ہوتا ہے) نادرست ثابت ہوئے۔ مجھے اب بھی اُن دنوں کے خواب دکھائی دیتے ہیں ـــــ اندھیرے گڑھوں اور کرب میں تڑپتے جسموں سے بھرے خواب۔ لندن واپس پہنچنے کے بعد شروع شروع میں میرے دوست بہت فکرمند رہے۔ کیا میں نے کاؤنسلنگ کی خدمات حاصل کیں؟ مجھے یقیناً اس

سلسلے میں کسی سے بات کرنی چاہیے۔ لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس سے ـــ یعنی لندن کے ایک کنسلٹنگ روم میں کسی دردمند شخص کے ساتھ معالجانہ گفتگو سے ـــ کیا فائدہ ہو گا، کیوں کہ معالج کا واحد مناسب رد عمل بے پناہ دہشت کا ہو گا؛ اس تجربے کو انگیز کرنے، اس کے ساتھ زندہ رہنا سیکھنے کا کوئی طریقہ نکالا نہیں جا سکے گا۔ میں نے روانڈا میں جو کچھ دیکھا وہ نسل کشی تھی ـــ اس لفظ کے استعمال میں پوری احتیاط برتی جانی چاہیے، لیکن میں نے اسے اُن معنوں میں استعمال کیا ہے جو پرائمو لیوی (Primo Levi) نے متعین کیے تھے: "لوگوں کے کسی پورے گروہ یا کلچر کو دنیا سے مکمل طور پر مٹا دینے کا جدید عزم"۔

روانڈا میں رہتے ہوئے میں اس عمل کے ادنیٰ سے حصے کو بھی وقوع پذیر ہونے سے نہ روک سکی۔ یہ تو میری سمجھ میں بھی ابھی تھوڑا بہت آنا شروع ہوا ہے۔ اُس وقت تو میرے بس میں فقط اتنا تھا کہ اسے ہوتے ہوئے دیکھتی اور زندہ بچنے کی کوشش کرتی رہوں۔

میں وہاں کیوں موجود تھی؟ کیوں کہ فری لانس خبر نگاری بے حد ناقابلِ اعتبار اور چناں چہ اتنا ہی متنوع پیشہ ہے۔ اس سے پچھلے دس برس میں نے زیادہ تر افریقا سے باہر رپورٹنگ کرنے میں گزارے تھے۔ کبھی کبھار میں امداد فراہم کرنے والے اداروں کے لیے ایسے ملکوں میں بھی کام کرتی ہوں جنھیں وہ "ایمرجنسی کی زد میں آئے ہوئے ملک" کہتے ہیں، یعنی ایسے ملک جہاں جنگ کے نتیجے میں بدحالی، بھوک اور بیماری پھیل گئی ہو۔ میں روانڈا کبھی نہیں گئی تھی۔ ۱۹۸۰ کے عشرے میں، جب میرا ٹھکانا نیروبی میں تھا، میری جن صحافیوں سے ملاقات ہوتی وہ اسے ایک بیزار کن جگہ بتاتے ـــ ایک ایسا ملک جہاں دہقان کھیتی باڑی میں لگے رہتے ہیں اور حکومت اپنے کاروبار میں۔ یہ افریقا کا سب سے گنجان آباد ملک تھا جہاں شرلاکھ افراد ایک اتنے سے رقبے میں رہنے کی کوشش کر رہے تھے جو ویلز سے زیادہ نہ تھا۔ اس کی سب سے بڑی برآمد کافی (coffee) تھی۔ روانڈا کے باشندے فرماں بردار تھے ـــ صرف "یہوواہ کے گواہ" نامی گروہ بیگار (umuganda) یعنی اس بے معاوضہ اجتماعی مزدوری میں حصہ لینے سے انکار کرتا جس کی بدولت حکومت ملک میں سڑکوں کا نظام تعمیر کرنے، جنگل اگانے اور پہاڑی ڈھلوانوں پر مٹی کے بہاؤ کو روکنے کے لیے پختہ رکاوٹیں بنانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ امدادی ادارے اُن دنوں روانڈا پر خاصے

مہربان تھے۔ صدر جووینال بابیاریمانا کی حکومت کو سخت گیر مگر مستعد اور موثر سمجھا جاتا تھا۔ معاشرہ کچھ ایسے خطوط پر استوار تھا کہ بدعنوانی کی گنجائش کم تھی؛ اگر شفاخانے قائم کرنے کے لیے رقم دی جاتی تو شفاخانے ہی قائم ہوتے۔ سوئٹزرلینڈ والوں نے افریقا میں اپنے جیسے نظم و ضبط کے پابند معاشرے کو دیکھ کر روانڈا کو براعظم کے دوسرے ملکوں کی نسبت کہیں زیادہ امداد دی۔

پچھلے سال مجھے اقوامِ متحدہ کے بچوں کے فنڈ، یونیسیف، کی جانب سے دو مہینے کے معاہدے کی پیش کش ہوئی۔ مجھے روانڈا اور برونڈی میں کام کرنے والی درجنوں امدادی تنظیموں کی سہولت کے لیے ایک نیوزلیٹر تیار کرنا تھا تاکہ وہ اپنے باہمی رابطے کو زیادہ موثر بنا سکیں اور دونوں ملکوں کی سیاست کو سمجھ سکیں۔

اس سے پہلے بلاشبہ چار سال طویل جنگ ہو چکی تھی۔ لیکن اس کا اختتام امن کے معاہدے پر ہوا تھا، اور فروری ۱۹۹۴ میں جب میں کیگالی پہنچی، یعنی صدر کے طیارے کے تباہ ہونے سے دو ماہ پہلے، کہیں کہیں کے دستی بم کے دھماکے یا اکادکا سیاسی قتل کو چھوڑ کر ملک کی صورت حال پُرامن تھی۔ روانڈا کے باہر ایسے واقعات کو خبر تک نہ سمجھا جاتا۔ روانڈا کے اندر ہر شخص کسی بات کے ہونے کا منتظر تھا: سیاسی معاہدوں پر عمل درآمد، جنگ کا دوبارہ آغاز، کوئی بھی بات۔

کیگالی پہاڑیوں کے ایک سلسلے پر پھیلا ہوا ہے اور، جب میں یہاں پہنچی تو تمام زمین فصلوں اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ہر طرف سبزے کی افراط تھی۔ تاہم، شہر خاصا بدوضع تھا۔ کنکریٹ کے بلاکوں کی دیواروں پر سے روغن جھڑ رہا تھا، اور ہر روز ہونے والی موسلادھار بارش ڈھلواں سڑکوں پر ہر طرف کیچڑ پھیلا دیتی۔ شہر میں چلتے پھرتے میرے پیچھے بچے "مزونگو مزونگو" پکارتے ہوئے دوڑا کرتے، جو ان کی زبان میں گوری چمڑی والوں کا نام ہے، اور ان کی اس عادت سے تہذیب کی اس کمی کا اندازہ ہوتا جو نیروبی یا کمپالا، بلکہ برونڈی کے صدر مقام بجومبورا تک میں محسوس نہ ہوتی تھی۔ امداد میں آنے والی کھیپ سے چرائی ہوئی چیزیں بازار میں بکتی تھیں، جیسے خوردنی تیل کے چوکور ڈبے جن پر کینیڈا کے میپل لیف یا یوروپی یونین کا ستاروں والا نشان بنا ہوتا۔ اگر درست لوگوں کا نام پتا معلوم ہو تو آپ تین ڈالر کے عوض ایک دستی بم بھی مول لے سکتے تھے۔

Scanned with CamScanner

"سیاسی طاقت،" ایک افریقی سفارت کار نے ایک شام مجھے بتایا، "روانڈا میں دولت تک پہنچنے کا واحد راستا ہے۔ یہاں کے زیادہ تر سیاست دانوں کے پاس تو لوٹ کر جانے کے لیے فارم بھی نہیں ہیں۔ اگر ان سے اقتدار چھن جائے تو ان کے پاس کچھ نہیں رہے گا۔"

یہ سفارت کار مجھے رات کے کھانے کے لیے ایک ریستوراں میں لے گیا جس کا مالک عفیف نامی ایک ماروئی لبنانی تھا جس کا اصل پیشہ عمارت سازی تھا۔ ریستوراں میں ہمارے سوا کوئی نہ تھا۔ چند ایک سازندے، روانڈا کے روایتی لباس کے طور پر لمبے لبادے پہنے، مُوٹھی موسیقی بجا رہے تھے۔ موڈ غم انگیز تھا۔ عفیف کی رقم عوامی تعمیرات کی وزارت کی طرف نکلتی تھی اور کسی صورت اس کے ہاتھ نہ آ رہی تھی۔ "جب سے جمہوریت آئی ہے، پانی تک پینا محال ہو گیا ہے،" وہ بولا۔ اُس شام اس کا اور سفارت کار کا بیش تر وقت فون پر سیاست دانوں سے باتیں کر کے یہ ٹوہ لگانے میں گزرا کہ حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا سمجھوتے کیے گئے ہیں۔ میں نے عفیف سے اس کے تعلقات کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اکثر وزیروں کو رشوت دے چکا ہے، اور وہ اس سے خوف زدہ ہیں۔

دن کے وقت میری گفتگوئیں اور طرح کی ہوتی تھیں۔ مغربی امدادی اداروں کے کارکن روانڈا کو دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھنے کو ترجیح دیتے تھے، یعنی اس انسانیت نواز انداز سے جس کا اظہار یوں ہوتا تھا کہ پچھلے ہفتے غذا کے کتنے تھیلے پہنچائے گئے اور کتنے بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگائے گئے۔ سیاست، یا یہ بات کہ روانڈا کے باشندے اپنے حال اور مستقبل کی بابت کیا خیالات رکھتے ہیں، اس دنیا میں کم ہی وجود رکھتی تھی۔ دفتر کی دیوار پر لگے نقشے میں کیمپوں کے جھنڈ دکھائے گئے تھے جن میں دو قسم کے پناہ گزیں آباد تھے: شمال میں وہ لوگ جو روانڈا میں ہونے والی جنگ کے باعث بے گھر ہوئے، اور جنوب میں وہ جو بروندی میں چند ماہ پہلے ہونے والی فوجی بغاوت کی کوشش سے جان بچا کر بھاگے تھے۔ بعض مقامات پر خشک سالی اور قحط کی صورت حال تھی اور ملیریا پھیل رہا تھا۔ شہروں اور قصبوں میں حاملہ عورتوں میں سے نصف ایڈز کے ایچ آئی وی وائرس سے متاثر تھیں۔ آبادی بڑھ رہی تھی؛ زمین کی قلت تھی۔ چناں چہ غذا کے تھیلوں اور حفاظتی ٹیکوں کے موضوعات کیا کیا جانا چاہیے قسم کی بات چیت، یعنی مایوسی کے ماتم، کو ٹالنے کا ایک ذریعہ تھے۔

روانڈا کے جو باشندے یونیسیف میں کام کرتے تھے وہ سیاست پر بات کرنے کو کسی

طرح تیار نہ ہوتے تھے۔ سیکرٹری لڑکیاں مجھے کمپیوٹر کا استعمال سکھلاتیں اور اپنے درزی سے متعارف کرانے کا وعدہ کرتیں۔ وہ میرے سوالوں کو کندھے اچکا کر ٹال جاتیں۔ "یہاں کے لوگ بڑے خطرناک ہیں،" ایک نے کہا، "منہ پر جھوٹ بول دیتے ہیں۔"

اور تب، ایک دن، مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ یونیسیف کا اپنا پہلا نیوز لیٹر تیار کرتے ہوئے میں نے جنگل میں رہنے والے بونے "ٹوا" (Twa) لوگوں کی چھوٹی سی آبادی کو درپیش مسائل کے بارے میں جنوب مغربی روانڈا کی کیتھولک ریلیف سروس کی ایک اندرونی رپورٹ کا اقتباس دے دیا۔ "خشک سالی کے باعث یہ لوگ کھیتوں پر مزدوری حاصل نہیں کر پا رہے ہیں، اس لیے ان میں چوری چکاری کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ جب یہ لوگ پکڑے جاتے ہیں تو انھیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔"

یونیسیف نے میری رپورٹ کا مسودہ واپس بھیجا تو اس اقتباس پر لکیر پھیر دی گئی تھی۔ مجھے ہدایت کی گئی کہ اس حوالے کو حذف کر دوں اور آئندہ ٹوا لوگوں کا نام تک لینے سے باز رہوں۔ یا ہوتو قبیلے کے افراد کا۔ یا توتسیوں کا۔ لوگوں کے نسلی گروہ ــــ اُن کی ethnie ــــ کی طرف اشارہ کرنا نہایت خطرناک ہے، کیوں کہ یہ ایک انتہائی حساس معاملہ ہے۔ اگر کسی تنازعے میں کسی مخصوص گروہ پر حملہ ہو یا اسے پہنچنے والا نقصان غیر متوازن طور پر زیادہ ہو، تو مجھے اس کی طرف توجہ دلانے سے احتراز کرنا چاہیے۔ روانڈا کے تمام رہنے والے صرف روانڈا کے شہری ہیں۔

یہ ایک ایسے سچ سے انکار تھا جو کسی انتہائی ناواقف غیر ملکی پر بھی پوری طرح عیاں تھا، اگرچہ اس انکار کی بنیاد ضرور نیک نیتی پر تھی۔ جب کوئی غیر ملکی افریقا میں آتا ہے اور کسی ملک کے باشندوں کے درمیان کوئی نہایت ظالمانہ اور بھونڈی بات ہوتے دیکھتا ہے، تو اس موقعے پر "قدیم قبائلی نفرتیں" جیسے فقروں میں چھپی آسان ترین توضیح اس کے کام آتی ہے، یا پھر یہ سادہ خیال کہ براعظم افریقا کو قطع کرتی ہوئی سیدھی سرحدیں، جو یوروپی باشندوں کی کھینچی ہوئی ہیں، محض نقشہ نویسی کے کام کا نتیجہ ہیں؛ اور ان سرحدوں نے، خود کو ایک جدید قومی ریاست کے پرچم تلے ساتھ رہنے پر مجبور، انسانوں کے مختلف گروہوں ــــ یا، اگر آپ کو یہی لفظ پسند ہے تو، قبیلوں ــــ کے مابین زمین یا طاقت ہتھیانے کی قدیم کش مکش کی صرف پردہ پوشی کی ہے، اس

کش مکش کو حل نہیں کیا۔ پھر غیر ملکی کی ملاقات افریقی باشندوں سے ہوتی ہے جو اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ سفید لوگ خود اپنے باہمی تنازعات کا ذکر کرتے ہوئے "قبائلیت" کا کوئی حوالہ نہیں دیتے؛ اور یہ کہ ان علاقوں کو اپنی نو آبادی بنانے والے یوروپی باشندے قبائلی امتیازات کو اپنا استعمار قائم رکھنے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں؛ اور یہ کہ "قبائلیت" کا تصور افریقی سیاست اور تاریخ کی پیچیدگیوں کو نظر سے اوجھل کر دیتا ہے۔ چناں چہ دردمند غیر ملکی یہ اصطلاح استعمال کرنا ترک کر دیتا ہے: ہم اس لفظ کا سامنا کرنے سے کترانے لگتے ہیں، افریقا میں کن سے اس کے نسلی گروہ کی بابت دریافت کرنے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔ لفظوں سے خوف زدہ ہو کر ہم اس حقیقت ہی کی پردہ پوشی کر دیتے ہیں یہ الفاظ جس کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

روانڈا میں قبائلیت کا تصور خاص طور پر نامناسب ہے۔ زبان، رسم و رواج اور علاقوں کے بیش تر امتیازات، جو افریقا کے کسی اور ملک میں ایک قبیلے کو دوسرے سے جدا شناخت کرنے کے کام آتے ہیں، یہاں وجود نہیں رکھتے۔ روانڈا میں رہنے والے تمام لوگ ایک ہی زبان — کینیاروانڈا — بولتے ہیں، ان کا کلچر ایک ہے، اور وہ انھیں پہاڑیوں پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ اور اس کے باوجود ان کے درمیان تقسیم موجود ہے۔ ایک طرف ہُوتُو ہیں جن پر آبادی کی بڑی اکثریت مشتمل ہے (کہا جاتا ہے کہ وہ نوّے فیصد ہیں، اگرچہ مردم شماری کے نتائج پر پوری طرح اعتبار نہیں کیا جا سکتا)، اور دوسری طرف تُوتسی۔ ان کے علاوہ ٹوا بھی ہیں۔ بچوں کے لیے کوئی رہنما کتاب لکھی جائے تو اس میں کہا جائے گا کہ تُوتسی بالعموم ہوتو باشندوں کے مقابلے میں دراز قد ہوتے ہیں، اور اس کے بعد ان میں باہم امتیاز کرنے والی کسی اور ظاہری خصوصیت کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔

لیکن روانڈا کے لوگ اس بارے میں بہتر علم رکھتے ہیں۔ وہ خاندان اور حسب نسب کے بارے میں بات کر کے ایک دوسرے کی اصل کا پتا چلا لیتے ہیں۔ غیر ملکی اتنے چابک دست نہیں ہوتے، چناں چہ پوچھنے سے بھی کتراتے ہیں۔ اس کے باوجود "ایتھنی"، یعنی تاریخ اور نظریات کا ڈھالا ہوا پیچیدہ نسلی احساس، ہی روانڈا کے باشندوں کے لیے شناخت کا تعین کرنے والا بنیادی نقطہ ہے۔ یہ احساس قبائلیت سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور شدّت آمیز ہے۔ غیر ملکی شاید یہ سمجھتے

رہے ہوں کہ نسلی تقسیم کی سیاست کو نظر انداز کرنا ہی محفوظ ترین طریقِ عمل ہے، لیکن یہ احساس ہماری سمجھ میں پوری طرح نہیں آیا، اور اگر آ بھی جاتا تو ہم اس کے متوقع نتائج پر کبھی یقین نہ کر پاتے۔ کیوں کہ انجام کار اس نسلی تقسیم ہی کی بنیاد پر یہ فیصلہ ہونا تھا کہ کن لوگوں کو زندہ رہنا ہے اور کنھیں مار دیا جانا ہے۔

۲

میرا خیال ہے کہ مجھے گزشتہ چند برسوں سے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ یہ نسلی تقسیم کیا نتائج پیدا کر سکتی ہے، کیوں کہ میں یوگنڈا میں روانڈا کے پناہ گزینوں سے مل چکی تھی۔ وہ اس بات کی شہادت تھے کہ روانڈا، جہاں کی واحد اور حکمراں جماعت خود کو "ترقی کی تحریک" کے طور پر متعارف کراتی ہے، اس سے پہلے بھی تشدد اور سیاسی انتشار کے دور سے گزر چکا ہے۔ یہ پناہ گزیں تُوتسی تھے، یعنی اُس اقلیت سے تعلق رکھتے تھے جس نے نوآبادیاتی دور سے پہلے روانڈا پر حکمرانی کی تھی اور نوآبادیاتی زمانے میں بھی اپنی بالادستی برقرار رکھی تھی۔ ۱۹۶۲ میں جب بیلجیئن رخصت ہوئے اور اکثریتی ہُوتوؤں کے پاس اقتدار آیا تو انھیں کھدیڑ کر باہر نکال دیا گیا۔ یہ تُوتسی روانڈا کی سرحد سے کچھ باہر یوگنڈا میں قائم کیمپوں میں رہ رہے تھے، لیکن وہ ایک کامیاب برادری تھے؛ ان میں بعض اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یوروپ اور شمالی امریکا کی یونیورسٹیوں میں بھیجتے تھے۔ پھر ۱۹۹۰ میں ان تُوتسی جلاوطنوں کی ایک فوج نے، خود کو روانڈن پیٹریاٹک فرنٹ (RPF) کا نام دے کر، روانڈا پر حملہ کر دیا۔ انھیں تقریباً فوراً ہی پسپا کر دیا گیا لیکن وہ جلد ہی پھر یکجا ہو گئے اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۹۴ کے آتے آتے آر پی ایف ایک ترقی یافتہ گُریلا فوج بن چکی تھی جو بڑھتی، پسپا ہوتی اور پھر پیش قدمی کرتی تھی۔

جنگ نے دس لاکھ تک ہُوتو کسانوں کو اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان میں سے کئی لاکھ کیگالی شہر کے باہر کیمپوں میں تکلیف دہ حالات میں رہ رہے تھے، لیکن منصوبہ یہ تھا کہ بہت جلد یہ لوگ ـــــ اور گزشتہ عشروں کے بے گھر تُوتسی پناہ گزیں بھی ـــــ اپنے اپنے گھروں کو

لوٹ جائیں گے۔ اگست ۱۹۹۳ میں شمالی تنزانیا کے شہر آروشا میں امن کے معاہدے پر دستخط ہو چکے تھے جس کی رو سے حکومت اور باغیوں کی اقتدار میں شراکت ہونی تھی اور اس کی نگرانی کے لیے اقوامِ متحدہ کے سپاہی بلوائے جانے تھے۔ باغی لیڈروں کو عبوری حکومت میں شامل کر کے وزیر بنایا جانا تھا۔ سفارت کار افریقا میں تنازعات کے حل کے ایک قابلِ تقلید نمونے کے طور پر معاہدۂ آروشا کا تذکرہ کرنے لگے تھے۔ (اور بلاشبہ حل کرنے کے لیے تنازعات کی کوئی کمی نہ تھی۔ روانڈا میں تقریباً چار لاکھ افراد پر مشتمل ایک اَور بے گھر آبادی بھی موجود تھی جو اکتوبر میں ایک ناکام فوجی بغاوت کے رونما ہونے کے بعد، جس میں بروندی کا ہُوتو صدر مارا گیا تھا، روانڈا کی جنوبی سرحد پار کر کے ملک میں داخل ہوئی تھی۔ بروندی کی فوج میں تُوتسیوں کا غلبہ تھا اور روانڈا میں داخل ہونے والے پناہ گزیں ہُوتو تھے۔ وہ قابلِ رحم کیمپوں میں رہ رہے تھے جن کی نشان دہی ہمارے دفتر کی دیوار پر لگے ہوئے نقشے میں کی گئی تھی۔ بین الاقوامی برادری کافی مقدار میں غذا فراہم کرنے سے قاصر رہی تھی؛ ان پناہ گزینوں کے بچوں میں سے بہت سے مر رہے تھے۔)

مارچ میں میں نے یوگنڈا کی سرحد کے قریب آر پی ایف کے ایک جلسے میں شرکت کی۔ آر پی ایف کے حامی، جو تمام توتسی تھے، بسیں بھر بھر کر، آنے والے اچھے دنوں کی باتیں کرتے، کیگالی سے وہاں پہنچے۔ اقوام متحدہ کے ایک دفتر میں سیکرٹری کے طور پر کام کرنے والی تیریز آر پی ایف کے کارکنوں میں سے اپنے لیے شوہر تلاش کر پانے کے امکان پر پُرجوش تھی۔ "یہ لڑکے بڑے ہینڈسم ہیں۔ آر پی ایف کو شہر میں آ لینے دو، پھر اگر تم چاہو تو تمہارے لیے بھی ایک عدد شوہر کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

وہ آر پی ایف سے ہم دردی رکھنے کے شبے میں ۱۹۹۰ میں چار مہینے کی قید کاٹ چکی تھی۔ اس کی عمر پینتیس برس کے لگ بھگ تھی اور اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کی وجہ استھنی کو قرار دیتی تھی۔ "ہُوتو مردوں کو، جو سول سروس یا دوسری اچھی ملازمتوں پر ہوں، توتسی عورتوں سے شادی کی اجازت نہیں،" اس نے کہا۔ یہ بات پورے طور پر سچ نہ تھی۔ صرف سپاہی پیشہ مردوں کو توتسی عورتوں سے شادی کی ممانعت تھی ـــــ ورنہ بااختیار ہوتو مردوں میں توتسی بیوی رکھنا اسٹیٹس کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اصل مسئلہ، میں نے خیال کیا، یہ تھا کہ تیریز جیسی توتسی عورتیں ہُوتو مردوں سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔

Scanned with CamScanner

میں نے اپنے کرائے کے مکان میں بسنے کی کوشش شروع کی۔ غیر ملکیوں کی سی معاملہ فہمی سے کام لے کر میں نے ایوارسیتے سے اس کے نسلی پس منظر کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا، لیکن وہ دراز قد اور چھریرے بدن کا تھا اور اس کی ناک پتلی تھی، اور یہ تمام جسمانی علامات وہ تھیں جو توتسیوں میں پائی جاتی ہیں، اور مکان کی مالکہ نے مجھ پر اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ توتسی ہے۔

خیر، میں اسے کچھ زیادہ نہ جانتی تھی اور اس کا نسلی پس منظر میرے لیے کوئی اہم مسئلہ نہ تھا۔ وہ محض چوکیدار تھا۔ براعظم افریقا کے دوسرے شہروں کی طرح کیگالی میں آ بسنے والے غیر ملکی، اور مال دار دیسی بھی، اپنے مکانوں کی حفاظت کے لیے ذمّو (zammu) یا چوکیدار رکھتے تھے۔ دولت مند لوگ ہمیشہ غریبوں کے نرغے اور پہرے میں رہتے ہیں۔ کیگالی میں جوں جوں جرائم اور فائرنگ میں اضافہ ہوتا گیا، یہ ذمّو لوگ رفتہ رفتہ سیکھ گئے کہ دروازہ صرف گوری رنگت والوں کے لیے کھولا جانا ہے، یا پھر اُن کالوں کے لیے جو امدادی اداروں کے نشان والی گاڑیوں میں آئے ہوں۔

میری اور ایوارسیتے کی بات چیت مالک اور ملازم کے درمیان ہونے والی سلام دعا تک محدود تھی۔ "بوں ژور مادام!" "بوں ژور ایوارسیتے! کیسے ہو؟" وہ فرانسیسی بولتے ہوئے جھجکتا تھا اور کبھی گفتگو خود نہ چھیڑتا۔ اس نے جنریٹر لگانے میں ہماری مدد کی۔ صدر کے ہلاک ہونے سے پہلے کے تناؤزدہ ہفتوں میں، شہر کے اس حصے میں جہاں ہم رہتے تھے، ہفتے میں دو شاموں تک محدود ہو گئی تھی۔ جنریٹر کی گھڑگھڑاہٹ نے وقفے وقفے سے ہونے والے دستی بموں کے دھماکوں اور بندوقیں چلنے کی آوازوں کو کسی قدر ڈھانپ لیا؛ اس سے پیدا ہونے والی روشنی میں ہم کام کرنے اور پڑھنے کے قابل ہو گئے۔ میں رات میں عموماً باہر نہیں جاتی تھی۔

کیگالی میں اپنے قیام کے پہلے چند ہفتے میں نے ایک ہوٹل میں گزارے تھے۔ وہاں میں بار کی چھپر کی چھت کے نیچے لکڑی کی بھدّی میزوں میں سے ایک پر بیٹھ کر لوگوں کو دیکھا کرتی۔ ایک شام چمڑے کی جیکٹ پہنے ایک نوجوان آیا اور باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے بیلجیئم کی ایک یونیورسٹی میں جگہ مل گئی ہے لیکن ویزا دینے سے انکار کر دیا گیا ہے۔

میں ایستھنی کے مسئلے کو سمجھنا چاہتی تھی ـــــ اس موضوع پر کسی اجنبی سے بات کرنا نسبتاً آسان تھا ـــــ چناں چہ میں نے اس کا شناختی کارڈ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے بٹوے میں

سے اپنا کارڈ نکالا۔ نام، باپ کا نام، مقامِ پیدائش، مقامِ سکونت، ایتھنی۔ اس آخری خانے میں ہوتو، توتسی، ٹوا اور "نیچرلائزڈ" میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تھا۔ آخرالذکر درجہ روانڈا کی شہریت حاصل کرنے والے غیر ملکیوں کے لیے تھا۔

"یہ بیلجیئم والوں کا کیا دھرا ہے،" وہ بولا۔ "انھوں ہی نے ہم پر یہ کارڈ رکھنے کی پابندی لگائی تھی۔"

"لیکن بیلجیئم والوں کو تو رخصت ہوئے تیس برس ہو چکے ہیں! تم لوگوں نے یہ سلسلہ ختم کیوں نہیں کر دیا؟ آخر کینیا والوں نے بھی تو یہی کیا ہے،" میں نے کہا۔

"آپ نہیں جانتیں بیلجیئم والے کس قسم کے لوگ تھے،" اس نے کہا۔ "انھوں نے ہمیں اپنی نوآبادی بنایا اور ہمیں یہ شناختی کارڈ دیے۔ اب وہ مجھے ویزا تک دینے کو تیار نہیں۔ یہ تو نسل پرستی ہے!"

ایک سنیچر کی رات کو لوگوں کی ایک ٹولی نے بار میں دستی بم پھینکا۔ آٹھ آدمی ہلاک اور تیس زخمی ہوئے۔ ہوٹل ملک کے واحد نمایاں توتسی سیاست داں کی ملکیت تھا۔ چند دن بعد کچھ توتسی گھروں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرنے والے بم پھینکے گئے۔ اسپتال خنجروں اور بم کے نوکدار ٹکڑوں سے زخمی ہونے والوں سے بھر گئے۔ اس کے بعد جلد ہی میں ہوٹل سے اس مکان میں اٹھ آئی۔ میں شامیں گھر ہی پر گزارتی اور "مڈل مارچ" پڑھتی رہتی۔ اور تب صدر کا طیارہ مار گرایا گیا۔

۳

صدر کے مارے جانے کے فوری بعد کے دنوں میں مَیں نے اور ایوارِستے نے ایک معمول طے کر لیا۔ فائرنگ کے مدھم پڑنے پر میں چند گھنٹوں کے لیے سو جاتی؛ صبح سورج نکلنے کے وقت جب فائرنگ دوبارہ شروع ہوتی تو میں ٹیلیفون کے پاس بیٹھ کر کام کرنے لگتی۔ غیر ملکی افراد جلد از جلد وہاں سے نکلنے کی کوششوں میں مصروف تھے، لیکن میں نے اپنا خبر نگار والا کردار دوبارہ اختیار کر لیا اور وہیں رکی رہی۔

قاتل سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر کے اور گھروں میں گھس گھس کر لوگوں کو ہلاک کرنے میں مشغول تھے۔ دن میں ایک بار ایوارستے اپنے ایک پڑوسی کو فون کر کے پتا لگانے کی کوشش کرتا کہ آیا اس کی بیوی اور دونوں بچے اب تک زندہ ہیں۔

میں سوچتی: وہ ٹوتسیوں کی گھات میں ہیں۔ کسی بھی لمحے ایوارِستے پر حملہ کریں گے۔

میں نے اسے مکان کی مالکہ کے بیڈروم میں سونے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، جو گھر میں موجود نہیں تھی ـــــ میرا خیال تھا وہ وہاں محفوظ رہے گا ـــــ لیکن اس نے انکار کر دیا، پہلے یہ کہہ کر کہ وہ مالکہ کے بستر میں سونے کی جرأت نہیں کر سکتا؛ اور بعد میں یہ کہہ کر کہ گشت کے سپاہیوں نے علاقے کے تمام چوکیداروں کو ہدایت کی ہے کہ مکان کے باہر رہ کر صرف اپنے کام، یعنی امیر لوگوں کے مکانوں کی حفاظت، پر توجہ دیں۔ اور سپاہیوں کی ہدایت میری بات سے زیادہ موثر تھی۔

ٹیلی فون پر مجھے خبریں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں وصول ہوتیں جنھیں میں جوڑ کر مکمل کرنے کی کوشش کرتی اور پھر لندن ارسال کرتی۔ مردوں کے ایک گروہ نے ایک امدادی ادارے کے کارکن کے گھر میں داخل ہو کر مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنے توتسی باورچی کو ان کے حوالے کر دے۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، لیکن انھوں نے کسی نہ کسی طرح باورچی کو ڈھونڈ نکالا اور ہلاک کر دیا۔ وزیراعظم آگاتھے اُووی لنگی یمانا، جو ہُوتو تھی، اور ہوٹل کا توتسی مالک، دونوں مارے جا چکے تھے۔ اقوام متحدہ کے دس بیلجیمَن سپاہی بھی ہلاک کر دیے گئے تھے کیوں کہ بیلجیمَ کو آر پی ایف کا حامی تصور کیا جاتا تھا؛ قاتلوں کا کہنا تھا کہ صدر کا طیارہ مار گرانے کے واقعے میں بیلجیمَ کا ہاتھ ہے۔ آر پی ایف نے شمال میں اپنے مورچے چھوڑ کر کیگالی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی۔

میں یونیسیف سے تعلق رکھنے والے جن روانڈائی باشندوں سے واقف تھی وہ مجھے شہر کے مضافاتی علاقوں سے فون کرتے۔ ان کا لیے دیے رہنے کا رویہ رخصت ہو چکا تھا، اب ان کی بے تعلقی کی تہہ ایسی دبیز نہ تھی جیسی دفتر میں ہوا کرتی تھی، اور اب وہ مدد کے طالب تھے۔ میرا ایک ساتھی، فرانسوا، ہوتو تھا لیکن اس کا بیٹا، جس کا قد توتسیوں کی طرح لمبا تھا، اپنا شناختی کارڈ کھو بیٹھا تھا۔ "انھوں نے اسے قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ میں نے انھیں ریڈیو دیا تب اس کی جان بچی۔ اگر وہ دوبارہ آگئے تو میں کیا کروں گا؟"

Scanned with CamScanner

"انھیں تھوڑے تھوڑے کر کے پیسے دو، سب کچھ ایک ساتھ مت دینا،" میں نے مشورہ دیا۔

"مگر ایک اَور مسئلہ بھی ہے۔ انھوں نے میرے پڑوسی موسیو البیر کو مار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اس کا دوست تھا، مگر یہ غلط ہے، میں تو اسے ٹھیک سے جانتا بھی نہ تھا۔ وہ بیلجیئن تھا۔ میں نے سفارت خانے کو فون کیا ہے لیکن وہ آ کر لاش اٹھانے کو تیار نہیں ہیں۔ اب اس میں سے بُو اٹھنے لگی ہے۔"

"اسے دفن کر دو،" میں نے کہا۔ "یہ تو لوگوں کی صحت کے لیے خطرہ ہے۔"

"لیکن وہ گورا ہے۔ اس کی تدفین مناسب طریقے سے ہونی چاہیے۔"

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی رنگت کیا ہے؛ اب تو وہ مر چکا ہے۔ بس اسے زمین میں گاڑ کر دعا پڑھ دو۔"

"لیکن سپاہی کہیں گے کہ میں نے اسے اس لیے دفن کیا ہے کہ وہ میرا دوست تھا۔ تب کیا ہو گا؟"

"ان سے کہہ دینا تم اسے نہیں جانتے تھے۔ تم نے اسے اس لیے دفنایا ہے کہ لاش سڑنے لگی تھی۔"

اگلے دن فرانسوا کا پھر فون آیا۔ "شکریہ،" وہ بولا۔ "میں نے تمھاری بات پر عمل کیا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم نے گھر کے سامنے گڑھا کھود کر اسے دفنا دیا۔ ممکن ہے جنگ ختم ہونے کے بعد بیلجیئم والے اس کی لاش لینے آئیں۔"

"ہو سکتا ہے،" میں نے کہا، اور سوچا: بس؟ میں صرف اتنا ہی کر سکتی ہوں؟ کہ پڑی ہوئی لاش کو دفنانے کا مشورہ دے دوں؟

فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔ اس بار دفتر کی ایک اَور ساتھی فرانسواز کا فون تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں توتسی تھی ـــــ درازقد، ہلکی رنگت اور لچکیلے بدن والی ـــــ اور اُن عورتوں میں سے ایک تھی جن کے ساتھ جا کر میں نے پچھلے ماہ آر پی ایف کے جلسے میں شرکت کی تھی۔ اب وہ ہسٹیریائی انداز میں سسکیاں لے رہی تھی اور ایک الماری میں چھپی بیٹھی تھی۔ اس کے عم زاد کو اس کے گھر کے باہر سڑک پر مار دیا گیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اب اس کے خاندان کی باری ہے۔ "اگر انھیں رقم اور زیورات دے دیے جائیں تو وہ ہلاک نہیں کرتے۔ لیکن ہم انھیں سب کچھ دے چکے ہیں۔" وہ

چاہتی تھی کہ اقوام متحدہ اس کی جان بچا لے، لیکن اقوام متحدہ صرف غیر ملکیوں کو باہر نکال رہی تھی۔

آر پی ایف کا ایک دستہ پارلیمنٹ کی پرانی عمارت کی دیوار توڑ کر باہر نکل آیا تھا اور اس نے صدارتی محافظوں پر حملہ کر دیا تھا۔ فائرنگ سے ایرپورٹ جانے والی سڑک بند ہو گئی تھی۔ معاہدۂ آروشا کی حمایت کرنے والے تمام سیاست داں یا تو مر چکے تھے یا روپوش تھے۔ ایک نئی حکومت نے خود اقتدار سنبھال لیا تھا۔

میں نے منصوبہ بنانے کی کوشش کی کہ کسی طرح اپنے جاننے والے لوگوں کی جان بچا کر انھیں خطرے کے علاقوں سے نکالا جائے۔ مگر میں خود کو بہلا رہی تھی ـــــ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ جان بچا کر بھاگنے والے توتسیوں کو گاڑیوں سے کھینچ کھینچ کر اتارا اور قتل کیا جا رہا تھا۔ میری گاڑی میں پٹرول تقریباً ختم ہو چکا تھا، اور میں ان مضافاتی علاقوں سے بھی واقف نہ تھی جہاں وہ لوگ رہتے تھے۔

ایک سہ پہر کو انٹرنیشنل ریڈ کراس سے کسی کا فون آیا۔ وہ سیکڑوں، بلکہ شاید ہزاروں، لاشیں دیکھ چکا تھا، جن سے ایک ایسے قتلِ عام کا پتا چلتا تھا جو ہمارے تصور سے کہیں بدتر تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر مجھے درست رپورٹنگ کرنی ہے تو خود جا کر دیکھنا ہو گا۔ اگلی صبح میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر سڑکوں پر نکلی اور بیسر پیتے سپاہیوں اور توجہ سے محروم پڑی لاشوں کے برابر سے گزر کر ریڈ کراس کے ہیڈ کوارٹر پہنچی، اور وہاں سے ایک میڈیکل ٹیم کو ساتھ لے کر مضافات میں واقع ریڈ کراس کے ڈپو تک گئی۔ اندر دو عورتیں، جو فائرنگ سے زخمی ہوئی تھیں، درد سے کراہ رہی تھیں۔ عمارت کے پچھلی طرف پانچ لاشیں پڑی تھیں۔ پہاڑی کی چوٹی پر ایک مکان کے باہر کھڑے دو سپاہیوں نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ہمیں اندر جاتا دیکھتے رہے۔ پانچوں عورتوں کی لاشیں پھولوں کی کیاری میں اوپر تلے پڑی تھیں۔ ان کے چہرے دہشت میں منجمد ہو چکے تھے؛ مکھیاں ان کے خنجروں کے زخموں سے بہتے خون پر رینگ رہی تھیں۔ ایک عورت نے، جس نے وادی کی دوسری جانب سے یہ منظر دیکھا تھا، بتایا کہ کچھ توتسی حفاظت کے خیال سے ریڈ کراس کے ڈپو میں جمع ہو گئے تھے۔ صبح کے وقت بیس کے قریب سپاہی وہاں پہنچے۔ جن لوگوں کو

انھوں نے موقعے پر قتل نہ کیا ان کو اپنے ساتھ مارچ کرا کے پہاڑی کے اوپر والے مکان میں لے جا کر مار ڈالا۔

ہم نے عمارت میں داخل ہو کر کانچ کے ٹکڑوں، پھٹے ہوئے کاغذوں، ٹوٹے فرنیچر اور برتنوں کے درمیان سے راستا بنایا۔ وہاں کی بے ترتیبی سے قتل کی، غصے اور دیوانگی کی وحشت کا پتا چلتا تھا۔

زخمیوں کو ہم نے مرکزی اسپتال پہنچایا۔ مرتے ہوئے لوگ ایک ایک بستر پر دو دو اور تین تین، اور فرش پر پڑے ہوئے تھے اور وارڈ میں داخل ہونے کا راستا بند تھا۔ نرسیں ان کے اوپر سے پھلانگ کر اندر جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں پر اور نالیوں میں خون بہہ رہا تھا۔ ٹرک، جن میں اوپر تک لاشیں بھری تھیں، ایک کے بعد ایک آئے چلے جا رہے تھے۔ ایک عورت ایک بچے کو باہوں میں اٹھائے وارڈ میں آئی جس کی ایک ٹانگ آدھی کٹ گئی تھی اور اندر کے عضلات اور نسیں دکھائی دے رہی تھیں۔ زخمیوں کے رشتے دار تحمل سے اپنی کہانیاں سناتے، جو سب کی سب ایک جیسی تھیں ـــــ بُوتو پڑوسیوں اور سپاہیوں نے ان کے گھر میں دستی بم پھینک دیا تھا کیوں کہ وہ توتسی تھے۔

اُسی رات، ہمارے رخصت ہونے کے بعد، سپاہی وارڈ میں گھس آئے اور انھوں نے زیادہ تر زخمیوں کو ختم کر دیا۔

میں اپنے مکان میں واپس چلی آئی۔ ایوارسٹے اب بھی وہیں تھا۔ اگلی صبح، یعنی اس بے خواب رات کے ختم ہونے پر، میں لونگ روم میں پہنچی اور بیٹھ کر رونے لگی۔

ایوارسٹے میرے بالکل سامنے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ آخر کار وہ فرانسیسی میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آپ کیوں رو رہی ہیں، مادام؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے،" میں نے جواب دیا۔ وہ منتظر رہا۔

"ڈریے مت،" بہت دیر بعد وہ بولا۔

میں نے اسے بتایا کہ مجھے جانا ہوگا، میں اس مکان میں زیادہ عرصے نہیں رہ سکتی کیوں کہ فون جلد ہی کٹ جائے گا، اور فون کے بغیر میں اپنا کام نہیں کر سکوں گی۔ مجھے یہ مکان چھوڑ کر اُس ہوٹل میں جانا ہوگا جہاں دوسرے اخبار نویس ٹھہرے ہوئے ہیں۔ لیکن میں اُسے تنہا نہیں چھوڑنا

چاہتی۔ ایوارسیتے کے پاس اس بات کا نہایت سادہ جواب تھا۔

"آپ یورپین ہیں، آپ کو دوسرے یورپینوں کے ساتھ رہنا چاہیے،" اس نے کہا۔

اقوام متحدہ کا سکیورٹی افسر، فرانس کا ایک رنگین مزاج سابق سپاہی جسے اس کے ریڈیو کے علامتی نام "موستاش" (مونچھ) سے جانا جاتا تھا، اپنی گاڑی میں محض ایک مسلح محافظ کو ساتھ لیے، غیر ملکیوں کو نرغے سے نکالتا پھر رہا تھا۔ جب اس نے نیویارک میں اپنے ہیڈکوارٹر سے رابطہ قائم کر کے اپنے روانڈائی ساتھیوں کی جان بچانے کی اجازت طلب کی تو وہاں سے انکار کر دیا گیا۔ اسے اقوام متحدہ کی فوج کے سپاہیوں کی بھی مدد حاصل نہ تھی کیوں کہ وہ سب پسپا ہو کر بیرکوں میں جا چکے تھے۔ دو مہینے پہلے جب اقوام متحدہ کے تمام عملے کو نقشے پر اپنے اپنے مکان کی نشان دہی کرنے کی ہدایت کی گئی تھی، تاکہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں انھیں وہاں سے نکالا جا سکے، تو میں نے یہ سوچ کر اسے نظر انداز کر دیا تھا کہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں میں یہاں ٹھہرنے کو ترجیح دوں گی۔ اب میں نے موستاش کو فون کیا۔

"آخر کار تمھارا فون آ ہی گیا!" وہ بولا۔ "جلدی بتاؤ تم کہاں ہو، میں ابھی پہنچتا ہوں۔"

وہ مجھے ایک ایسے مکان میں لے گیا جہاں مجھے، ایوارسیتے کی پیش گوئی کے عین مطابق، اپنے چاروں طرف یوروپی باشندے دکھائی دیے۔ دوسرے اخبار نویس بھی آتے گئے اور میں ایک ہوٹل میں منتقل ہو گئی۔ چند روز بعد میں کیگالی سے نیروبی روانہ ہو گئی، اور پھر نیروبی سے برونڈی، جہاں مجھے سرحد پر جا کر اس مقتل سے، جو روانڈا بن چکا تھا، جنوب کی طرف فرار ہونے والے اوّلیں پناہ گزینوں سے ملنا تھا۔

۴

روانڈا کے صدر جووینال بابیاریمانا سے، جو ۶ اپریل کو طیارے کے حادثے میں مارا گیا، آر پی ایف کے توتسی تو نفرت کرتے ہی تھے، لیکن جو انتہا پسند لوگ اس کے اپنے ہوتو خاندان اور اس کی اپنی سیاسی پارٹی کے نزدیک تھے وہ اور زیادہ نفرت کرتے تھے۔

Scanned with CamScanner

بابیاریمانا نے معاہدۂ آروشا پر عمل درآمد کو ٹالنے کی حتی المقدور پوری کوشش کی تھی۔ معاہدے کے مطابق صدارت کے عہدے کے بیشتر اختیارات لے لیے جانے تھے، اور اس کی پارٹی نیشنل ریپبلیکن موومنٹ فار ڈویلپمنٹ اینڈ ڈیموکریسی (MRNDD) کو نہ صرف اپوزیشن کی دوسری ہو تو پارٹیوں کے ساتھ مل کر حکومت چلانی پڑتی بلکہ توتسیوں کے غلبے والی پارٹی آر پی ایف کو بھی ساتھ رکھنا پڑتا۔ اس کے نمائندوں نے مذاکرات میں اس کی ناک نیچی کرادی تھی، اور باغیوں نے بڑی سختی سے اپنی باتیں منوالی تھیں۔ اکیس برس کی بے روک ٹوک حکمرانی کے بعد اسے ایک ایسی پالیسی کا پابند کر دیا گیا تھا جس سے اس کا اقتدار متزلزل ہو جانے والا تھا۔ اس کی بیوی بھی اس پر خوش نہ تھی۔

روانڈا کی سیاست میں ہر ادارے کا ایک غیر سرکاری حصہ بھی ہوتا ہے۔ حکومت تو صدر ہی کی تھی، لیکن "آکازو" یعنی گھرانا بھی موجود تھا ـــــ یہ لفظ انیسویں صدی کے توتسی بادشاہوں کے دربار کا نام تھا اور اب بھی حکمراں سے قربت رکھنے والوں کی مختصر سی جماعت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آکازو پر صدر کی بیوی ایگنس اور اس کے بھائیوں کا کنٹرول تھا، چناں چہ دولت اور اقتدار تک ان کی رسائی تھی۔ اور ایک طرف صدر کی پارٹی معاہدۂ آروشا کی حامی تھی، تو دوسری طرف کمیٹی فار ڈیفنس آف ڈیموکریسی (CDR)، جسے بابیاریمانا کی خفیہ مالی پشت پناہی حاصل تھی، انتہا پسندانہ ہُوتو نظریات کا پرچار کرتی تھی اور باغیوں سے کسی بھی قسم کے سمجھوتے کی سخت مخالف تھی۔

تمام پارٹیاں یوتھ ونگ کے پردے میں اپنی اپنی مسلح ملیشیائیں رکھتی تھیں ـــــ ایم آر این ڈی ڈی کی ملیشیا کو "متحد حملہ آور" کا نام دیا گیا تھا؛ سی ڈی آر کی ملیشیا کو "ایک منزل کے راہی" سمجھا جاتا تھا۔ یہ ملیشیائیں سیاست دانوں کے حکم پر بموں کے دھماکے، فائرنگ اور چاقوزنی کی وارداتیں کرتی تھیں جب کہ پارٹی کے رہنما امن کی باتیں کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ فوج اور سرکاری ریڈیو اسٹیشن تک پر ان کا سایہ موجود تھا۔ ۱۹۹۳ میں ہونے والی ایک جنگ بندی کی رو سے فوج، کم از کم کاغذی کارروائی کی حد تک، بیرکوں میں بند ہو گئی تھی، لیکن اس کے ارکان، جن کے ڈیتھ اسکواڈ "زیرو نیٹ ورک" کے نام سے جانے جاتے تھے، ایک فوجی کرنل کی کمان میں مسلسل فعال رہے۔ اور ایک طرف ریاستی ملکیت کا ریڈیو روانڈا سرکاری پالیسی ـــــ بھائی چارے

اور دوستی ــــ کی حمایت کر رہا تھا، مگر دوسری طرف تجارتی ریڈیو اسٹیشن، ریڈیو مل کولنز، انتہا پسندانہ ہُوتو پروپیگنڈا، لوک گیت اور اس قسم کے کلمات نشر کر رہا تھا کہ "میں ان ہوتوؤں سے نفرت کرتا ہوں جو توتسیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔" علاوہ ازیں اس اسٹیشن سے ان توتسیوں کے ناموں کی فہرست بھی نشر کی جاتی تھیں جنھیں قتل کیا جانا تھا۔

بابیاریمانا نے سازش اور جوڑ توڑ کر کے، اور رشوت اور دھمکیوں کے زور پر، اپوزیشن پارٹیوں میں تفرقہ ڈال دیا تھا۔ آروشا میں طے پانے والے معاہدے میں بتایا گیا تھا کہ کون کون سی وزارت کس پارٹی کے حصے میں آئے گی۔ مارچ تک یہ پارٹیاں انتشار کا شکار رہیں۔ دو بار سفارت کار اور اہم شخصیات حلف برداری کی تقریب کے لیے اپنی نشستوں پر بیٹھے انتظار کرتے رہے کہ صدر آ کر نئی اسمبلی کو حلف دلائے، لیکن دونوں مرتبہ وہ نہیں آیا۔ اس نے اپنے دوستوں، زائیر کے صدر موبوتو اور ٹوگو کے صدر ایاڈیما سے مشورے کیے جنھیں مقبولیت کے بغیر حکمراں رہنے کے فن میں استاد کا درجہ حاصل ہے۔ اقوام متحدہ کی نفاذ امن کی فوج، جسے وہاں تبدیلی کے اس عمل کی نگرانی کے لیے تعینات کیا گیا تھا، بڑبڑانے اور واپسی کی باتیں کرنے لگی۔

آخر کار، تنزانیا میں ہونے والے ایک سربراہی اجلاس میں بابیاریمانا کو علاقے کے دوسرے رہنماؤں کے دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور اس نے ٹال مٹول ترک کر کے معاہدۂ آروشا پر عمل درآمد کرنے کا وعدہ کیا۔ ابھی وہ روانڈا واپس آنے کے سفر ہی میں تھا کہ اس کے طیارے کو مار گرایا گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا ذمے دار کون تھا، لیکن شواہد ان انتہا پسند ہُوتو افراد کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو کبھی بابیاریمانا کے قریب رہے تھے۔

۵

کسی چھوٹے ملک میں، جس کی رسائی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی تک نہ ہو، نسل کشی کے عمل کا دارومدار بموں، بندوقوں، لاٹھیوں اور چاقوؤں پر ہوتا ہے، اور ان افراد پر جو ان ہتھیاروں کو استعمال کر سکیں، اور ایک تفصیلی منصوبے پر ــــ کہ کسے کب قتل کیا جانا ہے۔ پھر نسل کشی کے جواز کی

تلاش ہوتی ہے۔ یہ جواز نظریات بہ آسانی فراہم کر دیتے ہیں۔ اس طرح، کہا جا سکتا ہے، نسل کشی کے لیے تین قسم کے افراد کی ضرورت ہوتی ہے: قاتل، منصوبہ ساز اور نظریہ باز۔ روانڈا کی غیر سرکاری افواج، سیاسی پارٹیوں اور ریڈیو کے نشریوں نے تینوں قسم کے افراد فراہم کر دیے۔ لیکن یہ تمام نئے ادارے تھے؛ اس قسم کے اداروں کو تاریخ اور اساطیر کا سہارا بھی درکار ہوتا ہے۔

تمام معاشرے اپنے اساطیر سے تقویت پاتے ہیں، اور روانڈا میں اساطیر غیر معمولی طور پر طاقت ور ہیں۔ ماضی کی کہانیوں میں تاریخ اور داستانیں ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہیں، جنھیں بار بار نت نئی شکلوں میں ڈھال کر، اور بار بار دُہرا کر، حکمرانوں کی طاقت یا محکوموں کی بغاوت کو جواز فراہم کیا جاتا ہے۔ ماضی کے سوالوں کی گونج ـــ ہم کون ہیں؟ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ ـــ حال میں شامل رہتی ہے: کسی ملک کی زمین پر کس کا حق ہے اور کون ملک بدر کر دیے جانے کے لائق ہے؟ ایک مشہور روانڈائی روایت کچھ یوں بیان کی جاتی ہے:

> وقت کی ابتدا میں روانڈا کا پہلا بادشاہ کیگوا آسمان سے اُترا اور تین بیٹوں کا باپ بنا: گاٹوا، گاہوتو اور گاتوسی۔ اس نے ان تینوں کو رات بھر دودھ سے بھری ایک ایک ناند کی نگرانی کرنے کو کہا۔
>
> گاٹوا کو پیاس لگی اور اس نے دودھ پی لیا۔
>
> گاہوتو کو نیند آ گئی اور سوتے میں ٹھوکر لگنے سے ناند اُلٹ گئی۔
>
> گاتوسی نے بڑی ہوشیاری سے دودھ کی نگرانی کی اور جب صبح کے وقت بادشاہ کیگوا واپس آیا تو اس وقت بھی وہ دودھ کی نگرانی کر رہا تھا۔
>
> کیگوا نے اس آزمائش کے نتیجے میں تینوں کے سماجی مقام کا تعین کیا۔ گاتوسی اس کا جانشیں، مویشیوں کا مالک اور جسمانی مشقت سے مامون ہو گا۔ گاہوتو اور اس کے گھر والوں کو مویشی رکھنے کی صرف اس صورت میں اجازت ہو گی کہ وہ گاتوسی کے لیے کام کریں۔ گاٹوا کے لیے مویشی

رکھنا ممنوع ہو گا اور وہ باقی لوگوں سے الگ تھلگ رہے گا۔

توتسیوں کی فوقیت کا تصور روانڈا کے تمام باشندوں کے لاشعور میں بیٹھا ہوا ہے؛ اس تصور کے زیرِاثر پیدا ہونے والے طرزِ عمل کو جھٹلانے کے لیے اپنی ذات کے خلاف شعوری بغاوت کرنی پڑتی ہے۔ علم نہیں بلکہ نظریہ ہتھیار کے طور پر سے کام آتا ہے؛ ہر شخص اپنی پسند کے سیاسی پروپیگنڈے کو تقویت دینے، یا قتل و غارت کا جواز فراہم کرنے، کے لیے تاریخ کی اپنے طور پر تعبیر کرتا ہے۔

دریائے نیل کا منبع تلاش کرنے والے یورپی کھوجی پہلی بار انیسویں صدی کے نصف آخر میں روانڈا سے آشنا ہوئے۔ براعظم افریقا کے اس حصے میں انھیں لوگوں کے تین قسم کے گروہ دکھائی دیے جن میں سے ہر ایک اپنا اپنا مخصوص اور متعین سماجی کردار انجام دے رہا تھا۔ ریاست کی تجسیم بادشاہ ـــ موامی (mwami) کی ذات میں ہوتی تھی جس کے پاس ایک مقدس ڈھول، کالنگا، تھا۔ توتسی، بیگار کے عوض، ہوتوؤں کو مویشی پالنے اور فصلیں اگانے کا حق عطا کرتے تھے۔ سماجی امتیازات کی سرحدیں ناقابلِ عبور نہ تھیں ـــ کوئی ہوتو باشندہ بھی مویشیوں کا مالک بن کر، اور پھر توتسی عورت سے شادی کر کے، توتسی کے رتبے تک پہنچ سکتا تھا ـــ لیکن نوآبادیاتی دور سے ذرا پہلے کے توتسی بادشاہوں کی حکمرانی میں ان سرحدوں کو عبور کرنا رفتہ رفتہ زیادہ دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ اس معاشرے کے بارے میں بہت سے سوالات اٹھائے جا سکتے تھے: کیا ہوتو محض غلام ہیں جنھیں توتسی امرا نے بزور دبا رکھا ہے، یا ان کے مابین رشتہ دونوں کے لیے منافع بخش ہے؟ لیکن اس کے بجائے یورپی باشندوں کے ذہنوں پر ایک، اس سے کہیں زیادہ سادہ، سوال مسلط ہو گیا: توتسی آخر اتنے دراز قد کیوں کر ہوتے ہیں؟ اس دور پر ڈارون کے نظریات کا غلبہ تھا جن کی مدد سے نسلی فوقیت کا نظریہ ڈھالا جانے لگا تھا جو بعض ضمنی، جعلی، علوم ـــ anthropometry, craniology, phrenology ـــ سے بھی لیس تھا، چناں چہ اس سوال کے ممکنہ جوابات کی کوئی کمی نہ تھی۔ توتسی یورپی تخیل پر گویا سوار ہو گئے تھے۔ جان ہیننگ اسپیک (John Hanning Speke) کا، جس نے ۱۸۶۲ میں دریائے نیل کا منبع دریافت کیا، یہ فیصلہ تھا کہ توتسی حبشہ (اتھیوپیا) کے اورومو باشندوں کے اخلاف ہیں، اور یہ کہ وہ

ایک اعلیٰ نسل ہیں جس نے کمتر بانتو نسل کے ہوتو باشندوں کو مفتوح بنایا تھا۔ روانڈا پر ۱۸۹۰ سے ۱۹۱۶ تک جرمنی کے اور اس کے بعد بیلجیئم کے نوآبادیاتی تسلط نے مزید نظریوں کو جنم دیا: یہ کہ توتسی مسیحیت کا گم شدہ قبیلہ ہیں، کہ وہ اطلانتس کی تباہی سے زندہ بچ جانے والا گروہ ہیں، کہ وہ قدیم مصریوں کی نسل سے ہیں، کہ وہ ایشیائے کوچک سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ تاہم رفتہ رفتہ اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا جو اسپیک کے اولیں نظریے سے قریب تھی: کہ توتسی باشندے دراصل "نائلو ہیمائٹ" (Nilo-Hamites) ہیں ـــــ اس اصطلاح میں "نائلو" کا لفظ دریائے نیل کی اور "ہیمائٹ" نوح کے بیٹے ہام کی نمائندگی کرتا ہے ـــــ اور یہ کہ وہ اِتھیوپیا سے سولھویں صدی میں اتر کر جنوب کے علاقے میں پہنچے تھے۔

ایک اوائلی جرمن کھوجی، ڈیوک آف میکلن برگ، نے نہایت والہانہ انداز میں لکھا تھا: "ان کی بلند پیشانی، نتھنوں کے نازک خم اور چہرے کی نفیس بیضوی ساخت سے ان کے غیر ملکی ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت ملتا ہے۔" اس کے برعکس ہوتو "میانہ قد ہیں جن کے بھدّے نقوش مشقت کی زندگی کے عکاس ہیں اور وہ بعد میں آنے والے، مگر حکمراں، گروہ، یعنی توتسیوں، کے فرماں بردار غلام ہیں۔"

بیلجیئن ماہرین بشریات نے جسمانی پیمائش کے ایک باقاعدہ پروگرام کی بنیاد رکھی۔ ایک مطالعے میں بتایا گیا تھا کہ ایک اوسط توتسی ناک ۵۵٫۸ ملی میٹر لمبی اور ۳۸٫۷ ملی میٹر چوڑی ہوتی ہے، جبکہ ایک اوسط ہوتو ناک کی لمبائی ۵۲٫۴ ملی میٹر اور چوڑائی ۴۳٫۶ ملی میٹر ہوتی ہے۔ قد، وزن، ناک کی پیمائش اور چہرے کی لمبائی اور دوسری پیمائشوں کا پورا حساب لگایا جاتا اور اس کے نتائج مرتب کر کے برسلز بھیجے جاتے۔ بیسویں صدی کے آخری برسوں کے تناظر میں انسانی جسم کی پیمائشوں سے اس شدید شغف کو ممکن ہے مضحکہ خیز سمجھا جائے، لیکن صدر کے طیارے کی تباہی کے کوئی مہینا بھر بعد روانڈا میں مَیں نے ڈاکٹروں کو ایسے بچوں کے ہاتھوں کی مرہم پٹی کرتے دیکھا جن کی انگلیاں ہوتو حملہ آوروں نے اس لیے کاٹ ڈالی تھیں کہ لمبی انگلیاں توتسیوں کی نشانی سمجھی جاتی تھیں۔ ہوتو توتسیوں کی ٹانگیں بھی گھٹنوں کے پاس سے کاٹ ڈالتے تھے، "تاکہ ان کا قد ہمارے جتنا ہو جائے"۔

Scanned with CamScanner

بیلجیئن انتظامیہ کے لیے جسمانی پیمائش شناخت کا ایک نہایت ناقص پیمانہ تھا، چناں چہ ۱۹۳۰ کے عشرے میں اس درجہ بندی کو زیادہ باضابطہ بنانے کے لیے شناختی کارڈ رائج کیے گئے۔ دس سے زیادہ مویشیوں کے مالک ہر شخص کو توتسی قرار دیا گیا، اور اس سے کم مویشیوں کے مالک ہوتو ٹھہرے۔ ۱۹۵۰ کے عشرے تک جو چند ایک ہوتو باشندے مشنری اسکولوں میں تعلیم حاصل کر چکے تھے، تبدیلی کا، سرکاری نوکریوں کا، اقتدار میں شراکت کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ افریقا کے دوسرے خطوں میں نوآبادیاتی تسلط کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں لوگوں سے کہا جا رہا تھا کہ وہ "قبیلے" کی شناخت پر زور دینے والے شناختی کارڈوں کو جلا ڈالیں۔ تاہم روانڈا میں ہوتو سیاسی رہنما شناختی کارڈوں کے سلسلے کو قائم رکھنا چاہتے تھے تاکہ توتسیوں کو پہچانا جا سکے اور ان کے سماجی، معاشی اور سیاسی غلبے کا خاتمہ کیا جا سکے۔

توتسی ہونا یوں بھی اب فیشن سے باہر کی بات ہو چلا تھا۔ بعد از جنگ یوروپ میں معاشرتی جمہوریت مقبولیت حاصل کرتی جا رہی تھی، اور روانڈا آنے والے متعدد مشنری پادریوں نے توتسی بادشاہت کو، اس کے برتری کے زعم اور طاقت کی اجارہ داری کے باعث، ناگوار پایا۔ علاوہ ازیں، جوں جوں آزادی کی منزل قریب آتی گئی، توتسیوں نے رفتہ رفتہ پان افریکن ازم اور نوآبادیاتی تسلط کی مخالفت کے نظریات اختیار کرنا شروع کر دیے؛ اب بیلجیئنوں کو یہ فکر ہوئی کہ کہیں روانڈا چین یا سوویت یونین کے کیمپ میں نہ چلا جائے۔ انھوں نے روانڈا کو ایک ہی عقلمندانہ وار میں جاگیرداری اور کمیونزم دونوں سے بچا لینے کا فیصلہ کیا۔ چالیس برس تک توتسیوں کی بالادستی کی زور شور سے پشت پناہی کرنے کے بعد، اب انھوں نے توتسیوں کے خلاف ہوتوؤں کا ساتھ دینے کی پالیسی اختیار کر لی۔ آزادی سے دو برس قبل، ۱۹۵۹ میں، تشدد کا آغاز ہو گیا، اور بیلجیئنوں نے اسے روکنے کی کوئی خاص کوشش نہ کی۔ توتسی سیاسی کارکن ہوتو رہنماؤں کو قتل کرتے، جس سے مشتعل ہو کر ہوتو کسانوں کے دس دس کے گروہ، سیٹی سے لیس ایک "صدر" کی قیادت میں، توتسیوں کے گھر جلانے کی مہم پر نکل کھڑے ہوتے۔ کسان ان مہمات کو "مویاگا" (muyaga) یعنی طوفانی ہوائیں کہتے تھے۔ ۱۹۶۳ تک ان طوفانی ہواؤں نے ایک لاکھ ۳۵ ہزار توتسیوں کو روانڈا سے جان بچا کر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا، اور ہوتو رہنماؤں نے اس بات کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ انھیں مفرور توتسیوں کی اولاد نے بعد میں آر پی ایف کی بنیاد رکھی۔ ایک انتہا پسند ہوتو نظریہ

ساز، لیوں موگے سیرا (Leon Mugesera) نے ۱۹۹۲ میں ہوتو کسانوں کے ایک اجتماع کو مخاطب کر کے کہا: "۱۹۵۹ میں ہم سے یہ مہلک غلطی ہوئی تھی کہ ہم نے انھیں نکل جانے دیا تھا۔" ۱۹۹۴ کے آتے آتے ہوتو لیڈر اجتماعی قتل کا پرچار کرنے لگے تھے۔ "اس بار ہم ان سب کو مار دیں گے۔" جن لوگوں نے بچوں کو قتل کیا وہ روانڈا کی یہ قدیم کہاوت دُہراتے تھے: "چوہوں کا خاتمہ کرنے کے لیے ان کے بچوں کو بھی ٹھکانے لگانا لازمی ہے۔"

اور یوں، آزادی کے بعد، ایک نیا روانڈا قائم ہوا جس میں پرانے معاشرتی حسبِ مراتب کو اُلٹ کر گویا سر کے بل کھڑا کر دیا گیا۔ ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلوں کے لیے کوٹے مقرر کیے گئے؛ کسی شخص کا ملازمت یا داخلہ حاصل کرنا یا کسی سرکاری عہدے تک پہنچنا اس پر منحصر تھا کہ اس کی ایتھنی کیا ہے ـــــ بس فرق یہ تھا کہ اب ہوتو شناخت کو فوقیت حاصل تھی۔ کالنگا یا ڈھول، جو قدیم موامی دور سے روانڈا کی علامت چلا آ رہا تھا، اب توتسی بالادستی کا نشان قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ آزادی کے بعد روانڈا کے پاس علامت نہیں بلکہ ایک نظریہ تھا: ہوتو قوت کا نظریہ، جو فرماں برداری اور نظم و ضبط کے کلچر میں پوری طرح پیوست تھا۔ روانڈا کے ہر شہری کو اپنی پیدائش کے دن سے ملک کی واحد سیاسی تنظیم، یعنی صدر بابیاریمانا کی ریپبلیکن موومنٹ فار نیشنل ڈویلپمنٹ، کا رکن تصور کیا جاتا تھا۔ چند گھروں کے ایک گروپ کو "سیلول" کہا جاتا تھا؛ ہر سیلول کا ایک ترجمان ہوتا جو اپنے سے ایک سیڑھی اوپر، یعنی سیکٹر کے سربراہ "کونسلر"، کا ماتحت ہوتا۔ کونسلر سے اوپر "بورگ میستر"، یعنی کمیون کے سربراہ، کا درجہ تھا، اور وہ صوبے یا "پری فیکتر" کے سربراہ کا ماتحت تھا... اور یوں یہ سلسلہ ایک ایک سیڑھی کر کے حکومت کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچتا۔ اگر روانڈا کا کوئی شہری اپنی سکونت کی پہاڑی سے کہیں اور منتقل ہونا چاہتا تو اسے حکام سے اجازت لینی پڑتی۔ دوسرے افریقی دارالحکومتوں کے برخلاف کیگالی کم آبادی والا شہر، اور دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کے سیلاب سے محفوظ، رہا؛ اس بارے میں روانڈا کے قوانین جنوبی افریقی قوانین سے بھی زیادہ سخت تھے۔

باہر سے آنے والے لوگ جو کچھ دیکھتے، یا جو کچھ دیکھنا پسند کرتے، وہ محض اس نظریے کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ظاہری نظم و ضبط، ترقی اور قدامت پرست مسیحیت تھی جو انھیں زائیر یا سودان جیسے ملکوں سے، جہاں سیاسی تعطل اور انتشار کے باعث ترقی کی بابت مغربی

تصورات بے معنی ہو کر رہ گئے تھے، خوشگوار طور پر مختلف محسوس ہوتی۔ جو کچھ باہر سے آنے والوں کو سنائی نہ دیتا، یا جسے وہ ان سنا کر دیتے، وہ ایتھنی کا تصور تھا جو مقتدر نظریے کو ایندھن فراہم کرتا تھا؛ جس کی بنیاد اس خوف پر تھی کہ کہیں ماضی، توتسی حسبِ مراتب کے سابق نظام کی شکل میں، واپس نہ لوٹ آئے۔ آخر روانڈا کے جنوب کی طرف، برونڈی میں، جہاں توتسی فوج ہوتو کسانوں کو قتل کر رہی تھی، ماضی کے اثرات کبھی دور نہیں ہو سکے تھے۔

چناں چہ ہوتوؤں کو تاریخ کا وہی سبق پڑھایا گیا جو ہوتو حکمرانوں کی تعبیر سے مطابقت رکھتا تھا۔ فرڈیننڈ ناہیمانا نے، جو روانڈا کی نیشنل یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر اور ریڈیو مل کولنز کا بانی ہے، توتسیوں سے وابستہ مسحور کن روایات کا ابطال کرنے کی کوشش میں وضاحت کی کہ یوروپی محققوں نے توتسی سلطنتوں میں محکوم ہوتوؤں کا تو مطالعہ کیا لیکن ان ہوتو ریاستوں (principalities) کی طرف توجہ نہ کی جو ۱۹۲۰ کے عشرے تک توتسی جارحیت کی مزاحمت کرتی رہی تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توتسیوں کی حاکمیت کوئی ناگزیر شے نہیں ہے، بس شرط یہ ہے کہ توتسیوں کو قابو میں رکھا جا سکے۔ توتسیوں کو نہ صرف شہریت سے محروم رکھا جانا تھا، بلکہ انھیں زندگی سے محروم کیا جانا بھی ضروری تھا، کیوں کہ وہ "اِنیانگا روانڈا"، یعنی روانڈا سے نفرت کرنے والے لوگ تھے۔

لیوں موگے سیرا نے، جو صدر ہابیاریمانا کے آبائی صوبے میں اس کی پارٹی کا نائب صدر تھا، تاریخ کی تعبیر ایک اور انداز میں کی۔ اس نے اس یوروپی خیال سے اتفاق کیا کہ توتسی روانڈا میں نسبتاً بعد کے آنے والوں میں سے ہیں اور کوئی چار صدی پہلے اِتھیوپیا سے وہاں پہنچے تھے۔ ۱۹۹۲ میں — جب کہ ہوتو نظریہ خاصا ترقی پا چکا تھا — اپنی ایک تقریر میں موگے سیرا نے کہا کہ توتسیوں کو دریائے نیاوارُنگا کے تیز رفتار راستے سے ان کے اصل وطن واپس بھیج دیا جانا چاہیے۔ دو سال بعد قتل کیے گئے توتسیوں کی لاشیں دریائے نیاوارُنگا سے بہہ کر دریائے کاگیرا میں داخل ہو رہی تھیں، جہاں انھیں تنزانیا کی سرحد پر بنے پُل کے نیچے سے ایک لاش فی منٹ کی رفتار سے بہتا ہوا دیکھا جا سکتا تھا۔ افریقی دریاؤں کے بہاؤ کے لحاظ سے اس راستے سے اِتھیوپیا پہنچنا ناممکن تھا، چناں چہ یہ لاشیں جھیل وکٹوریا کے کنارے تک پہنچ کر رک گئیں اور دھوپ میں سڑنے لگیں۔

Scanned with CamScanner

۶

کیگالی سے رخصت ہونے کے دو ماہ بعد میں روانڈا کے ایک جنوبی شہر بُوتارے (Butare) واپس آئی جو کبھی اپنے رواداری اور آزاد خیالی کے ماحول کے لیے مشہور تھا۔ سڑکوں پر کھڑی کی گئی رکاوٹیں ہوتو "متحد حملہ آور" دستوں کے کنٹرول میں تھیں (گو یہ کنٹرول زیادہ عرصے تک برقرار رہنے والا نہیں تھا: آر پی ایف، صدر کی ہلاکت کے بعد خود بخود قائم ہو جانے والی عبوری حکومت کو معزول کرنے کے بعد، جنوب کی طرف پیش قدمی کرتی آ رہی تھی)، اور وہاں ہزاروں توتسی قتل کیے جا چکے تھے۔ قتل ہونے والوں میں یونیورسٹی کے ہوتو طالب علم اور استاد بھی شامل تھے جنھیں آر پی ایف کا ہمدرد خیال کیا جاتا تھا۔

میں بُوتارے سے چند میل مغرب کی طرف پہاڑیوں میں واقع قصبے گیکونگورو (Gikongoro) گئی۔ "انسانی ہمدردی کے مشن" پر آئے ہوئے فرانسیسی فوجیوں نے اس علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور وہاں ہوتو پناہ گزیں جمع ہوتے جا رہے تھے۔ دو نوجوان، ایک استاد اور ایک ریڈ کراس کا رضاکار، ان میں شامل تھے۔ انھوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ پچھلے دس ہلاکت خیز ہفتوں کے دوران بُوتارے میں کیا ہوتا رہا۔

"توتسیوں نے ایک انجمن بنا لی تھی،" استاد نے کہا۔ "وہ تمام ہوتوؤں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ان کے گھروں سے ان منصوبوں کے دستاویزی ثبوت برآمد ہوئے ہیں۔ جب لوگوں کو یہ کاغذات ملے تو وہ اشتعال میں آ گئے۔ لہٰذا انھوں نے توتسیوں کو قتل کر دیا۔"

میں نے یونیورسٹی کے اُن ہوتو طالب علموں اور استادوں کے بارے میں دریافت کیا جو دوسرے ہوتوؤں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔

"وہ بھی سازش میں شریک تھے۔"

"تو پھر اس تمام قتل و غارت کا ذمے دار کون ہے؟"

"ذمے دار قتل ہونے والے ہیں۔"

میں نے اپنے سوالوں پر اصرار کیا۔ "اور وہ بچے جو مار ڈالے گئے، کیا وہ بھی اپنی موت کے خود ذمے دار تھے؟"

Scanned with CamScanner

"یہ خاندانوں کے مابین نفرت کا معاملہ تھا،" ریڈکراس کے رضاکار نے کہا۔ "بہت سے توتسیوں نے اپنے بچوں کو آر پی ایف میں شامل کرنے کے لیے بھیج دیا تھا، لہذا لوگوں نے کہا کہ ہم ایسے کسی شخص کے بچوں کو بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتے جو ایسی بُری حرکات میں ملوث ہو۔"

یہ دونوں تعلیم یافتہ تھے اور فرانسیسی زبان روانی سے بول سکتے تھے۔ اور ان کے لہجے میں کسی قسم کا مخفی طنز بھی نہیں تھا؛ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنی سنائی ہوئی کہانی پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے لہجے میں صرف اُس وقت ذرا سی لڑکھڑاہٹ آئی جب میں نے سوال کیا کہ آیا خود انھوں نے بھی قتلِ عام میں حصہ لیا تھا۔

"نہیں، میں ذاتی طور پر تو شامل نہیں تھا،" استاد نے کہا، اور دوسرے نے بھی تائید میں سر ہلایا۔ "مگر ہم اس میں شامل ہونے والے لوگوں کے جذبات کو سمجھتے ہیں۔ یہ جنگ ہے۔ لوگوں کا مارا جانا بہر حال افسوس کی بات ہے۔"

"کیا آپ کو توتسیوں کے مارے جانے کا افسوس ہے؟" میں نے پوچھا۔

استاد نے ایک کہاوت دُہرائی: "اگر تمھارے سامنے ایک جال بچھا ہوا ہو، اور تمھارے اس میں گرنے سے پہلے کوئی اسے تمھارے راستے سے ہٹا دے تو تم خوش ہو گے یا نہیں؟ ہم بھی خوش ہیں۔"

۷

اگست میں جب میں روانڈا کے مغربی حصے میں واقع شہر کیبویے (Kibuye) پہنچی، تب تک ایک گرجاگھر میں قتل کیے جانے والے چار ہزار توتسیوں کو دفن ہوئے بہت دن گزر چکے تھے۔ یہ گرجاگھر جھیل کیوُو (Kivu) کے پُرسکون نیلے پانی سے کچھ اوپر کی بلند زمین پر گھنے درختوں میں گھرا کھڑا ہے۔ توتسیوں نے وہاں پناہ لے رکھی تھی جب کیلے کی شراب کے نشے میں دُھت ایک ہجوم نے پہلے کھڑکیوں اور دروازوں میں سے دستی بم پھینکے، اور پھر اندر گھس کر لاٹھیوں اور چاقوؤں سے زندہ بچ جانے والوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ یہ عمل تقریباً تین گھنٹے جاری رہا۔ چند

Scanned with CamScanner

روز بعد اسی طرح کے منظم گروہ نے مقامی اسپورٹس اسٹیڈیم میں یہی کچھ کیا جہاں صدارتی پارٹی کے صوبائی لیڈر، کلیمنٹ کائی شیما، نے توتسیوں کو اکٹھا ہونے کی ہدایت کی تھی۔ وہاں گیارہ ہزار لوگ جمع تھے۔ ہجوم پہلے دن ان سب کو ہلاک نہ کر سکا، لہذا اگلی صبح اپنا کام مکمل کرنے دوبارہ آیا۔ ایک زمانہ تھا کہ صوبہ کیبوے میں توتسیوں کی آبادی ساٹھ ہزار تھی اور مقامی آبادی میں ان کا تناسب غیر معمولی طور پر زیادہ، یعنی تقریباً بیس فیصد، تھا۔ اب، فرانسیسی فوجیوں کے لگائے ہوئے تخمینے کے مطابق، ہر دس میں سے نو توتسی ہلاک کیے جا چکے ہیں، اور ہو تو مردوں کی نصف، اور ہو تو عورتوں کی نصف سے کچھ کم، تعداد نے اس قتلِ عام میں حصہ لیا۔

ایک لوتھرن پادری برنارڈ نیدوتیے، خود اس کے اپنے الفاظ میں، اس قتلِ عام میں "غیر عملی طور پر شریک" تھا۔ جب میں کیبوے میں اس سے ملی تب اس نے ایک مقامی پرائمری اسکول کو یتیم اور بے سہارا ہو جانے والے بچوں کے گھر میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ ایک دُبلا اور بے چین شخص تھا؛ اس نے بتایا کہ اسے اس مرکز میں رہنے والے بچوں کے لیے کافی غذا دستیاب نہیں ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں اس کا ضمیر بھی اسے پریشان کر رہا ہے۔ قتل کے دنوں میں "متحد حملہ آور"، اپنے چہروں اور اعضائے تناسل کو کیلے کے پتوں سے ڈھانپے، سیٹیاں بجاتے اور ڈھول پیٹتے، ہر صبح سویرے کیبوے سے گزرتے تھے۔ "وہ ایک ایک گھر پر جاتے اور کہتے: آؤ، حملے میں ہمارا ساتھ دو۔ توتسی لوگوں کو قتل کرتے پھر رہے ہیں۔ ہمیں آر پی ایف کے تمام ساتھیوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔" نیدوتیے کے گھر میں انھیں تین توتسی بچے دکھائی دیے، جو اس کے اپنے بچوں کے ساتھ اسکول میں پڑھتے تھے اور جنھیں اس نے چھپا رکھا تھا۔ وہ دونوں بچیوں کو ساتھ لے گئے اور سات سالہ لڑکے کو وہیں ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ "انھوں نے کہا کہ میں نے آر پی ایف والوں کے بچوں کو پناہ دی تھی اس لیے میں بھی آر پی ایف کا ہمدرد ہوں۔ بعد میں انھوں نے مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے پر مجبور کیا۔ وہ سب لوگوں کو قتل میں اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے تھے،" اس نے بتایا۔ "جو لوگ مزاحمت کرتے ان کے ساتھ زبردستی کی جاتی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ آپ آر پی ایف کے حامی نہیں ہیں، آپ کو لاٹھی یا ڈنڈا لے کر چلنا پڑتا۔ ہم حملہ آوروں کے پیچھے پیچھے چلتے اور لاشوں کو دفناتے رہے۔"

"کیا آپ نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی؟" میں نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

"میں نے اپنی ٹانگ پر پٹی باندھ کر زخمی ہونے کا بہانہ کیا۔ پادری ہونے کی وجہ سے معافی نہیں مل سکتی تھی کیوں کہ ان کا کہنا تھا کہ آر پی ایف میں بھی پادری موجود ہیں۔ وہ کہتے تھے: مذہب وذہب بعد میں دیکھا جائے گا۔"

میں نے دریافت کیا کہ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اتنے سارے لوگوں نے قتل میں حصہ لیا اور خود اس جیسے لوگ بھی انکار نہ کر سکے۔

نیدوتیے نے اپنے ذخیرۂ الفاظ میں سے ایسے لفظ ڈھونڈ کر نکالنے کی کوشش کی جو کسی غیر ملکی کی سمجھ میں آسکیں۔

"ایسا بھی وقت آتا ہے جب آدمی کا ایمان رخصت ہو جاتا ہے، وہ اپنے قابو میں نہیں رہتا اور شیطان کے اثر میں آجاتا ہے۔"

کچھ لوگوں نے واقعی مزاحمت کی تھی۔ اس سال کے آخر میں جب میں کیگالی واپس گئی تو میری ملاقات ایک عمر رسیدہ ہوتو سے ہوئی جس نے سترہ توتسیوں کو پناہ دے کر اپنی جان کو خطرے میں ڈال لیا تھا۔ وہ اپنے محلے کا ہیرو تھا۔ وہ اس قسم کی تنہا مثال نہیں تھا، لیکن یہ سچ ہے کہ ایسی مثالیں بہت کم تھیں۔ لوگوں نے سودے بازی بھی کی ـــــ اگر وہ دوسری پہاڑی پر رہنے والے توتسیوں کو قتل کرنے میں حصہ لیں تو اُن کے توتسی رشتے داروں کی جاں بخشی کر دی جائے گی۔ توتسی مردوں کی ہوتو بیویوں کو مجبور کیا گیا کہ خود اپنے بچوں کو قتل کر دیں، جبکہ ایسی بعض عورتوں نے اپنے پڑوسیوں کے بچوں کو قتل کرنے کے عوض اپنے بچوں کی جان بچالی۔

اس نسل کشی کے دوران تدریس کے پیشے سے منسلک ایک شخص نے کاغذوں کا ایک دستہ میرے حوالے کیا جس پر "وزارت دفاع" کا نشان بنا ہوا تھا اور نمایاں انداز سے "خفیہ" کی مہر لگائی گئی تھی۔ اس کا عنوان تھا: "دشمن کی تعریف اور اس کی شناخت کا طریقہ۔" مجھے بتایا گیا کہ یہ دستاویز ۱۹۹۲ کے بعد سے روانڈا میں وسیع پیمانے پر گردش کرتی رہی ہے۔ "بنیادی دشمن" کے ذیل میں کہا گیا تھا: "ملک میں اور ملک کے باہر مقیم ایسے توتسی جنھیں اپنے گزشتہ دورِ حکمرانی کی یاد ستاتی رہتی ہے۔" دیگر دشمنوں میں توتسی پناہ گزیں، موجودہ حکومت سے غیر مطمئن ہوتو باشندے، علاقے کے "نائلو ہیمائٹ" افراد، مفرور مجرم، اور توتسی عورتوں کے غیر ملکی شوہر شامل تھے۔

Scanned with CamScanner

آر پی ایف کے جلسے میں جاتے ہوئے راستے میں مجھے توتسی عورتوں نے جو کچھ بتایا تھا اس کے باوجود حقیقت یہ تھی کہ ۱۹۷۰ کے عشرے میں بابیاریمانا کے دورِ حکومت میں ہوتو اور توتسی باشندوں کے مابین شادیوں، بالخصوص توتسی عورتوں اور ہوتو مردوں کی شادیوں، کی تعداد میں اضافہ ہوا تھا۔ غیر ملکی مرد بھی توتسی عورتوں کو ترجیح دیتے، خصوصاً روایتی حسن کی مالک، لمبی ٹانگوں اور ہلکی رنگت والی جوان عورتوں کو۔ غیر ملکی امدادی ادارے بھی توتسیوں کو ملازمت میں فوقیت دیتے کیوں کہ ان میں سے بیشتر کامیاب خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور بیرونِ ملک تعلیم پا چکے تھے۔ ہوتو رسالے "کنگورا" (*Kangura*) نے "ہوتوؤں کے دس احکام" شائع کیے تھے، جن کی ابتدا اس طرح ہوتی تھی:

۱۔ ہر ہوتو کو جاننا چاہیے کہ توتسی عورت، جہاں کہیں بھی ہو، اپنے توتسی گروہ کے مفاد کے لیے کام کرتی ہے۔ لہٰذا ہر اُس ہوتو مرد کو، جو کسی توتسی عورت سے شادی یا دوستی کرے گا، یا اسے سیکرٹری یا داشتہ کے طور پر ملازم رکھے گا، غدّار تصور کیا جائے گا۔

۲۔ ہر ہوتو کو جاننا چاہیے کہ ہماری ہوتو بیٹیاں عورت، بیوی اور ماں کے کرداروں کے لیے زیادہ موزوں اور خاندان میں اپنے مقام کا بہتر احساس رکھنے والی ہیں۔ کیا وہ زیادہ حسین، زیادہ اچھی کارکن اور زیادہ دیانت دار نہیں ہیں؟

چوتھے حکم میں ہر ایسے ہوتو کو غدار قرار دیا گیا تھا جو کسی بھی توتسی کے ساتھ کاروبار کرے۔ دسواں حکم یہ تھا:

ہوتو نظریے کی تعلیم ہر ہوتو کو ہر سطح پر دی جانی چاہیے۔ ہر ہوتو کو چاہیے کہ اس نظریے کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے۔ کوئی ہوتو جو اپنے ہوتو بھائی کو اس نظریے کی تعلیم حاصل کرنے، اسے پھیلانے اور اس کی تعلیم دینے کی

بنا پر ملامت کرے گا وہ غدار تصور کیا جائے گا۔

روانڈا کی ریاست اپنے کام میں اتنی مستعد اور موثر تھی کہ یہ پیغام ملک کے کونے کونے تک پہنچ گیا۔ اسی مستعدی کا ـــــ اور اس نظم و ضبط کا، غیر ملکی امدادی کارکن جس کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے ـــــ یہ نتیجہ تھا کہ ۷ اپریل کو جب قتلِ عام کا آغاز کرنے کا حکم جاری ہوا تو اس کی عموماً ہر جگہ پابندی کی گئی۔ بہت سے عینی شاہدوں نے بتایا کہ کمیون کے سربراہوں، بورگ میستروں، نے کس طرح فوج یا پولیس کے مقامی عہدے داروں کے ساتھ مل کر لوگوں کو قتلِ عام کی ہدایات دیں۔ خوف ـــــ دشمن کے حملے کا خوف، اپنے پڑوسیوں کے ممکنہ طرزِ عمل کا خوف، حکم نہ ماننے کی صورت میں سزائے موت کا خوف ـــــ قاتلوں کو اپنے راستے پر آگے ہی آگے لے جاتا رہا۔ اگر معاشرے کو قابو میں رکھنے والے اصولوں کی ہر شخص خلاف ورزی کرنے لگے تو یہ اصول غیر موثر ہو جاتے ہیں؛ گروہی اتحاد مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے، احساسِ جرم اجتماعی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۸

اپریل سے جون تک باقی دنیا نے کوئی اقدام نہ کیا۔ اقوامِ متحدہ کی نفاذِ امن کی فوج واپس لوٹ گئی۔ سفارتی اقدامات گمراہی کا شکار اور سخت نقصان دہ ثابت ہوئے ـــــ اقوام متحدہ نے اُس وقت جنگ بندی پر زور دیا جب آر پی ایف کی فتح ہی نسل کشی کے عمل کو روکنے کی واحد امید تھی۔ انجام کار جون کے آخر میں مغرب نے اپنے ایلچی بھیجے: امدادی کارکن، جو انفرادی انسانیت نواز اقدام اور حق کی طاقت پر یقین رکھتے تھے؛ اور فوجی سپاہی۔

جس وقت فرانسیسی سپاہی پہنچے، تب تک بے روک ٹوک جاری قتلِ عام کو دس ہفتے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ چند ہزار فاقہ کش اور دہشت زدہ توتسی دو چھتیوں اور کیلے کے باغوں میں اپنی پناہ گاہوں سے نکل کر ان کیمپوں میں جمع ہوئے جن پر فرانسیسی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ارد گرد کی

Scanned with CamScanner

پہاڑیوں پر اب تک "متحد حملہ آوروں" کا راج تھا۔

فرانسیسی مداخلت کے محرکات خاصے پیچیدہ تھے۔ فرانسیسی ایک وسیع تر اسٹیج پر مصروفِ عمل تھے، وہ اقوام متحدہ کی نااہلی اور فرانس کی، ایک عالمی طاقت کے طور پر، خود مختاری پر زور دے رہے تھے۔ لیکن فرانس کی روانڈا سے ایک وابستگی یقیناً تھی۔ کئی برسوں سے پیرس کے ایلیزے پیلیس میں صدرِ مِتراں کے افریقی یونٹ کا سربراہ اس کا بیٹا، ژاں کرستوف، تھا جس نے صدر بابیاریمانا سے خاصی دوستی پیدا کرلی تھی۔ جب بابیاریمانا کا طیارہ ـــــ جو فرانس کی طرف سے دیا گیا تحفہ تھا ـــــ تباہ ہوا تو اس کی بیوہ اور گھر والوں کو سیدھے پیرس لے جایا گیا۔ فرانسیسی روانڈا کی حکومت کو افریقا میں فرانسیسی لسانی اقدار (francophonie) کا محافظ اور بڑھتے ہوئے اینگلو سیکسن اثرات کی راہ میں ایک دیوار سمجھتے تھے۔ اس طرح براعظم یوروپ کی قدیم قبائلی رقابت براعظم افریقا کے قلب میں کلچر اور زبان کے ایک تنازعے کی صورت میں جلوہ گر ہو رہی تھی: آر پی ایف کے لوگ، جن کی تعلیم و تربیت یوگنڈا میں ہوئی تھی، انگریزی بولتے تھے جب کہ ہوتو حکومت کی زبان فرانسیسی تھی۔ فرانسیسی ہوتوؤں سے ہم دردی رکھتے تھے: ان کی طرح فرانسیسیوں نے بھی ایک بادشاہت کا تختہ اُلٹ کر انقلاب برپا کیا تھا۔

تاہم زمین پر متعین فرانسیسی فوجیوں کو ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کی طرف ہیں۔ صدر مِتراں نے انھیں "ایک انسانیت نواز مشن" پر وہاں بھیجا تھا، اور وہ توتسیوں کی جانیں بچا رہے تھے جن پر ہوتو قاتلوں کے گروہ حملہ آور تھے۔ لیکن ہوتوؤں کا خیال تھا کہ وہ انھیں آر پی ایف کی پیش قدمی سے بچانے کی غرض سے آئے ہیں۔ سڑکوں کی جن رکاوٹوں پر توتسیوں کو قتل کیا گیا تھا اُن پر فرانسیسی ترنگے لہرائے گئے اور "زندہ باد فرانس" (VIVE LA FRANCE) کے بینر آویزاں کیے گئے؛ ہوتو ملیشیا کے سپاہی پک اپ ٹرکوں میں سوار ہتھیار لہراتے اور خیر مقدمی گیت گاتے پھرے۔ فرانسیسی فوج افریقا سے اور یہاں کی جنگوں سے واقف تھی؛ اس نے فرانسیسی نوآبادیاتی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا تھا، اور وسطی افریقی ریپبلک اور جبوتی میں اب بھی فرانسیسی فوجی اپنے باقاعدہ دوروں پر آیا کرتے تھے۔ لیکن وہ اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھے جس کا انھیں روانڈا میں سامنا کرنا پڑا۔ ایک روز میں میرین یونٹ کے کمانڈر لیفٹننٹ کرنل ایرک دستاباں رات سے اس کے تجربات کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ وہ اپنے

پورے کریئر میں فوجی رہا تھا، اس کا خاندان سپاہ گری سے گہرا تعلق رکھتا تھا، اور وہ بوسنیا اور بیروت میں بھی خدمات انجام دے چکا تھا، لیکن روانڈا میں ہونے والی قتل و غارت گری نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ "یہ دنیا کی تاریخ کا بدترین قتلِ عام تھا،" اس نے کہا، "تعداد کے اعتبار سے نہیں، بلکہ جس منظم طریقے سے اسے سرانجام دیا گیا اُس کے لحاظ سے۔"

اس نے اُتھلے گڑھوں میں اجتماعی طور پر دفن کی گئی ہزاروں لاشیں دیکھی تھیں، ایسے گرجاگھر دیکھے تھے جن کی دیواروں پر سے خون کے دھبے جلدی میں کی گئی صفائی سے مٹ نہیں سکے تھے۔ بچ جانے والوں کی زبانی سنی جانے والی کہانیاں واقعاتی شہادتوں سے کہیں زیادہ ہولناک تھیں: توتسیوں کو خنجروں سے چیرا گیا، میخیں لگے ڈنڈوں سے پیٹا گیا، چھوٹے پستولوں سے گولی ماری گئی، اجتماعی آبروریزی کی گئی، اور دستی بم مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ اس کا اندازہ تھا کہ پانچ لاکھ افراد مارے گئے ہیں، ہر روز سات ہزار افراد کے حساب سے۔

ایک اور فرانسیسی افسر، کرنل پیتریس سارتر، جو کیبو یے میں کمانڈر تھا، اس سے کہیں زیادہ کلبیت زدہ تھا: "افریقا کے دوسرے مقامات پر لوگوں کو کام کرنے کی عادت نہیں۔ وہ بھیک مانگتے ہیں،" اس نے کہا۔ "یہاں کے لوگ زیادہ تعلیم یافتہ اور محنتی ہیں۔ بھیک نہیں مانگتے۔ مگر قتل کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ ہوتو حکومت نے جو سفاکی روا رکھی ہے، آیا اس کے پیشِ نظر فرانس اب آر پی ایف کا ساتھ دے گا۔ "نہیں،" اس نے جواب دیا۔ "فرانس ہمیشہ غلاموں کا ساتھ دے گا۔"

۹

آر پی ایف نے بابیاریمانا حکومت کی حمایت کرنے پر فرانس کو کبھی معاف نہیں کیا، اور نہ اس بات پر کہ انھوں نے روانڈا کے کچھ علاقے کو اپنے قبضے میں لے کر آر پی ایف کی مکمل فتح کا راستا روک دیا، اور نہ اس بات پر کہ نسل کشی کے کلیدی مجرموں کو روانڈا کی سرحدوں سے باہر فرار ہو جانے دیا۔ اس کے باوجود روانڈا کی سرکاری فوج کو جون کے آتے آتے یہ احساس ہو چکا

Scanned with CamScanner

تھا کہ وہ جنگ ہار گئی ہے۔ وسط جولائی میں اس فوج کا کمانڈر انچیف جنرل آگستین بیزیمونگو، اپنی فوج کے ساتھ فرار ہو کر زائیر کی سرحد کے ذرا اندر گوما (Goma) پہنچ چکا تھا۔ اس فوج کی شکست ہوئی تھی لیکن اس کی بیشتر قوت محفوظ رہی تھی۔

بہت سی سویلین آبادی بھی ان کے ساتھ فرار ہوئی۔ یہ ایک عجیب و غریب اجتماعی فرار تھا جس کا مشاہدہ سیکڑوں خبر نگاروں اور درجنوں ٹیلی وژن اسٹیشنوں کے نمائندوں نے کیا، جن کی زبان پر متواتر یہ الفاظ تھے کہ یہ انسانی تاریخ میں ریکارڈ ہونے والا سب سے بڑا خروج ہے، جس میں دس لاکھ افراد نے صرف ایک مقام سے صرف تین دن کے عرصے میں بین الاقوامی سرحد پار کی۔

اسے فراموش کرنا نہایت دشوار ہے: گرد و غبار، ماں باپ سے بچھڑے اور روتے ہوئے بچے، ریلے کے قدموں تلے کچلے جاتے کمزور لوگ۔ وہ ایک خوف کے زیرِ اثر بھاگ رہے تھے ـــــ وہ اس بات سے دہشت زدہ تھے کہ اگر وہ روانڈا میں رکے رہے تو آر پی ایف ہوتو آبادی سے اس عمل کا انتقام لے گی جو توتسیوں کے ساتھ روا رکھا گیا (اور ان کا یہ خوف، جیسا کہ مجھے اور دوسرے لوگوں کو بعد میں معلوم ہوا، بے بنیاد نہیں تھا۔)

گوما کی جانب فرار بظاہر انتشار کا شکار ضرور تھا، لیکن دوسری طرف منصوبہ بند بھی تھا۔ پوری پوری برادریوں نے ایک ساتھ ہجرت کی۔ وہ اب بھی اپنے انھیں رہنماؤں کے پیرو تھے اور ان کی ہدایات پر عمل کرتے تھے: ریڈیو مل کولنز نے اور بورگ میستروں نے انھیں زائیر کی طرف فرار ہونے کی ہدایت کی تھی، جیسا کہ چند ہفتے پہلے ان کی جانب سے توتسیوں کو قتل کرنے کی ہدایات جاری کی گئی تھیں۔ تاہم ان میں سے بہت سے روانڈا سے فرار ہو کر بھی موت سے نہ بچ سکے کیوں کہ گوما کی طرف فرار اجتماعی خودکشی ثابت ہوا۔ انسانی فضلے سے تمام گٹر بُری طرح اَٹ گئے، اور تھکن سے گر کر مرنے والوں کی لاشیں کفن دفن کے بغیر سڑکوں پر پڑی رہیں۔ ہیضہ پھیل گیا۔ ہزاروں افراد آتش فشاں چٹانوں سے بنے میدان پر مرے جہاں قبریں نہیں کھودی جا سکتی تھیں۔ دفن کرنے کے بجائے لاشوں کو چٹائیوں میں لپیٹ کر دو دو تین تین کی تہوں میں ایرپورٹ جانے والی سڑک پر رکھ دیا گیا تھا جن میں سے بعض کے قریب بچے بیٹھے رو رہے تھے۔ آخرکار ماسک پہنے فرانسیسی سپاہیوں کو مشینوں کی مدد سے ایک بڑا سا گڑھا کھودنا پڑا جس میں ان لاشوں کو بلڈوزروں کے ذریعے دفن کیا گیا۔

Scanned with CamScanner

گوما پناہ گزینوں کے لیے ایک جال تھا، لیکن قتلِ عام کے مجرموں کے لیے فرار کا راستا بھی تھا۔ بین الاقوامی اداروں نے "متحد حملہ آوروں" کو بے گناہ ہوتوؤں سے الگ کرنے کی بات کی لیکن جرم اور ذمے داری کے ریشے ہوتو معاشرے میں اتنی گہرائی تک پیوست ہیں کہ ان کو الگ الگ کرنا غیر ملکیوں کے بس کی بات نہیں۔ اس دوران ہوتو لیڈروں نے گوما، اور جھیل کیوو کے دوسرے کنارے پر واقع زائیر کے ایک اور شہر بوکاوا، میں بڑے بڑے مکان کرائے پر لے لیے تھے اور اپنے اپنے سیاسی اثرورسوخ کے ڈھانچے دوبارہ کھڑے کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ بین الاقوامی امدادی اداروں کو بھی ان ڈھانچوں کی ضرورت تھی کیوں کہ امداد کی تقسیم کا کوئی اَور موثر طریقِ کار موجود نہیں تھا۔ ہم دردی انصاف پر غالب آئی: اگر امدادی کارکن لوگوں کی، خصوصاً ہزاروں مرتے ہوئے بچوں کی، جانیں بچانا چاہتے تھے تو انھیں اسی نظام کو تقویت دینی تھی جس نے "متحد حملہ آور" پیدا کیے تھے اور کسانوں کو قاتلوں میں تبدیل کیا تھا۔

یہاں، اس قابلِ رحم انتشار میں، گوما کی ایک مضافاتی سڑک پر واقع ایک دفتر میں ایک امدادی کارکن سے انٹرویو کے لیے انتظار کرتے ہوئے مجھے ایک مانوس آواز سنائی دی: "بون ژور مادام!" یہ ایوارسیتے تھا، چوکیدار۔ میں نے اسے تین ماہ بعد دیکھا۔ اپریل کے آخر میں ہماری فون پر بات ہوئی تھی، لیکن جلد ہی لائن کٹ گئی تھی۔ مجھے یقین نہ آیا کہ وہ اب تک زندہ ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ اسی گھر میں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ آر پی ایف کیگالی میں داخل ہو گئی۔ اس مکان کو، یا ایوارسیتے کو، کسی نے ہاتھ نہ لگایا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی محفوظ رہے۔

مگر وہ یہاں، ہوتوؤں اور ان کے لیڈروں کے درمیان، کیا کر رہا تھا؟ آخر کار میں نے اس سے پوچھ ہی لیا: "تمھارے شناختی کارڈ میں ایتھنی کے خانے میں کیا لکھا ہے؟"

"ہوتو،" اس نے جواب دیا۔

میں نہایت احمق تھی۔ میں نے یہ کیوں کر فرض کر لیا تھا کہ وہ توتسی ہے اور ممکنہ طور پر نشانہ بن سکتا ہے؟ شاید اس لیے کہ اسے ایک امدادی ادارے نے ملازم رکھا ہوا تھا، یا شاید اس لیے کہ خوف کے اس عالم میں اس پر بھروسا کرنا میری ضرورت تھی۔ شاید اس لیے کہ ان دنوں میں بھی جب قتلِ عام اپنی انتہائی شدت پر تھا، میرا غالب جذبہ شرمندگی کا تھا ـــــ یہ فرض کر کے کہ وہ توتسی ہے، میں ایتھنی کے مسئلے پر بات کرنے سے احتراز کر سکتی تھی۔ ایوارسیتے نے اُس مکان کی

چابیاں، جو وہ اُن دنوں سے اپنے ساتھ لیے پھر رہا تھا، میرے حوالے کیں۔ میں نے اُسے پیسے دیے۔ پھر وہ ہجوم میں غائب ہو گیا، لاکھوں پناہ گزینوں کی بھیڑ میں ایک اور پناہ گزیں، جنھیں اب، پہلے سے کہیں زیادہ، موت کے شدید خطرے کا سامنا تھا۔

۱۰

دسمبر کے مہینے میں میں کیگالی میں آکس فیم (Oxfam) نامی ادارے کے دفتر میں اس کے عملے کی ایک رکن، ایستھر مُوجاوایو، سے ملنے گئی۔ قتلِ عام کے پہلے چند ہفتوں کے دوران وہ، اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ، اس اسکول میں چھپی رہی تھی جہاں اس کا شوہر فرانسیسی زبان کا استاد تھا؛ اپریل میں میں کوشش کے باوجود برطانیہ میں اس کے دوستوں کی طرف سے آنے والے پیغامات اس تک پہنچانے میں ناکام رہی تھی۔ مئی کے اوائل میں فوجی اس کے شوہر کو پکڑ کر لے گئے اور گولی مار دی۔ ایستھر اور اس کے بچے مزید دو مہینے روپوش رہے۔

ایستھر کا بات کرنے کا انداز بہت تیز اور شدّت بھرا تھا؛ وہ بات کرتے ہوئے آگے کو جھک جاتی تھی جیسے مخاطب کو اپنی بات سمجھانے کی سخت کوشش کر رہی ہو۔ اگر آپ اس سے کہیں تو وہ آپ کو اپنی شادی کی تصویریں دکھانے لگے گی۔ وہ انگلی کے اشاروں سے اپنے باپ، ماں اور خالہ کی نشان دہی کرے گی ـــــ وہ سب کے سب اُسی گاؤں میں مارے گئے جہاں ایستھر پیدا ہوئی تھی۔ پھر وہ اُسی تصویر میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کرے گی جنھوں نے اس کے ان عزیزوں کو قتل کیا ـــــ پڑوسی، دوست، وہ سب لوگ جن کی مانوس شکلیں دیکھ دیکھ کر وہ بڑی ہوئی تھی۔

ایستھر کے خاندان کے اکتیس افراد قتل ہوئے۔ اس کی اٹھتر سالہ اپاہج ماں اور اسّی سالہ خالہ کو ان کے بستروں میں سے گھسیٹ کر باہر نکالا گیا اور لاشوں کے ایک ڈھیر کے اوپر زندہ پھینک دیا گیا۔ وہاں انھیں دھوپ اور بارش میں پڑے پڑے اپنی جان دینے میں کوئی ایک ہفتے کا وقت لگا اور اس دوران گاؤں کے لڑکے انھیں پتھر مارتے رہے۔ اس کی عم زاد بہن فضلے کے گڑھے میں مری؛ جب اس نے گڑھے سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو ایک ہُوتو نے اس کے ہاتھ کاٹ دیے۔

Scanned with CamScanner

"انتہائی غم زدہ کر دینے والی بات یہ ہے کہ غالباً میرے خاندان کے لوگوں نے چھپنے تک کی کوشش نہیں کی،" ایستھر نے کہا۔ "میں یہ تو سمجھ سکتی ہوں کہ لوگوں کو بھڑکایا جا سکتا ہے ــــ سیاست داں اور ریڈیو والے لوگوں میں تبدیلی لا سکتے ہیں ــــ لیکن قتل کرنے کے اس قدر ہولناک طریقے لوگ کیوں کر اختیار کر سکتے ہیں؟"

ایستھر نے مجھے بتایا کہ وہ خود کو زبردستی گاؤں میں واپس لے گئی تھی تاکہ پتا لگانے کی کوشش کر سکے کہ دراصل کیا ہوا تھا۔

"میں نے سمجھا کہ وہاں، اپنے ماں باپ کے گھر، واپس جا کر دیکھنے میں اب کوئی خطرہ نہیں۔ میں خود کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے، ان کی قبر دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر ان کا کام اس قدر متاثر کن اور مکمل ہے۔ وہ سب کچھ مٹا دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے لوگوں کو مار دیا، مکان کو بالکل زمین کے برابر کر دیا، درخت تک کاٹ ڈالے اور ہر جگہ کاشت شروع کر دی۔ انھوں نے ہمارے مکان کی طرف جانے والی سڑک پر بھی ہل چلا دیا تاکہ پتا چل جائے کہ ہم لوگ ختم ہو چکے ہیں۔

"اب میری جڑیں روانڈا میں باقی نہیں رہیں۔ اب میں اپنے تینوں بچوں کو لے کر کہیں بھی جا سکتی ہوں۔"

نسل کشی میں زندہ بچ جانے والے، جو اُس مقام پر رہنے کی اذیت برداشت نہیں کر پائے جہاں ان کے گھر والوں کو ذبح کیا گیا تھا، رفتہ رفتہ کیگالی میں آ بسے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ خود کو زندہ پا کر سخت احساسِ جرم میں مبتلا ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ روحوں میں تبدیل ہو گئے ہیں ــــ وہ اجنبی ہیں جن کا کوئی گھر نہیں ہے۔ مونیکا اوویمانا، جو اُن لوگوں میں سے ایک تھی جنھوں نے قتلِ عام کے ابتدائی ہفتے میں مدد مانگنے کے لیے مجھے فون کیا تھا، زندہ بچ گئی لیکن اس کے پانچ بچے مار ڈالے گئے۔ جب میں اس سے ملی، اس کا مستقبل کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ وہ بولی، "آج کل جب کوئی کسی کو دیکھتا ہے تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلتا ہے: ارے، تم زندہ ہو! جیسے یہ کوئی معجزہ ہو! جیسے سب لوگوں کو مر جانا تھا!"

مگر دسمبر میں کیگالی پھل پھول رہا ہے۔ توتسی مہاجرین، جو ۱۹۵۹ کے تشدد سے بچ کر فرار

ہوئے تھے ـــ جنھیں عرفِ عام میں "انسٹھ والے" کہا جاتا ہے ـــ بیلجیئم، کینیڈا، برونڈی اور یوگنڈا سے وطن لوٹ آئے ہیں۔ ڈسکو کھل گئے ہیں؛ میرے پرانے ہوٹل کی مرمت ہو چکی ہے۔ شادیوں کی ایک پوری لہر چلی اور یوں سابق گریلا سپاہیوں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ دیہات میں نئے آنے والوں نے ان فصلوں کی کاشت دوبارہ شروع کر دی ہے جنھیں مرنے والے، یا زائیر یا تنزانیا بھاگ جانے والے، چھوڑ گئے تھے۔ معاہدۂ آروشا میں کہا گیا تھا کہ ۱۹۵۹ میں ملک چھوڑنے والوں کو وطن واپس لوٹنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن ان کو لوٹنے سے روکنے والا کون باقی بچا ہے؟

۱۱

اور اب، ۱۹۹۵ کے موسم گرما میں، روانڈا ہنگامی امداد کی صنعت کا نیا مرکز بن چکا ہے۔ یہاں ایک سو پچاس غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs) کام کر رہی ہیں؛ اقوام متحدہ کے بے شمار ذیلی ادارے ان کے علاوہ ہیں۔ یوروپ اور مغربی امریکا کے پُرجوش نوجوان سفید ٹویوٹا گاڑیوں میں سوار اِدھر اُدھر آتے جاتے ہیں جن کے دروازوں پر ان کے اداروں اور تنظیموں کے شناختی نشان بنے ہیں اور جن سے نکلنے والے ریڈیو ایریل، کوڑوں جتنے موٹے، بونیٹ پر جھومتے رہتے ہیں۔ ان کی بات چیت میں مختلف اداروں کے مخفف نام بار بار آتے ہیں، اور ان کی جینز کی بیلٹ میں واکی ٹاکی بندھی رہتی ہے۔

ہر نئے آنے والے غیر ملکی کو اقوام متحدہ کی نفاذِ امن کی فوج کی جانب سے پلاسٹک کی تہہ چڑھا سفید کارڈ دیا جاتا ہے ـــ یہ وہی نفاذِ امن کی فوج ہے جو نسل کشی کو روکنے سے قاصر رہی، اور اب بھی قتل و غارت گری کو روکنے سے قاصر ہے۔ کارڈ پر روانڈا کا نقشہ بنا ہوا ہے اور اقوام متحدہ کے سلامتی کے نظام ـــ گرین الرٹ، یلو الرٹ، ریڈ الرٹ ـــ کی تفصیلات درج ہیں۔ کچھ کار آمد فقروں کے مقامی زبان کے مترادفات بھی دیے گئے ہیں: ہاں، نہیں، ٹھہرو، ہیلو، میرا نام باب ہے، کیگالی کہاں ہے؟، فائر مت کرنا!

Scanned with CamScanner

مئی ۱۹۹۵ کے آخر تک تمام تر امداد ملک کے جنوب مغربی حصے میں واقع سابق فرانسیسی زون تک محدود تھی جہاں ڈھائی لاکھ ہوتو پناہ گزیں اب تک کیمپوں میں رہ رہے تھے۔ ملک کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی نسبت پناہ گزینوں کو غذا فراہم کرنا زیادہ آسان ہے، اور اس کی فوری ضرورت بھی تھی۔

لیکن نئی آر پی ایف حکومت ان کیمپوں کو "متحد حملہ آوروں" اور زائیر سے اسمگل کیے جانے والے ہتھیاروں کا ایک نقاب سمجھتی ہے۔ مئی میں اس نے فوج کو ان کیمپوں کو تباہ کرنے کی ہدایت کی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۳۳۸ افراد ہلاک ہوئے، جن میں سے اکثریت بھگدڑ میں کچلے جانے والوں کی تھی۔ غیر ملکی ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ انھوں نے چار ہزار لاشیں اور ہزاروں زخمی دیکھے جن میں سے بیشتر کو پشت کی طرف سے آر پی ایف کے سپاہیوں کی گولیاں لگی تھیں۔ غیر ملکیوں کے لیے حکومت کا پیغام واضح تھا: قومی سلامتی انسانیت نواز مشن کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ ہوتوؤں کے لیے بھی اس کا پیغام بالکل غیر مبہم تھا: اب ہمارا راج ہے۔

حل کی تلاش میں بے تاب ہو کر غیر ملکیوں کے منہ سے عموماً "مفاہمت" کا لفظ نکلتا ہے۔ ایستھر موجاوایو نے مجھے بتایا کہ اس تصور کو سمجھنا اس کے لیے نہایت دشوار ہے۔ "مجھے اس لفظ سے نفرت ہے، کیوں کہ اس کے معنی میری سمجھ میں نہیں آتے،" اس نے کہا۔ "فرض کیا میں مفاہمت کرنے کو تیار بھی ہو جاؤں ـــ مگر کس کے ساتھ؟ میں کبھی ایسے کسی شخص سے نہیں ملی جسے احساسِ جرم ہو، جس نے اپنے فعل کی معذرت کی ہو۔ مجھ سے معافی مانگ ہی کون رہا ہے؟"

جب تک نسل کشی کے مجرم ـــ آکازو کے پرانے ارکان، زیرو نیٹ ورک کے منتظمین، اپریل میں خود کو اقتدار پر فائز کر لینے والی حکومت کے وزرا ـــ آزاد گھوم رہے ہیں، تب تک کوئی شخص ایستھر سے یا کسی اور زندہ بچ جانے والے سے معافی کا خواست گار نہیں ہو گا۔ یہ تمام لوگ زائیر، کینیا، تنزانیا، مغربی افریقا اور یوروپ میں آزادی سے اُڑتے پھر رہے ہیں، اپنے لیے حمایت کا بندوبست کر رہے ہیں، ہتھیاروں کے سودے کر رہے ہیں، اپنی واپسی کے منصوبے تیار کر رہے ہیں، اور روانڈا میں جو کچھ ہوا اس کی اپنی من مانی خبریں پھیلا رہے ہیں۔ ان لوگوں میں جنرل آگستین بیزیمونگو بھی شامل ہے اور اپریل کی عبوری حکومت کا وزیرِ اعظم ژاں کمباندا بھی۔

کمباندا اب خود کو "جلاوطن حکومت کا وزیرِ اعظم" کہتا ہے اور زائیر کے شہر بُوکاوا میں جھیل کے کنارے بنے ایک مکان میں رہتا ہے جہاں سے وہ، جھیل کیوو کے دوسرے کنارے پر، روانڈا کو دیکھ سکتا ہے۔

روانڈا کے باہر رہنے والے ہوتو قتلِ عام کو ہوتوؤں اور توتسیوں کے درمیان ہونے والی ایک نسلی جنگ کی صورت میں پیش کرتے ہیں، جو لوگوں کے دو گروہوں کے مابین شدید نفرت کا نتیجہ تھی۔ دوسری جانب، آر پی ایف کا کہنا ہے کہ قتلِ عام ایک ایسی حکومت کے ایما پر کیا گیا جو تمام توتسیوں کو، اور تمام مخالف ہوتوؤں کو بھی، ایک ہی وحشیانہ مہم میں ختم کر دینا چاہتی تھی تاکہ ہمیشہ اقتدار پر فائز رہ سکے۔ آر پی ایف، جو خود کو ایک غیر فرقہ وارانہ قوت کے طور پر پیش کرنا پسند کرتی ہے، کہتی ہے کہ اس کی جنگ ہوتوؤں کے خلاف نہیں بلکہ سابقہ حکومت کے خلاف ہے۔ (آر پی ایف کے نزدیک روانڈا میں ناانصافی اور ظلم کی تمام تر داستان صرف پچھلے تیس برسوں پر محیط ہے جب اقتدار ہوتوؤں کے ہاتھ میں تھا؛ توتسی بالادستی کی صدیوں کو ـــــ جب ہوتوؤں کو محکوم بنا کر رکھا گیا تھا ـــــ ظلم و ستم سے پاک ماضی خیال کیا جاتا ہے۔) آر پی ایف نے ملک کی جیلیں ایسے افراد سے بھر دی ہیں جنھیں "نسل کشی میں حصہ لینے کے شبہے میں" پکڑا گیا ہے، لیکن لاکھوں کسانوں کو قید کر دینے سے، یا مار ڈالنے سے بھی، اجتماعی جرم کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔

نسل کشی کو جن لوگوں نے منظم کیا تھا وہ جانے پہچانے ہیں، اور ان کے خلاف شہادتیں بھی دستاویزی طور پر محفوظ ہیں۔ لیکن ان میں محض چند گرفتار ہوئے ہیں۔ ایک کمزور اور فنڈ کی کمی کا شکار بین الاقوامی ٹربیونل ابھی اور شہادتیں جمع کرنے میں مصروف ہے۔ اگر گرفتاری کے وارنٹ کبھی جاری کیے جا سکے تب تک ملزموں کو خاصا وقت مل چکا ہو گا کہ وہ گرفتاری سے بچنے کے لیے افریقا کے زیادہ محفوظ خطوں میں جا چھپیں۔

نسل کشی کی قیادت کرنے والے آج بھی زائیر اور تنزانیا میں ہوتو کسانوں پر اپنی گرفت مستحکم رکھے ہوئے ہیں۔ ان پر کسی طرح کا دباو نہیں ہے کہ وہ اپنے کیے ہوئے جرائم کا حساب دینا تو کجا، ان کو تسلیم ہی کر لیں۔

اس تمام معاملے میں دولت مند دنیا کا قصور یہ نہیں ہے کہ اسے کوئی پروا نہیں ـــــ پناہ

گزینوں کو زندہ رکھنے پر دسیوں لاکھ ڈالر خرچ کیے جا چکے ہیں ـــــ بلکہ یہ کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ روانڈا اس وقت دنیا کی نظروں میں آیا جب بابیار یمانا کا طیارہ تباہ ہوا، اور چوں کہ ہم اس نسل کشی کی تاریخ سے انکار کر دیتے ہیں اس لیے یہ عمل اپنے معنی سے محروم ہو جاتا ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے، چناں چہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکے۔ ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ نظریہ اور کلچر افراد کو اپنے اندر سمیٹ کر ایک ٹھوس مادے کی شکل دے سکتا ہے، کہ اجتماعی شناخت ذاتی احساس اور کردار پر حاوی بھی ہو سکتی ہے۔

غیر ملکی حکومتوں کا کہنا ہے کہ آر پی ایف ضرور "اعتدال پسند ہوتوؤں" کو اپنے ساتھ اقتدار میں شریک کرے، لیکن اعتدال پسند ہوتوؤں کو تو سب سے پہلے مار دیا گیا تھا؛ بلاشبہ آر پی ایف حکومت میں کچھ ہوتو بھی شامل ہیں، لیکن اس کے اقتدار کا مرکز توتسی فوج کے اعلیٰ عہدے دار ہیں جس نے جنگ جیتی تھی۔

جھیل کیوو کے اُس پار، زائیر میں سرحد سے ذرا اندر "متحد حملہ آور" اور ہوتو سپاہی مشرق کی جانب اپنے وطن پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ وہ واپس آ کر نئے ہتھیاروں پر لوگوں کو تربیت دینے کے خواب دیکھ رہے ہیں، جس طرح تیس برس پہلے جلاوطن ہونے والے توتسیوں کے بیٹے اور بیٹیاں، جن کے خواب پورے ہو گئے ہیں، یوگنڈا کی سمت سے اپنے لمبے سینگوں والے مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ ساتھ لیے روانڈا میں گروہ در گروہ چلے آ رہے ہیں۔

۱۲

آخری مرتبہ کیگالی جا کر میں نے اُن لوگوں کو تلاش کیا جو ایوارستے سے واقف تھے۔ جب تک ایستھر موجاوایو مجھے ایک ڈرائیور سے ملانے لے کر گئی جس سے ایوارستے کا اتا پتا مل سکتا تھا، تب تک مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ مجھے کیا خبر سننے کو ملے گی۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ وہ اس مکان کے قریب جہاں میں قتلِ عام کے دنوں میں رہی تھی، سڑک کی ایک رکاوٹ کو عبور کر کے دوسری طرف گیا تھا، اور اس نے قتلِ عام شروع ہونے کے ایک ہفتے بعد وہاں ایوارستے کو دیکھا

تھا۔

"وہ کیا کر رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ایک بندوق اٹھائے ہوے تھا۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ اسے اس کے لیے مجبور کیا گیا ہو؟"

"وہ بندوقیں صرف اُن لوگوں کو دیتے تھے جن پر انھیں پورا بھروسا ہو۔ وہ ان کے ساتھ تھا ــــ اُنھیں میں سے تھا۔ ہم جانتے ہیں۔"

ڈرائیور نے، جو توتسی تھا، سڑک کی اس رکاوٹ کے قریب پہنچتے ہوے خود کو موت کے نرغے میں آتا محسوس کیا تھا۔ اس نے خود کو بیلجیئن ریڈ کراس کا ملازم ظاہر کیا۔ "ایوارستے نے میری طرف نہیں دیکھا، اور میں نے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ اسے نہیں جانتا، مگر میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔"

میں سوچنے لگی کہ کیا ایوارستے نے اپنا کام شروع کرنے سے پہلے میرے نکل جانے کا انتظار کیا ہو گا، یا اس نے یہ کام اُنھیں راتوں میں شروع کر دیا تھا جب وہ مکان کے اندر آ کر سونے سے انکار کرتا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ اس نے باہر گھومنے والے فوجیوں سے کیا سودے بازی کی ہو گی۔ وہ کیا سوچتا رہا ہو گا، اس نے ایسا کیوں کیا، یہ عمل اس کے لیے کیا معنی رکھتا تھا؟ کیا وہ پہلے سے "متحد حملہ آوروں" کے گروہ کا رکن تھا یا اُنھیں دنوں ان کے ساتھ شامل ہوا؟ کیا اسے زبردستی اپنے ساتھ ملایا گیا یا وہ اس کام پر خود ہی یقین رکھتا تھا؟ میں سوچنے لگی کہ میں اس سے کیوں کر بے خبر رہی۔ میں اپنی حماقت پر، اپنی تکلیف دہ لاعلمی پر، کچھ بھی نہ سمجھ پانے، کچھ بھی نہ دیکھ پانے پر حیران تھی۔ جو دن اس نے اور میں نے کیگالی کے اُس مکان میں اکٹھے بسر کیے وہ میری زندگی کے دہشت ناک ترین دن تھے۔ میں اس تمام تجربے سے ایوارستے کے ساتھ گزری تھی، پھر بھی اس کے بارے میں، اس کے لوگوں کے بارے میں کچھ نہ جان سکی، اور نہ اس بارے میں کہ وہ کہاں سے آیا تھا، کیا سوچتا تھا، کیا محسوس کرتا تھا۔

**

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

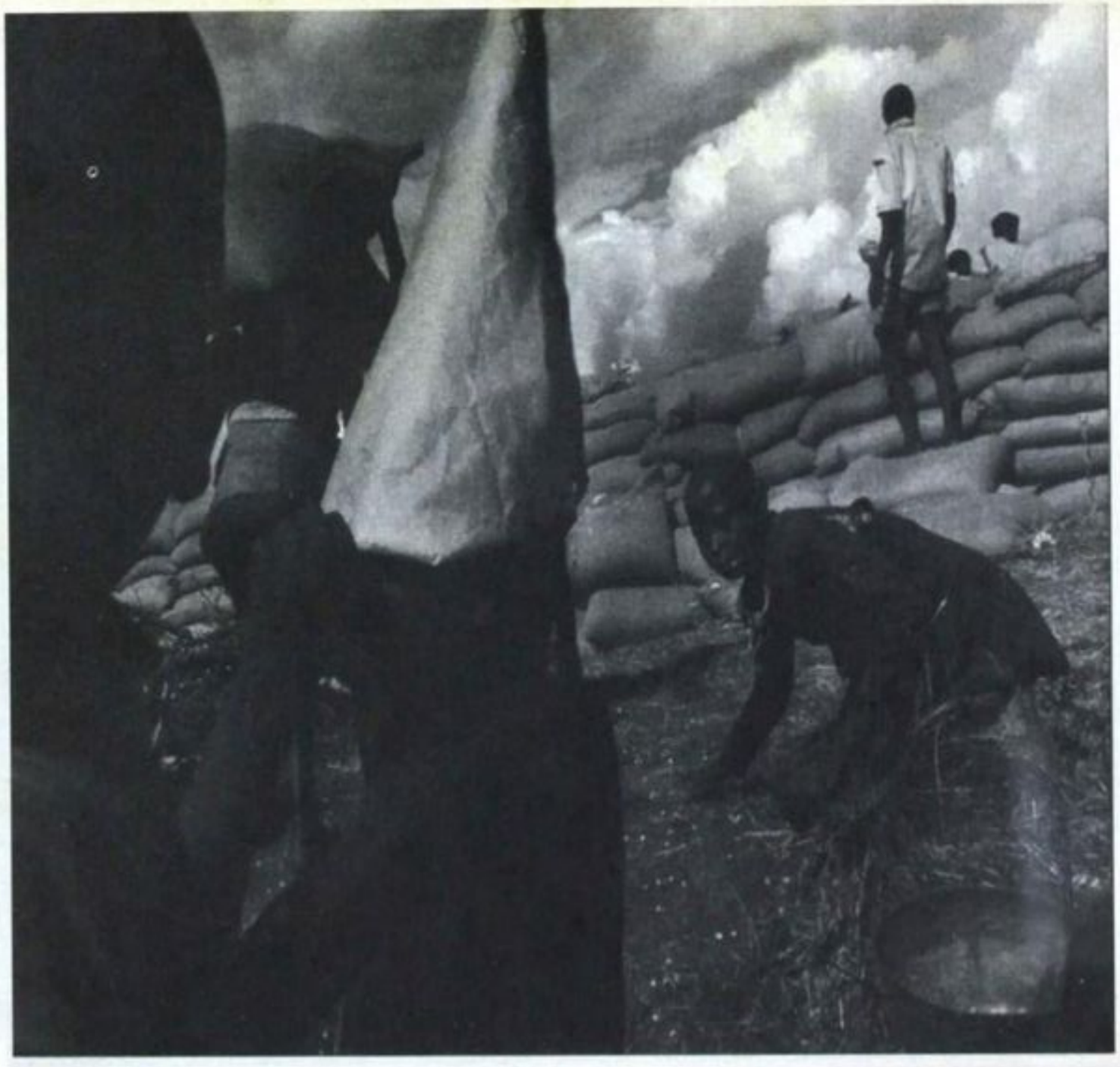

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

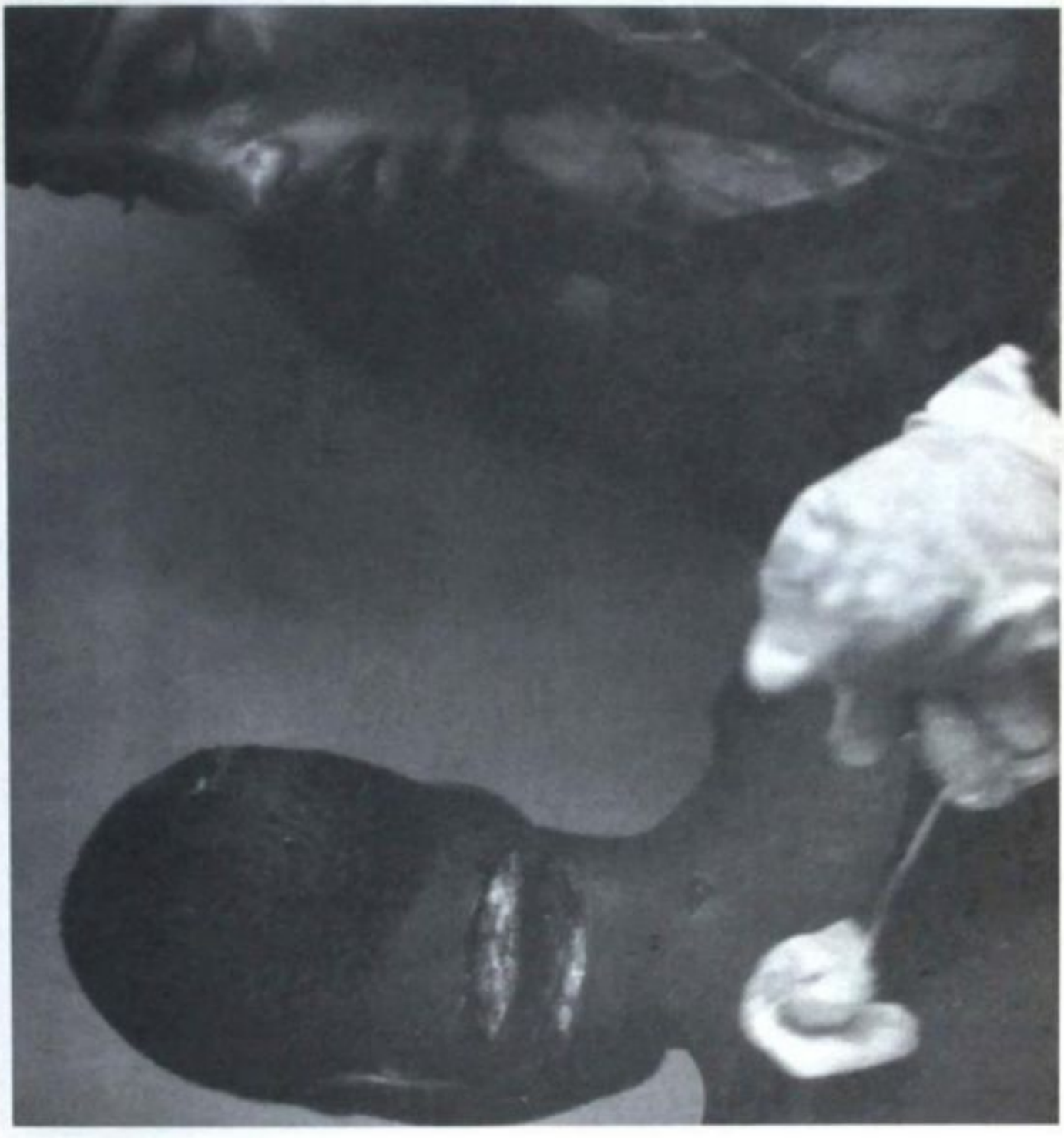

Scanned with CamScanner

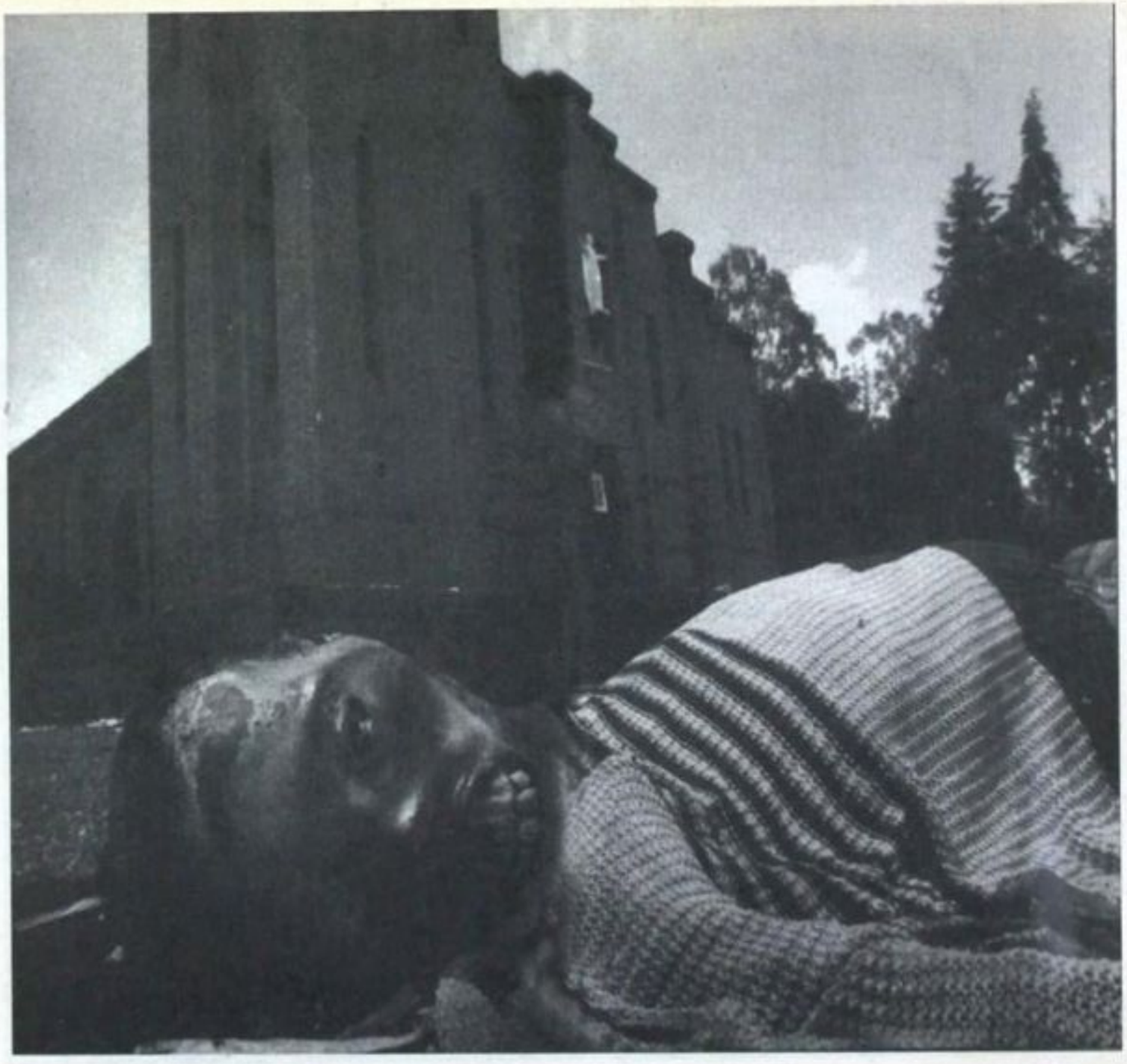

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

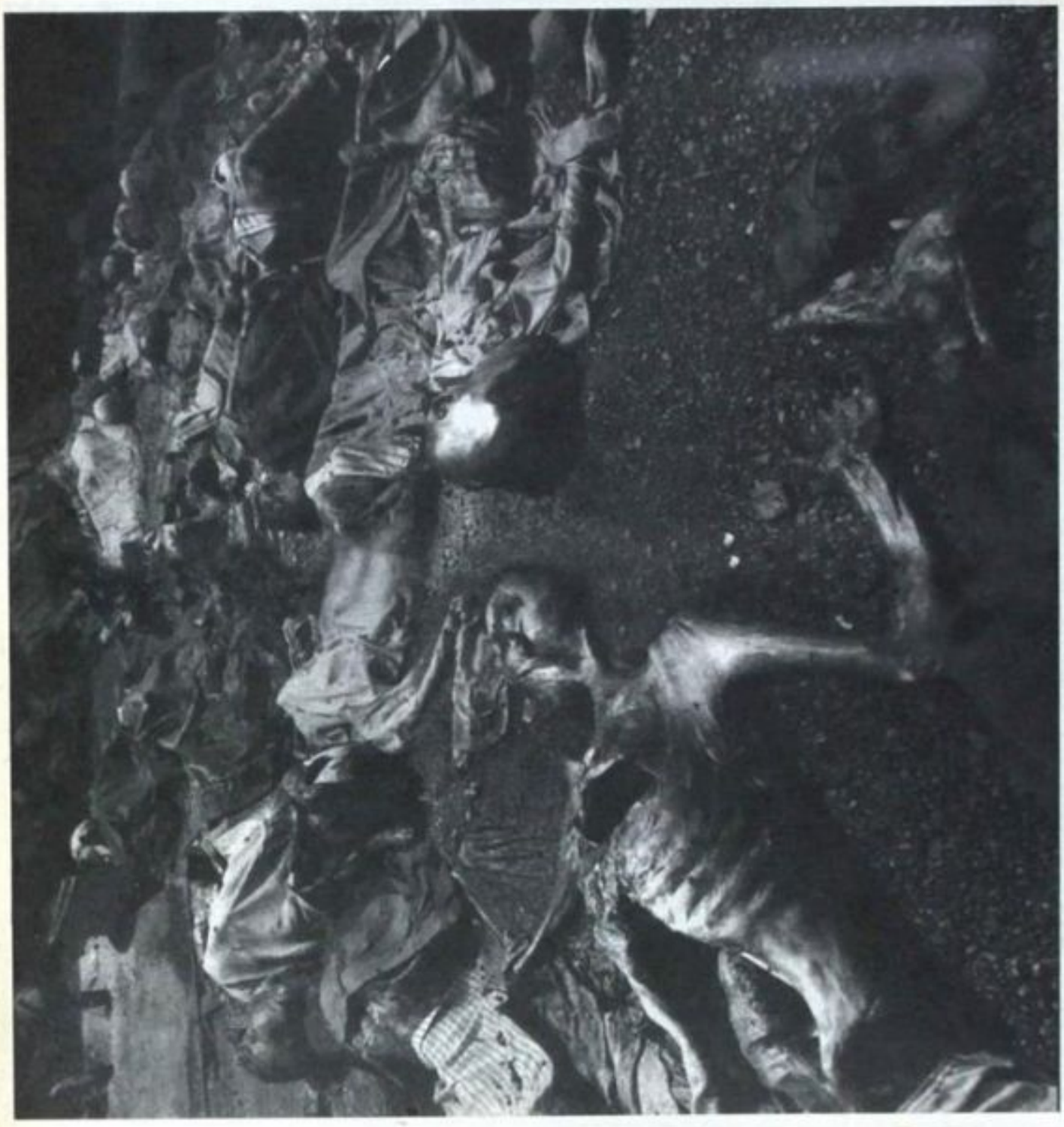

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مارک ڈائل

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

کیپٹن مبایے دیا گنے

روانڈا کا قصبہ نیاماتا دارالحکومت کیگالی سے تیس میل جنوب میں واقع ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو گرجاگھر اب بھی سیکڑوں لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ کچھ لاشوں کی باقیات کو کتوں نے چیر پھاڑ دیا تھا اور مجھے سنبھل سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا کہ کہیں میرا پاؤں کسی کاسۂ سر یا انسانی جسم کی کسی اَور ہڈی پر نہ آجائے۔ کئی اخبار نویسوں نے ان مناظر کا سامنا ہونے پر اپنی طبیعت کے مالش کرنے کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن نیاماتا میں پھیلی ہوئی بُو کچھ ایسی ناقابلِ برداشت نہ تھی ___ قتلِ عام کو واقع ہوئے تین مہینے گزر چکے تھے اور لاشیں خشک ہو گئی تھیں۔ مجھے قے نہیں ہوئی۔ میں نے گرجاگھر سے بیس گز دور کھڑی اپنی مستعار لی ہوئی کار میں بیٹھ کر بی بی سی ریڈیو کے لیے اپنا مراسلہ تحریر کیا، جو یوں شروع ہوتا تھا: "باغیوں کی جانب سے خبر نگاروں کو قتلِ عام کے موقعِ واردات پر لے جانے کی باتوں کو محض باغیوں کا پروپیگنڈا کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ نسل کشی کا واقعی ارتکاب کیا گیا ہے اور اس کی کچھ شہادت نیاماتا میں موجود ہے۔" بی بی سی "نسل کشی" جیسے لفظوں کے استعمال کے سلسلے میں بہت محتاط رہتا ہے، لیکن میرے مراسلے کو بالکل ویسا ہی نشر کیا گیا جیسا میں نے لکھا تھا۔

قتل و غارت گری کا آغاز ۶ اپریل کو ایک پُراسرار ہوائی حادثے میں صدر جووینال بابیاریمانا کے ہلاک ہونے کے بعد ہوا تھا۔ چند منٹ کے اندر اندر ہوتوؤں کے موت کے اسکواڈ

مرحوم صدر کے تمام سیاسی مخالفوں اور ممکنہ مخالفوں کو قتل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ان میں توتسیوں کے علاوہ، جو روانڈا کے پیٹریاٹک فرنٹ کی حمایت کرنے والا سب سے بڑا قبیلہ ہیں، اعتدال پسند ہوتو باشندے بھی شامل تھے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ کتنے لوگوں کی جان لی گئی۔ ریڈ کراس نے لگ بھگ پانچ لاکھ تک کی گنتی پر پہنچ کر گننا چھوڑ دیا تھا۔

کیگالی میں میری جن دوستوں سے ملاقات ہوئی تھی ان میں کیپٹن مبایے دیا گنے بھی شامل تھا۔ وہ سینیگال سے تعلق رکھنے والا اقوام متحدہ کا ایک فوجی مبصر تھا جو ۱۹۹۲ میں افریقی اتحاد کی تنظیم کے وفد کے ایک رکن کے طور پر روانڈا پہنچا تھا۔ ۱۹۹۳ کے اواخر میں اس وفد کو وسعت دے کر اقوام متحدہ کے مشن میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس مشن کے ارکان کے ذمے، جن میں بیشتر افریقی تھے، جنگ بندی کے نفاذ اور ایک مخلوط حکومت کے قیام کی نگرانی کرنا تھا۔

مبایے نے ڈاکر کی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے فوراً بعد سینیگال کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ جب میں اس سے پہلی بار ملا، وہ اخبار نویسوں کی بابت گہرے شک کا رویہ رکھتا تھا۔ ایک موقعے پر تو اسے خاص طور پر بہت غصہ آیا جب ایک فرانسیسی خبر نگار نے یہ (درست) اطلاع دی کہ کیگالی میں باغیوں کے غلبے کے باعث نیم فوجی ملیشیائیں وہاں سے فرار ہو رہی ہیں۔ "آپ میرے کام میں سخت دشواری پیدا کر رہے ہیں،" اس نے فرانسیسی صحافی سے کہا۔ "ملیشیاؤں کے فرار کی خبر لگنے سے ان کی انا کو ٹھیس لگے گی اور ممکن ہے وہ اور زیادہ لوگوں کو قتل کر ڈالیں۔" جیسا کہ مبایے کا دستور تھا، اس بحث کا اختتام مصافحے پر ہوا اور مبایے کے داغدار دانت مسکراہٹ میں کھِل اٹھے۔ "اپنا کام ضرور انجام دیجیے۔ لیکن مہربانی کر کے احتیاط کیجیے۔"

مبایے دراز قد اور بیشتر سینیگالیوں کی طرح چھریرے بدن کا تھا اور ہر وقت اپنی بے داغ سبز چھاپا مار وردی میں ملبوس رہتا تھا۔ یہ میرے لیے ہمیشہ ایک معما رہا کہ وہ اپنے چھوٹے سے کمرے سے، جس میں پانی کا کوئی نل موجود نہیں تھا، اس قدر صاف ستھری حالت میں کیوں کر برآمد ہوتا تھا۔ شاید یہ اس کے بچپن کا ورثہ تھا جو اس نے سینیگال کے دارالحکومت ڈاکر کے ایک مضافاتی علاقے پیکائین میں گزارا تھا۔ میں نے وہاں کے چوبی مکان دیکھ رکھے ہیں جن میں پانی کے

Scanned with CamScanner

نل نہیں ہوتے، اور جہاں سے مائیں اور بچے صاف سفید شاندار "بُوبُو" پہنے، جو شمالی سینیگال کا روایتی لباس ہے، ریتیلی گلیوں میں قدم رکھتے ہیں۔

مبایے سے میری دوستی ہو جانے کا سبب شاید یہ تھا کہ میں ڈاکر میں کچھ وقت گزار چکا تھا اور اُس کی مادری زبان وولوف کے کچھ لفظ جانتا تھا۔ ہم عموماً فرانسیسی میں بات کرتے تھے، اگرچہ وہ، بیشتر افریقیوں کی طرح، کئی زبانیں بول سکتا تھا جن میں انگریزی بھی شامل تھی۔ ہمارا ایک پسندیدہ موضوع خوراک، خصوصاً سینیگال کی مخصوص غذا، تھی۔ افریقی سپاہی ناٹو کے فراہم کیے ہوئے اپنے راشن سے خاص طور پر نالاں رہتے تھے؛ وہ ڈبوں میں بند اور صنعتی طور پر محفوظ کی گئی خوراک کے عادی نہ تھے اور مچھلی اور چاول کے خواب دیکھا کرتے تھے۔

مبایے کا کام اقوام متحدہ اور روانڈا کی سرکاری فوج کے درمیان رابطہ قائم رکھنا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اپنے دانتوں کے درمیان ایک سگریٹ اٹکائے اور نقشوں کا ایک پلندا بغل میں دابے وہ ہر وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہا ہوتا۔ ہر جانب سے لڑنے والے سپاہی مبایے کو خوب جانتے تھے کیوں کہ وہ سڑک پر کھڑی کی گئی رکاوٹوں پر ٹھہر کر ان سے ایک آدھ بات کر لینے کا وقت ہمیشہ نکال لیتا تھا۔

مبایے کو علم تھا کہ اقوام متحدہ کی پالیسی صرف اپنے غیر ملکی ملازمین کے انخلا تک محدود ہے اور اقوام متحدہ کے مختلف اداروں کے لیے کام کرنے والے مقامی روانڈائی باشندوں کو محفوظ مقامات پر لے جانا اس ذمے داری میں شامل نہیں ہے۔ جب یہ اعلان کیا گیا کہ بیشتر غیر ملکیوں کو کیگالی سے نکال لیا گیا ہے، تو اس کا مطلب یہ تھا کہ زیادہ تر سفید فام باشندے وہاں سے جا چکے ہیں۔ جس وقت یوروپ کے لیے یہ خبر نشر کی جا رہی تھی، میں نے تقریباً پانچ ہزار زائیری باشندوں کو اپنے ملک کے سفارت خانے کے باہر کھڑے دیکھا جو کیگالی سے نکالے جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ تھا، انھیں ملیشیا نے گھیر رکھا تھا اور ریڈ کراس کے سوا کوئی ان کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے ترجمان نے جو خالی پڑے سفارتی مشن کے اُجڑے ہوئے خاک آلود لان پر رہ رہے تھے، مجھ سے کہا، "اگر اقوام متحدہ ہمیں یہاں سے نہیں نکال سکتی تو ہم جنگ زدہ علاقوں سے پیدل گزر کر زائیر جائیں گے۔" چند روز بعد وہ لوگ جا چکے تھے۔ میں نہیں جانتا ان میں کتنے زائیر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

اپنی اقوام متحدہ کی ذمے داری نبھانے کی سخت محنت کے ساتھ ساتھ مبایے نے سینیگال اور روانڈا کے زیادہ سے زیادہ باشندوں کو بچانے کی بھی کوشش شروع کر دی۔ اس نے سب سے پہلے جن لوگوں کی جان بچائی ان میں روانڈا کی ہوتو وزیرا عظم اگاتھے اوویلنگی یمانا کے بچے شامل تھے، جو خود باغیوں کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے کسی حل تک پہنچنے کی حمایت کے جرم میں سرکاری فوج کے ہاتھوں ماری جا چکی تھی۔ کیپٹن مبایے سرکاری فوج سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ان کا اگلا نشانہ مقتول وزیرا عظم کے بچے ہوں گے۔ اس نے ان بچوں کو ڈھونڈ کر اپنے کمرے میں چھپا لیا اور پھر کسی نہ کسی طرح انھیں باہر بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔

حکومت کے مخالف ہزاروں توتسی اور ہوتو باشندوں نے کیگالی کے ایک حصے میں، جو سرکاری قبضے میں تھا، ایک ہوٹل میں پناہ لے لی تھی؛ یہ ہوٹل مل کولِنز تھا جو کبھی خاصا پُر تعیش سمجھا جاتا تھا۔ ان پناہ گزینوں نے ہوٹل کا سوئمنگ پُول جلد ہی خالی کر ڈالا کیوں کہ انھیں پینے اور نہانے دھونے کے لیے پانی کی ضرورت تھی۔ چند ہفتے بعد بجلی کی سپلائی بند ہو گئی۔ ملیشیا کے مسلّح جوان خطرناک انداز میں پھاٹک کے آس پاس گھوم رہے تھے۔ اقوام متحدہ کے چند غیر مسلّح فوجی علامتی حفاظت کی ایک باریک سی نیلی لکیر بنائے کھڑے تھے۔ مبایے بھی ان سپاہیوں میں شامل تھا۔ مخالف فریق کو مفاہمت پر آمادہ کر لینے کی اُس کی مہارت تھی جس نے قاتلوں کو لابی میں داخل ہو کر اپنا ہلاکت خیز کام شروع کر دینے سے باز رکھا تھا۔

طویل مذاکرات کے بعد اقوام متحدہ شہر کے اندرونی حصوں میں، مخالفانہ صف بندی کے اِدھر اور اُدھر، پھنسے ہوئے چند شہریوں کے باہم تبادلے کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہوئی۔ توتسیوں اور حکومت مخالف ہوتوؤں کو ہوٹل مل کولنز اور سرکاری قبضے کے دوسرے علاقوں سے بحفاظت نکالا جانا تھا، اور اس کے بدلے میں باغیوں کے زیرِ تسلّط علاقے میں واقع فٹ بال اسٹیڈیم سے ہوتوؤں کو سرکاری علاقے میں پہنچایا جانا تھا۔

اس باہمی تبادلے کی پہلی کوشش تقریباً ایک سانحے پر منتج ہوئی۔ سرکاری ملیشیا نے فیصلہ کیا کہ اس تبادلے میں وہ نقصان میں رہے ہیں، چناں چہ انھوں نے ہوٹل مل کولنز سے باہر نکلتے ہوئے اقوام متحدہ کے قافلے پر حملہ کر دیا۔ خنجروں سے مسلّح مرد اور ادھوری وردیاں پہنے لڑکے مسافروں کو گھیر کر اور سڑک روک کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے قافلے میں شامل ایک شخص نے بعد میں

Scanned with CamScanner

ایک خط میں لکھا: "کیپٹن مبایے دیا گنے نے ہماری جانیں بچائیں۔ وہ نہتا لاری پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے پیروں، اپنے کٹ بیگ اور کسی بھی چیز کے ذریعے ملیشیا کا سامنا کرنے لگا۔ ہم اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

ملیشیا کے خنجروں سے کئی افراد کے شدید زخمی ہونے کے بعد اس قافلے کو واپس ہوٹل بھیج دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد کے تبادلے ٹھیک طرح انجام پائے۔ دہشت زدہ لوگوں سے بھرے اقوام متحدہ کے سفید ٹرکوں پر مشتمل دو قافلے بیک وقت لڑائی کی صف بندی پر واقع چوراہے پر ایک دوسرے کے برابر سے گزرے۔ یہ ٹرک جنھیں گھانا سے تعلق رکھنے والے اقوام متحدہ کے فوجی چلا رہے تھے، اقوام متحدہ ہی کی وساطت سے طے پانے والی متزلزل جنگ بندیوں میں سے گزر کر اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے؛ یہ جنگ بندیاں بار بار توڑی جاتیں اور کبھی بھی چند گھنٹوں سے زیادہ قائم نہ رہتیں۔

اس کے علاوہ اَور بھی بہت سے موقعے تھے جب کیپٹن مبایے نے لوگوں کی جانیں بچائیں۔ اقوام متحدہ کے ایک امدادی کارکن کے پاس اُن روانڈائی باشندوں کی فہرست تھی جو جنگ شروع ہونے سے پہلے اقوام متحدہ کے مختلف اداروں کے لیے کام کر رہے تھے۔ ان میں سے بعض کے ناموں پر لکیر پھیر دی گئی تھی۔ یہ مر چکے تھے۔ بعض دوسرے لوگوں کے ناموں کے آگے رقمیں لکھی تھیں ـــ ۳۵ ڈالر، ۳۰ ڈالر ـــ یہ وہ رقمیں تھیں جن کے عوض سڑکوں پر بنی ملیشیا کی رکاوٹوں پر ان کی جاں بخشی کرائی گئی تھی؛ ملیشیا والوں سے مذاکرات کرنے والا مبایے ہوتا تھا۔

سرکاری فوج کی ایک بڑی بیس کے ٹھیک سامنے کوئی بیس گز کے فاصلے پر مبایے نے ایک پورے خاندان کی جانیں بچائیں جو ایک بظاہر خالی پڑے مکان میں چھپے بیٹھے تھے۔ یہ لوگ توتسی تھے، لیکن مبایے نے بہت سے ہوتوؤں کو بھی بچایا۔

اور مجھے خیال ہوتا ہے کہ مبایے نے میری بھی جان بچائی تھی۔ میں اس کی گاڑی میں سوار، کیگالی کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ ہمیں اس شہر میں سڑکوں پر جگہ جگہ بنی ہوئی رکاوٹوں میں سے ایک پر روکا گیا اور ملیشیا کا ایک جوان، چینی ساخت کا اسٹک گرینیڈ لیے، اس طرف سے گاڑی کے قریب آیا جدھر میں بیٹھا تھا۔ "کیا تم بیلجیئن ہو؟" اس نے پوچھا۔ سرکاری ریڈیو اسٹیشن نے

اعلان کیا تھا کہ صدر کی ہلاکت کے ذمے دار بیلجیئن ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مبایے نے اسے مضبوط لہجے میں مخاطب کیا۔ "مجھ سے بات کرو۔ یہ میرے ساتھ ہیں،" اس نے فرانسیسی میں کہا۔ مبایے غیر مسلح تھا، پھر بھی ملیشیا کا جوان اٹنشن کھڑا ہو گیا۔ وہ گھوم کر گاڑی کے دوسری طرف پہنچا۔ "کیا یہ سفید فام شخص بیلجیئن ہے؟" اس نے سوال کیا۔ "احمق مت بنو!" مبایے کا لہجہ اب بھی مضبوط تھا ـــــ میرے نزدیک ضرورت سے کچھ زیادہ مضبوط۔ پھر وہ اپنے داغدار دانتوں سے مسکرایا۔ "یہاں صرف مَیں بیلجیئن ہوں، سمجھے!" اس نے مذاقاً اپنی سینیگالی جلد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "سیاہ فام بیلجیئن۔" ملیشیا کا سپاہی ہنسنے لگا۔ "اب تم،" مبایے ایک بار پھر مضبوط لہجے میں بولا، "میرا راستا چھوڑو۔ میں اقوام متحدہ کا فوجی مبصر ہوں اور مجھے اس رکاوٹ کے اُس پار جانا ہے۔" ہم نے اپنا راستا نہیں بدلا۔

میں مبایے کے کام کی بابت اپنی بی بی سی کی رپورٹوں کو سنسر کر دیتا تھا۔ اگر یہ خبر پھیل جاتی کہ ایک سینیگالی افسر لوگوں کو بچاتا پھر رہا ہے تو وہ خود اور علاقے میں اب تک موجود حکومت مخالف افراد سنگین خطرے کی زد میں آ جاتے۔ لیکن اب مبایے کی سرگرمیوں کے بارے میں کھل کر لکھنا نسبتاً محفوظ ہے۔

میں اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹر کے کار پارک کے نزدیک کھڑا تھا جب ہم سب نے اس واقعے کی خبر سنی جسے بعد میں فوجی ترجمان نے "حادثے" کا نام دیا۔ اقوام متحدہ کا ایک امدادی کارکن ہو لوگوں کو خطرے سے نکالنے کی مہموں میں مبایے کے ساتھ رہا تھا، بہت غمزدہ ہوا۔ "ایک فوجی مبصر ابھی ابھی مورٹر کے گولے کا شکار ہو گیا ہے۔"

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی معلوم نہیں،" امدادی کارکن بولا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے سن لیا تھا کہ یہ کون سا افسر تھا، لیکن وہ خود کو اس امید سے بہلا رہا تھا کہ ممکن ہے یہ خبر غلط ہو۔ پھر اس نے خاردار تاروں کی باڑ میں سے جھانک کر احاطے میں نظر ڈالی۔ "میں دعا کر رہا ہو کہ یہ کیپٹن مبایے نہ ہو۔"

دوطرفہ ریڈیو میں سے آواز آئی۔ "کیپٹن مبایے دیا گنے غائب ہو گیا ہے۔ ایک ایمبولینس اس کے آخری معلوم ٹھکانے کی طرف بھیج دی گئی ہے۔"

Scanned with CamScanner

میں لاش کے ہٹائے جانے کے پانچ منٹ بعد جائے واردات پر پہنچا۔ مبایے کی لینڈ کروزر کی سامنے والی سیٹ خون میں لت پت تھی۔ وہ باغیوں کے مورٹر کے ایک گولے کی زد میں آ کر، جو گاڑی کے ڈرائیور والے دروازے سے تین گز دور آ کر گرا تھا، موقعے ہی پر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ ایک چیک پوائنٹ پر، جسے خود اس نے "کیگالی نائٹ کلب برج" کا نام دیا تھا، سرکاری فوج کے سپاہیوں سے بات چیت کر رہا تھا۔

ایک ہوتو سویلین نے، جو خود بھی اقوام متحدہ کے لیے کام کرتا تھا، مبایے کے جان بچانے کے مشن کا کچھ حصہ اپنے ذمے لینے کی کوشش کی۔ اب اس کی شناخت ہے جسے چھپانا ضروری ہو گیا ہے۔ "مبایے مر گیا،" اس شخص نے کہا۔ "میں اس کا کام جاری رکھنے کی کوشش کروں گا۔ کوئی اور آدمی اس شہر کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتا۔"

کیگالی میں میرے قیام کے آخری دن خبر نگاروں کو اقوام متحدہ کی طرف سے باغیوں کے زیرِ تسلط علاقے میں واقع اپنے ہیڈ کوارٹر سے سرکاری فوج کے قبضے کے علاقے میں واقع ریڈ کراس اسپتال تک لے جائے جانے کی پیش کش ہوئی۔ ہمیں کیگالی نائٹ کلب برج سے گزر کر جانا تھا۔ میں اقوام متحدہ کی گاڑی میں سوار ہو کر پہلے بھی کئی بار اِدھر سے اُدھر آ جا چکا تھا۔ لیکن اس بار اپنی فلیپ جیکٹ اور ٹیپ ریکارڈر اٹھاتے ہوئے مجھے اپنے دوست کا خیال آیا۔ میں اپنے کام کے آخری دن مرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یہ لغو خیال آیا کہ یہ سفر کرنا نادانی ہو گی۔ میں اس سفر پر نہیں گیا۔

**

گابریئل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

("آج"، شمارہ ۷: بہار ۱۹۹۱، کتاب کی صورت میں)

لاطینی امریکا کے ملک کولوجیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب
کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول
"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد"
تیرہ منتخب کہانیاں
دو ناولوں "تنہائی کے سو سال" اور "وبا کے دنوں میں محبت" کے منتخب ابواب
مارکیز کی نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے کی تقریر اور ایک اہم مضمون
"کولوجیا کا مستقبل"
مارکیز کے فن پر دو مغربی نقادوں کے مضامین
اپنی زندگی، فن اور خیالات پر مارکیز کی ایک طویل گفتگو
مارکیز کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے بارے میں
ان کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت: دو سو روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner

انتخاب

نجیب محفوظ

کا ناول

شادیانے

(دوسرا اور آخری حصہ)

انگریزی سے ترجمہ: فہمیدہ ریاض

Scanned with CamScanner

آئندہ صفحات میں مصر کے معروف ادیب نجیب محفوظ کے ناول "افراح القبّہ" کے اردو ترجمے کا دوسرا اور آخری حصّہ پیش کیا جارہا ہے؛ اس ترجمے کا پہلا حصّہ گزشتہ شمارے میں شامل تھا۔ یہ ترجمہ، جسے اردو میں "شادیانے" کا عنوان دیا گیا ہے، ناول کے انگریزی ترجمے کو بنیاد بنا کر کیا گیا ہے جو Wedding Song کے عنوان سے پہلی بار ۱۹۸۴ میں شائع ہوا۔ تاہم، اردو ترجمہ کرتے ہوئے ناول کے اصل عربی متن کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

ناول کے عنوان کی تھوڑی سی وضاحت کر دینا مناسب ہو گا۔ "افراح القبّہ" کا لغوی مفہوم کسی بزرگ کے مزار پر برپا کیا جانے والا شادی کا جشن ہے۔ لیکن اس ناول میں پیش آنے والے واقعات کا محلِ وقوع شہر قاہرہ ہے جہاں یہ اصطلاح ایک مخصوص معنی رکھتی ہے۔ "القبّہ" خدیوِ مصر کے سرکاری محلّات میں سے ایک کا نام تھا، اور خود نجیب محفوظ کی وضاحت کے مطابق خدیو کے خاندان کی شادیوں کی خاص بات وہ جلوس تھے جن میں لوگ گاتے اور رقص کرتے چلتے تھے۔ ان جلوسوں میں گائے جانے والے گیتوں کو رفتہ رفتہ "افراح القبّہ" کہا جانے لگا۔

نجیب محفوظ کو عربی زبان کے نمایاں ترین ناول نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی شہرت کی اصل بنیاد ان کے طویل ناول ہیں جو قاہرہ کی زندگی کی پیچیدگی اور رنگینی کو نہایت تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن مختصر ناولوں اور کہانیوں میں بھی اس منفرد فکشن نگار کی فنی مشاقی اور انسانی نفسیات سے گہری شناسائی اپنی جھلک دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ "شادیانے" بھی اس کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ نجیب محفوظ کے پچیس سے زائد ناول اور کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں، اور ان میں موضوعات، اسلوب اور نقطۂ نظر کا تنوّع ملتا ہے، لیکن جس موضوع سے نجیب محفوظ کو ہمیشہ شدید دل چسپی رہی ہے وہ "وقت" اور اس کے اثر سے انسانی زندگی میں آنے والی حیران کن تبدیلی ہے۔ اس ناول میں بھی، جو عربی میں پہلی بار ۱۹۸۱ میں شائع ہوا، پڑھنے والے کی توجہ وقت کے بہاؤ پر مرکوز ہوتی ہے جو محبت کو نفرت میں، حُسن کو بدصورتی میں، وفاداری کو خیانت میں اور آدرش پسندی کو بدعنوانی میں بدل دیتا ہے اور اپنا انمٹ نشان کہانی کے تمام کرداروں پر چھوڑ جاتا ہے، اور یہاں تک کہ اس قدیم مکان پر بھی جو ان کرداروں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ نجیب محفوظ نے کہانی کو چار کرداروں کی زبانی بیان کیا ہے اور اس مقصد کے لیے اندرونی خود کلامی کی تکنیک نہایت کامیابی سے اختیار کر کے ان میں سے ہر ایک کی انفرادی شخصیت اور نقطۂ نظر کو اجاگر کیا ہے۔ ناول کی اس ساخت سے یہ نکتہ بھی بڑی خوبی سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح واقعات کی مختلف تفصیلیں لوگوں پر جدا جدا اثر ڈالتی ہیں اور یوں نہ صرف ان کے انفرادی نقطۂ نظر کی تشکیل کرتی ہیں بلکہ ان کی شخصیت کے خدوخال کو متعین کرتی ہیں۔

اس سے قبل "آج" کے شمارہ ۲ (سرما ۱۹۹۰) میں نجیب محفوظ کی ایک کہانی کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

Scanned with CamScanner

حلیمہ الکبش

دوسرا جنم... جیل کی کوٹھری سے روئے ارض پر... میرے سامنے عباس کا چہرہ۔ عباس کو سینے سے لگائے ہوئے، عار اور خجالت کے بوجھ تلے جھکے ہوئے، میں نے عباس کے سینے میں چہرہ چھپا لیا تھا۔ میں نے کہا تھا:

"ہم نے تیرے ساتھ کس قدر بدسلوکی کی۔ کاش ہمیں موت آجاتی۔ ہم سے تیرا پیچھا تو چھوٹتا۔"

اُس نے نرمی سے کہا تھا:

"تکلیف تو صرف اب آپ کی باتوں سے ہو رہی ہے۔"

میں آنسو ضبط نہیں کر پائی۔

"اب تو ہم شکر کریں... اب مستقبل کی فکر کرنی چاہیے۔"

میں نے گلوگیر آواز میں کہا:

"اے میرے بیٹے، تو اکیلا رہ گیا۔ اللہ کی ابتلا نے تیری زوجہ اور اولاد کو چھین لیا... اور ہم تجھے دلاسا دینے کو موجود نہیں تھے۔"

"جو ماضی ہے وہ ماضی ہے۔"

اس نے باپ سے ایک کلمے کا بھی تبادلہ نہ کیا۔ ہم ماضی کی طرح ایک بار پھر اُس بیت القدیم کے بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔

اس نے کہا، "دیکھو اب ماضی کا دوبارہ ذکر نہ کرنا..." پھر لمحہ بھر توقف کے بعد کہنے لگا:

"میں سوچتا رہا ہوں کہ کیا کرنا چاہیے... کیا ابا تھیٹر میں اپنا پرانا کام دوبارہ شروع کرنا چاہتے ہیں؟"

Scanned with CamScanner

کرم نے کہا:

"ہرگز نہیں... لعنت ہو اُن سب پر!"

"تو پھر میں سامنے والے کمرے میں ایک دکان لگا دیتا ہوں۔ کچھ سامان بیچ دیں گے اور کھانے پینے کی چیزوں کی دکان کھول لیں گے... آسان کام ہے، اور منافع اچھا ہوتا ہے۔ آپ دونوں کا کیا خیال ہے؟"

میں نے امتنان سے کہا:

"جو تیری رائے ہو بیٹا... اللہ عنقریب تیرے بارے میں اچھی خبر سنوائے۔"

"باذن اللہ... میرا خیال ہے میں کامیابی کے قریب پہنچ رہا ہوں..."

میں بار بار اُس پر اللہ کی رحمت بھیجتی رہی۔ حتی کہ اس نے ہم دونوں کو باری باری دیکھ کر کہا:

"اہم بات یہ ہے کہ آپ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ اور میں کوئی ایسی بات نہ سنوں جس سے مجھے رنج ہو۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

"میرا خواب تھا کہ تیرے ساتھ رہتی۔"

اس نے کہا:

"اگر اللہ کی رضا ہے کہ میں کامیاب ہو جاؤں تو سب کچھ بدل جائے گا۔"

کرم نے سختی سے کہا:

"تم اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟"

"آپ دونوں تعاون سے رہیے۔ آپ دونوں کے اچھی زندگی گزارنے کے لیے مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا وہ میں کروں گا۔ مگر آپ دونوں تعاون سے رہیے..."

کیسا تعاون؟ وہ کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ وہ اس درجہ سادہ لوح ہے کہ دلوں کے راز نہیں جانتا، خواہ وہ عین اس کی آنکھوں کے سامنے ہوں۔ وہ کیوں کر جان سکتا ہے کہ اس کے باپ نے کیا حرکتیں کی ہیں جبکہ اس نے تو اُس کا ظاہر ہی دیکھا ہے؟ میرا بیٹا جس طور چاہے قربانیاں دے اور شفقت اور سخاوت کرے، مگر اسے احساس نہیں کہ وہ دو حریفوں کو جیل کی ایک کوٹھری میں بند کر

Scanned with CamScanner

رہا ہے۔ ایک جیل سے دوسری جیل میں! اس کے سوا میرے لیے دوسرا آسرا نہیں میرے بیٹے کہ تُو کامیاب ہو اور مجھے بچا لے۔

***

میں اُسے کام کرتے ہوئے دیکھتی ہوں ـــــ مونگ پھلیاں، تربوز کے بیج، مکئی کے دانے اور مٹر بیچتے ہوئے۔ وہ آدھ کھلی دراز میں پیاستر پھینکتا جاتا ہے۔ اتنے طویل عرصے تک رزقِ حرام میں غرق رہا ہے کہ بے شک وہ دوبارہ اُس عادت کی طرف راغب ہونا چاہتا ہو گا جس کا جیل نے علاج کر دیا تھا۔ اگر عباس نے اصرار نہ کیا ہوتا کہ ہم آمدنی آپس میں برابر برابر تقسیم کیا کریں تو ہم دوبارہ برباد ہو چکے ہوتے۔ اس کے چہرے پر مستقل کیسا ملال چھایا رہتا ہے۔ جب کوئی گاہک آجائے صرف اس وقت ہی یہ حُزنیہ نقاب اس کے چہرے سے اُترتا ہے۔ بڑھاپا اس پر اس طرح چھایا ہے کہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڈھا لگنے لگا ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کہ میں بھی بڈھی ہو گئی ہوں... وہ جیل کے پُر آلام ایام... وہ رات جب چھاپا پڑا تھا اور مخبر میرے منہ پر طمانچے مارے جا رہا تھا... آہ! ... حرام زادے! ... ان میں سے ایک بھی ہم سے ملنے نہیں آیا... الہلالی بھی طارق رمضان کی مثل حرام زادہ ہے ... اُنھیں بس ایک رات حراست میں رکھا گیا اور پھر چھوڑ دیا گیا، اور سزا صرف ہمیں سنائی گئی۔ پڑوسی کہتے ہیں کہ قانون صرف مسکینوں کے واسطے سخت ہے۔ وہ بھی ہمیں مجرم گردانتے ہیں اور ہم پر ہنستے ہیں، مگر ہماری دکان سے سودا خرید لیتے ہیں۔ میرے لیے کوئی راہِ نجات نہیں، مگر اے میرے بیٹے، بس تیری کامیابی... وقت گزرتا جاتا ہے اور ہم ایک دوسرے سے ایک کلمہ بھی نہیں کہتے۔ نفرت کی آنچ تندور سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس مکروہ بیت القدیم کو صاف کرتے ہوئے یا کھانا پکاتے ہوئے مجھے کس قدر گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ آخر مجھے اس منحوس زندگی کو بسر کرنے کی سزا کیوں ملی ہے؟ کبھی میں حسین و جمیل تھی، مہذب اور پاک دامن تھی۔ قسمت... قسمت... کون مجھے قسمت کا مطلب سمجھائے گا؟ لیکن اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے... میری قسمت تیرے ہاتھ میں ہے اے عباس! سیدی الشعرانی کے عرس کی وہ رات مجھے کبھی نہ بھولے گی جب تُو نے مجھے کرب سے رہائی دینے والے الفاظ ادا کیے تھے:

Scanned with CamScanner

"آخر کار، میرا ڈراما منظور کر لیا گیا..."

اس کے بچپن سے لے کر اب تک میں اتنی خوش کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے اوّل شباب کی مانند بشاش ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اُس کے باپ کا چہرہ بھی مسرّت سے روشن ہو گیا تھا۔ کیوں بھئی، تیرا اس سے کیا لینا دینا؟ میری تو سمجھ میں نہیں آتا! تُو تو اس سے نفرت کرتا ہے، جیسے مجھ سے کرتا ہے۔ ٹھیک ہے، وہ تمھاری خرافات کے برعکس مصنّف، بن گیا۔ مگر تم تو اس کے خیالات کو احمقانہ سمجھتے تھے۔ لیکن خیر کو نصرت نصیب ہو گی۔ اُس کی طاقت و قوّت تم جیسے سِفلوں کو جھاڑو کی طرح صاف کر دے گی۔

***

مجھے خریف پسند نہیں، بجز اس کے کہ افتتاحی راتیں نزدیک تر آ رہی ہیں۔ یہ بادل آتے کہاں سے ہیں جن سے روشنی کم ہو جاتی ہے؟ میرے دل پر جو بادل چھائے ہیں کیا وہ کافی نہیں؟ میں مرد کی آواز سنتی ہوں جو کہہ رہا ہے:

"وہ دیکھو... سامنے طارق رمضان ہماری طرف ایسے آ رہا ہے جیسے سڑک پر کسی حادثے کی خبر لایا ہو۔ کیا یہ ہمیں مبارک باد دینے آیا ہے یا ہمارا تمسخر اڑانے؟"

میں نے کہا:

"بہت خوب... اہلِ وفا کی اوّلیں زیارت!"

اُس کی عذر خواہیوں کو میں نے سنا ان سنا کر دیا جب تک اس نے یہ نہ کہا کہ "میں ایک بری خبر لایا ہوں۔"

میں نے غصے میں اس سے کہا:

"بری خبر کی اب ہمارے لیے کوئی حقیقت نہیں۔"

"خواہ وہ عباس یونس ہی کے بارے میں کیوں نہ ہو؟"

میرا بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر بھی میں نے پُرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے فخر سے کہا:

"اس کا ڈراما قبول کر لیا گیا ہے۔"

Scanned with CamScanner

"یہ ایک ذلیل مذاق ہے! معلوم بھی ہے کہ یہ ڈراما ہے کیا؟"

پھر اُس نے پورے ڈرامے کا خلاصہ سنایا، اہم واقعات کی تفصیلات بتائیں، اور بولا:

"پورا حال... پورا حال ہے اس ڈرامے میں۔"

میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا:

"تیرا کیا مطلب ہے اے عباس کے عدو؟"

جاؤ خود ڈراما دیکھ لو۔"

"نفرت نے تجھے اندھا کر دیا ہے۔"

"نفرت نے نہیں، جرم نے..."

"مجرم تو تُو خود ہے۔"

"تحیہ کے قاتل کو سزا ملنی چاہیے۔"

"تُو خود ایک خسیس مجرم ہے۔ تُو دفع کیوں نہیں ہو جاتا..."

وہ ہنسا اور بولا:

"کون کہتا ہے کہ جیل میں تادیب اور اصلاح ہو جاتی ہے۔"

میں نے مٹھی بھر تربوز کے بیج اٹھا کر اس کے منہ پر مارے۔ وہ خباثت سے ہنستا ہوا چلا گیا۔

عباس نے کیا لکھ ڈالا؟ یہ اُس نے کیا کیا؟ میرا بیٹا کبھی قتل نہیں کر سکتا، کبھی خائن نہیں ہو سکتا۔ کم از کم اپنی ماں سے تو خیانت کبھی نہ کرے گا... وہ تو فرشتہ ہے۔

مرد سے میری نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ مجھے اپنی اس ابدی تنہائی سے خود کو گھسیٹ کر باہر نکالنا پڑے گا۔ میں نے کہا:

"یہ جھوٹ ہے!"

"وہ کیوں جھوٹ بولے گا؟"

"وہ میرے بیٹے سے نفرت کرتا ہے۔"

"مگر ڈراما تو لکھا گیا ہے۔"

"تم عباس کے پاس جاؤ..."

Scanned with CamScanner

"اس سے تو مل ہی لوں گا۔"

"مگر تم تو بیٹھے ہوئے ہو۔"

"عجلت کس بات کی ہے؟"

وہ مجھے عاجز کر دیتا ہے۔ طارق کی طرح وہ بھی عباس سے نفرت ہی تو کرتا ہے۔ میں نے کہا:

"اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے پیٹھ پیچھے کیا کہا جا رہا ہے۔"

"اور اگر اس نے اعتراف کر لیا تو؟"

"وہ ہر بات کی وضاحت کر دے گا۔"

"کیا معلوم..."

"حقیقی قاتل اپنی فضیحت تھوڑا ہی کرتا ہے۔"

"کیا معلوم..."

"تم جا کر اس سے ملو تو سہی۔"

"چلا جاؤں گا۔"

"تم کہو تو میں چلی جاؤں؟"

"تمہارے پاس مناسب لباس ہی نہیں ہے۔"

"تو پھر تم جاؤ۔"

"حرام زادہ، جھوٹا! وہ ہماری طرزِ زندگی سے کراہت کرتا تھا... ابنِ حرام... خود کو مثالی سمجھتا تھا! مگر خیر... اس نے ہمیں دھوکا تو کبھی نہیں دیا۔ اور تحیہ کو بھلا وہ کیوں قتل کرے گا؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔"

"یوں ہی، سوچ رہا تھا۔"

"تمہیں اس حرام زادے کی بات کا یقین آ گیا ہے۔"

"یقین تو تمہیں بھی آ گیا ہے۔"

میں نے ہونٹ بھینچ کر آنسو روکے اور کہا:

"دیکھنا یہ ہے کہ عباس کیا کہتا ہے۔"

Scanned with CamScanner

"سچ تو یہ ہے کہ میرے خیال میں یہ سب جھوٹ ہے۔"

"اب بذیان مت بکو!"

"لعنت ہو تجھ پر!"

"لعنت تو تب سے جب سے تیرے پلّے پڑی..."

"میرا بھی یہی حال ہے۔"

میں نے طیش میں آ کر کہا:

"میں کبھی حسین تھی... یہ تو میرا نصیب ہے..."

"تمھارا باپ ڈاکیا تھا۔ میرا باپ تو الشمشر جی خاندان کی جاگیر پر کام کرتا تھا۔"

"یعنی خدمت گار تھا۔"

"میں خاندانی ہوں۔"

"اور تمھاری ماں کیا تھی؟"

"تمھاری ہی طرح کی تھی!"

"خرافات بکنے والے! تُو جانا ہی نہیں چاہتا... یہی بات ہے نا؟"

"جب میرا دل چاہے گا تب جاؤں گا۔" پھر اس نے لہجہ بدل کر کہا:

"وہ عصر کے وقت گھر پر ہو گا۔"

کوشش سے میں نے اس کی کاہلی پر صبر کیا، حالاں کہ شک مجھے ہلاک کر رہا تھا۔ میرا سارا بدن مفلوج ہوا جا رہا تھا۔ اچھے لوگوں کے بارے میں وہ کیا کہاوت ہے؟ خرابے میں گلاب جیسے ہوتے ہیں؟ قاتلوں اور ان کے شکاروں کی بستی میں... اس مرد نے لباس سِلوانے کے لیے مجھے کپڑا خرید کر دیا ہے مگر میں ٹالے جا رہی ہوں۔ اب فوراً قطع کر کے سینے کے لیے دے دوں گی۔ رنڈی کی اولاد، میرے نسب پر حرف رکھتا ہے! ... مگر عباس اپنی ماں سے خیانت نہیں کر سکتا۔ وہ اور کسی بھی شے کو حقارت سے دیکھتا ہو، مگر اپنی ماں کی محبت کو ہرگز نہیں... محبت شر سے زیادہ طاقت ور ہے...

***

Scanned with CamScanner

بچپن میں میرا پُر مسرت گھر... طمبکشیہ میں، جہاں سورج ہمیشہ چمکتا رہتا تھا، سردیوں میں بھی، رات کے وقت بھی... جہاں حسین حلیمہ رہتی تھی... حسین ماں کی بیٹی۔ ابا اچھی اچھی چیزیں لاتے تھے۔ میری ماں کہتی تھی:

"اِسے نہ روکنا۔ تعلیم سے اسے زندگی کے اچھے مواقع ملیں گے۔ کاش ایسا موقع مجھے بھی ملا ہوتا!"

یہ ابا کی وفات سے پہلے کی بات ہے... پھر ایک دن ہمارا نیک رشتہ دار عم احمد برجل آیا۔ اس نے امی سے کہا:

"یتیم لڑکی ہے۔ اس کی تعلیم اب مشکل ہو گئی ہے۔"

"پھر کیا کریں، عم احمد؟"

"اس کے پاس سرٹیفکیٹ ہے... ذہین لڑکی ہے... اسے ضرور کام مل جائے گا۔ تھیٹر میں ایک کیشیئر کی ضرورت ہے۔"

امی نے پوچھا تھا:

"کیا یہ کام تمہارے لیے مناسب رہے گا؟"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا تھا:

"مشق سے نقص دور ہو جائیں گے۔"

عم احمد نے کہا تھا:

"الشمشرجی الہلالی کے دوست ہیں۔ وہ ہمارے محسن ہیں۔ ان کا نام لینا تو کام بن جائے گا۔ پھر میں سنبھال لوں گا۔"

اس طرح مجھے اس دنیا کا نیا تجربہ ہوا جب میں نے تھیٹر کے دروازے پر اوّل بار قدم رکھا۔ وہ عمارت کتنی شان دار تھی۔ اس کی خوشبو تک خاص قسم کی تھی۔ وہاں جا کر عم احمد کی اہمیت میری نظر میں کچھ نہ رہی۔ بلائے جانے پر میں نے پروڈیوسر سے ملنے کے لیے اندرونی کمرے میں قدم رکھا۔ میں پرانے جوتوں اور سادہ لباس میں ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتی پروڈیوسر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا بلند و بالا قد، حکمرانہ شان اور آر پار ہو جانے والی نگاہوں کا تاثر کس قدر شدید

تھا۔ اس نے اتنی دیر تک میرا معائنہ کیا تھا کہ میری تقریباً جان نکل گئی تھی۔ آخر اُس نے مجھے ایک کاغذ دیا تاکہ رقمیں درج کرنے میں میری استعداد کا امتحان لے۔

"کام شروع کرنے سے پہلے تربیت لینی ہو گی یا...؟" میں نے شرماتے ہوئے کہا تھا۔

"حلیمہ الکبش..." وہ مسکرایا تھا۔ پھر اس نے کہا تھا:

"الکبش؟ خیر کچھ بھی ہو... اس تھیٹر کی کئی ممثلاؤں سے بڑھ کر قبول صورت ہو۔ تربیت کے بعد تمھارا امتحان لینا چاہوں گا۔"

اور میں جوش و خروش سے کام میں لگ گئی تھی ـــــ اپنے مستقبل کے لیے نہیں، اس پُرکشش جادوگر کو خوش کرنے کے لیے۔ میں نے اپنی امّی سے اُس کا حلیہ بیان کیا تو انھوں نے بتایا کہ اونچے طبقے کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس کی رضا حاصل ہو جائے تو کیسی مبارک نعمت ہو گی۔ بعد میں جب میں اس کے سامنے کھڑی تھی تو میرے انفاس مضطرب تھے۔ حلیمہ، تم تو ہماری کمپنی کا گوہرِ نایاب ہو۔ اللہ خود جمیل ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے۔ اس نے میرا بدن کس وقت سہلانا شروع کیا تھا؟ کھلے در سے سورج کی تیز شعاعیں میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ باہر کوئی دیہاتی بانسری پر رقص کی دُھن بجا رہا تھا۔ میں نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ اس کا ہاتھ پرے دھکیلا تھا۔ نہیں جناب، میں شریف لڑکی ہوں۔ اس کی ہنسی میرے کانوں میں گھنٹی کی طرح بجی تھی۔ اس وسیع مقفّل کمرے میں چھائی خاموشی میں میرے احتجاج نے دم توڑ دیا تھا۔ تیز گرم تنفّس اور ہوشیاری سے کی گئی دست درازی، اور میرا عزمِ صادق شکست کھا گیا۔ یہ ایسا کابوس تھا جس میں اشک بہتے تو ہیں مگر ان سے کوئی ہم دردی نہیں کر سکتا۔ اس کمرے کے باہر لوگ آتے رہے اور جاتے رہے... امّی کا یہ سب کچھ معلوم ہونے سے پہلے انتقال ہو گیا...

***

آخرکار عصر کے وقت وہ چلا گیا۔ میرے اعصاب کچھ پُرسکون ہوئے۔ میں تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہی ہوں۔ مگر میں کیا توقع کر سکتی ہوں؟ کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے یہ لباس ہی تیار کر لوں۔ میرا بیٹا اپنے راز مجھے بتائے گا، اس کریہہ مرد کو نہیں۔ عباس کے سوا اب میرا کون ہے؟

Scanned with CamScanner

***

مایوسی افیون کے ساتھ... نہیں، اس سے بھی پہلے آئی تھی۔ میری امیدیں... جو سب مر چکی ہیں... دفن ہو چکی ہیں... کس قدر سہانی تھیں۔ مجھے یاد ہے... ایک رات جب اس نے گلاس کی تلچھٹ تک پی لی تھی... نشے میں کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دانت نکوس کر کہا تھا:

"میری ماں اُس پولیس والے کے ساتھ اسی کمرے میں جایا کرتی تھی!"

یہ انکشاف ایسا سفاک تھا کہ میں ہَول گئی تھی۔ عباس کمبل میں لپٹا اپنے جھولے میں سو رہا تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"تم نشے میں ہو، کرم..."

اس نے سر ہلا کر کہا:

"اور مجھے کہتی تھی کہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلوں۔"

"یہ تو بہت بُری بات تھی..."

اس نے میرا کلام قطع کر کے کہا:

"میں منافقت پسند نہیں کرتا۔ تم منافق ہو حلیمہ!"

"اللہ اس کی مغفرت کرے۔ کیا تم اب بھی اس سے نفرت کرتے ہو؟"

"میں کیوں نفرت کروں گا۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"تمھارا شوہر مردوں میں یکتا ہے۔ وہ لوگوں کے بنائے ہوئے کسی دروغ پر یقین نہیں کرتا!"

اس کا کیا مطلب ہوا؟ وہ بُرا شوہر نہیں تھا لیکن ہر شے کا تمسخر اڑاتا تھا ــــ ہر مقدس رسم کا، میرے اصولوں کا۔ کیا یہ مرد کسی شے کی تعظیم نہیں کرتا؟ اس قدر بے حیائی سے اپنی ماں کا راز فاش کر دیا!

پھر اس نے کہا:

"اور یہ ہم دونوں کے لیے اچھا ہے۔ ورنہ میں شادی کی رات ہی تمھیں طلاق دے دیتا۔"

میرے دل پر گھونسا لگا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ یہ میری زندگی کی دوسری کاری ضرب تھی۔ پھر اس نے کہا:

"معذرت یا حلیمہ! تم کب آزاد ہو گی؟"

"تم سفاک اور بد طینت ہو!"

"ان کلمات کو استعمال کرنے کی زحمت نہ کرو۔ میرے لیے یہ بے معنی ہیں۔"

پھر اس نے مجھے اپنی ماں کے اُس پولیس والے سے معاشقے کی داستان سنائی تھی۔ کس طرح وہ کرم کو توجہ سے محروم رکھتی تھی۔ کس طرح، اس کی ماں کے افعال کے باعث، اس کی پرورش "آزادانہ" ہوئی۔ آخر میں، نشے کی بنسی بنستے ہوئے، اس نے کہا تھا:

"آج میں جو کچھ ہوں اپنی ماں کی وجہ سے ہوں۔"

وہ ایک طوق کی طرح میرے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ میں ایک ایسی قوت کے ساتھ رہ رہی تھی جس کا کوئی اصول نہ تھا۔ اس کے ساتھ میں کن بنیادوں پر سلوک کروں؟ مایوسی تو افیون سے پہلے ہی آ گئی تھی۔ پھر رہا ہی کیا تھا جسے افیون چھینتی۔

***

جس لمحے میں نے اُسے گلی میں آتے دیکھا، نفرت کے باوجود میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے وہ دکان سے کہیں زیادہ بوڑھا لگ رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا:

"اس نے کیا کہا؟"

اس نے سرد مہری سے کہا:

"وہ سوٹ کیس لے کر اس مکان سے کہیں چلا گیا ہے۔"

یا عذاب! یا حرمان! کیا میرے نصیب میں الم کی کوئی انتہا نہیں؟

"اس نے ہمیں کیوں نہ بتایا؟"

Scanned with CamScanner

"اسے ہماری کوئی فکر نہیں ہے۔"

میں نے انگلی سے دکان کے چاروں کونوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"اس نے ہم سے اتنی وفا کی ہے جس کے ہم مستحق نہ تھے۔"

"اب وہ ہمیں بھول جانا چاہتا ہے۔"

"الہلالی سے پوچھتے..."

اس نے میری طرف ایسی حقارت سے دیکھا کہ میں نفرت سے کہہ اٹھی:

"تمھیں کوئی کام ٹھیک سے کرنا آتا ہی نہیں۔"

"میں تیرا سر پھاڑنا چاہتا ہوں!"

"تم پھر افیون کھانے لگے ہو؟"

"وہ تو آج کل صرف وزرا کھا سکتے ہیں۔" پھر اس نے آواز دھیمی کر کے کہا:

"الہلالی کو بھی کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں گیا۔"

میں نے بے تابی سے پوچھا:

"تم اس کے پاس گئے تھے؟"

"اُسے بھی کچھ نہیں معلوم..."

"یارب! کیا وہ مکان چھوڑ کر چلا گیا ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر کسی عورت کا قصہ ہو گا۔"

"تم جیسی عورت کی فکرِ سلیم میں یہی آسکتا ہے!"

"تم سے بات کرنا فضول ہے۔ تم اس کی پروا ہی کب کرتے ہو!"

الم سے مغلوب ہو کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

***

نیا لباس پہن کر اور شانوں پر ایک پرانی شال ڈال کر میں مایوسی کے عالم میں عباس کے

Scanned with CamScanner

فلیٹ پر گئی۔ وہاں میرا رنج اَور بڑھ گیا جب میں نے دروازہ کھلوا کر دربان سے پوچھا:

"تمھیں کچھ علم تو ہو گا کہ ہوا کیا تھا؟"

"بالکل نہیں۔"

مجھ میں تھیئٹر جانے کی ہمت نہیں۔ متذبذب قدموں سے واپس لوٹی۔ راستے میں سیّدی الشعرانی کے مزار پر رک کر میں نے اُن کی کرامات کی دعا مانگی۔ پھر اپنی قید خانے کی کوٹھری میں واپس لوٹی جہاں وہ مرد بے فکری سے ایک گابک کے ساتھ ہنسی مذاق میں مگن تھا۔ میں پست ہو کر بیٹھ رہی۔ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ چلا تھا۔ میں نے کہا:

"کچھ کرو... کیا تمھیں کچھ نہیں سُوجھتا؟"

"میں تمھیں قتل کرنا چاہتا ہوں... کسی دن قتل کر دوں گا۔"

"پروڈیوسر سے جا کر ملو..."

وہ بات کاٹ کر بولا:

"تم خود چلی جاؤ۔ اپنی کنیزوں پر اُس کی خاص عنایت ہوتی ہے۔"

"حق ہے کہ تیری ماں نے مجھ سے دشمنی کی۔ وہ مجھے آج بھی قبر سے اذیّت پہنچا رہی ہے۔ اس نے تجھے ایسا جانور بنایا۔"

"بالقیاس، تیرے مقابلے میں تو وہ ایک عفیفہ سیّدہ تھی!"

***

یہ تھیئٹر میرے عذاب اور میری محبت کا شاہد ہے۔ شاہد ہے کہ میں نے عصمت گنوائی اور کسی نے مدد کا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اس کے عالی شان گنبدوں میں نیکی اور خیر کے مکالمات گونجتے ہیں اور اس کی خشت گاہوں پر میرا لہو بہا ہے ـــــ میرے راز کا لہو، جو میرا گلا گھونٹ رہا تھا۔ میں پاگل ہو رہی تھی... پاگل... اُسے تو میری محبت کا علم تک نہ تھا۔ اس کے لیے کسی شے کی کچھ اہمیت نہ تھی۔ وہ تو شاید میرا نام بھی بھول چکا تھا۔

"تم مجھ سے ملنے سے گریز کر رہے ہو۔ اب میں برداشت نہیں کر سکتی... میں تم سے بات

کرنا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"کیا؟ کیا تم بھول چکے ہو؟ میں تو سب کچھ لٹا بیٹھی ہوں..."

"میں مبالغہ پسند نہیں کرتا۔ جو کچھ ہوا وہ اس قابل نہیں کہ تم اس پر فکرمند ہو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے کہا:

"نہیں... نہیں... اس تھیٹر میں جو کچھ ہوتا ہے اُسے سنجیدگی سے کبھی نہ لینا۔"

"لیکن میں؟ ... میرا کیا ہوگا؟ ... مجھے مت چھوڑو..."

"جو تم سمجھ رہی ہو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ سیدھی سادی بات ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اب اسے فراموش کر دو۔ محنت سے کام کرو، اپنے مستقبل کے لیے۔ بار بار مجھ سے اس بات کا تذکرہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

وہ سنگِ خارا کی طرح سخت تھا۔ میں اس سے اس قدر نفرت محسوس کر رہی تھی جتنی کبھی میں نے اس سے محبت کی تھی۔ مہجور... تنہا... عذاب جھیلتی ہوئی... کسی دن میری خالہ کو میرے راز کا علم ہو جائے گا۔ اس دنیا سے کیا توقع رکھنا جو اللہ سے ناواقف ہے!

***

سہ پہر کے بعد میں اداکاروں کے کافی ہاؤس میں داخل ہوئی۔ مجھے فواد شلبی نارجیل پیتا دکھائی دیا۔ میں فوراً اس کے پاس پہنچی۔ وہ مجھ سے ملنے کی ہرگز توقع نہیں کر رہا تھا۔ پھر بھی وہ میرے استقبال کو اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے کرسی پیش کی۔ اس نے کہا:

"مجھے تم سے ملنے آنا چاہیے تھا۔ سب مشاغل پر لعنت!"

اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے میں نے کہا:

"ہم سے ملنے کوئی بھی نہیں آیا۔ اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے! میں تو عباس کے غائب ہونے سے پریشان ہو کر آئی ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولا:

Scanned with CamScanner

"اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ صاف بات ہے کہ وہ طفیلیوں سے بچ کر بھاگا ہے۔ بے شک اب وہ دوسرے ڈرامے پر کام کر رہا ہو گا۔"

"لیکن ہمیں تو خبر کرتا۔"

"اس کی خطا معاف کرو۔ قلق مت کرو۔ تم اب بھی پہلے کی طرح حسین ہو، حلیمہ! کرم کا کیا حال ہے؟"

"زندہ ہے اور نوعِ انسان کی تباہی کے درپے ہے۔"

اس بات پر وہ یوں قہقہہ لگا کر ہنسا کہ میں بھنّا گئی اور کافی ہاؤس سے باہر نکل آئی۔ اب میں نے تھیٹر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ مجھ میں ہمت بھی آ گئی۔ میں نے پروڈیوسر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہی کمرہ... وہی چمڑے کا دیوان... وہی مرد... نہیں، مرد وہ نہیں رہا۔ بس اس کی بدچلنی باقی رہ گئی ہے۔ جیل نے ہمیں اتنا بوڑھا نہ کیا ہو گا جتنا اِس کی بے راہ روی نے اِسے کر دیا ہے۔ میرے آلام کے لیے ہم میں سے کون زیادہ ذمے دار ہے؟ ... وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا:

"اہلاً... اہلاً... چلو اچھا ہوا کہ تم خیریت سے ہو۔"

"خیریت سے؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جیسا کہ ایک کامیاب مصنف کی ماں کو ہونا چاہیے۔"

"فی الوقت وہی میرے عذاب کی وجہ ہے۔"

"یہ بے سبب پریشانی ہے۔ میرے پاس تمھارے لیے خوش خبری ہے۔ اس نے مجھے ٹیلی فون کیا تھا۔"

خوشی سے بے قرار ہو کر میں نے اس کی بات کاٹ دی:

"کہاں ہے وہ؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں۔ یہ اس کا راز ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ایک نئے ڈرامے پر کام کر رہا ہے۔"

"کیا اس نے ملازمت ترک کر دی؟"

"ہاں۔ اس میں خطرہ تو مول لینا پڑتا ہے۔ مگر اسے خود پر بھروسا ہے اور مجھے بھی اس کی

کامیابی کا یقین ہے۔"

"اس نے مجھ سے رابطہ کرنے کی زحمت نہیں کی۔"

"وہ اپنے نئے ڈرامے کے بارے میں سوالوں سے گریز کرنا چاہتا ہے ـــ میرا تو یہی خیال ہے۔"

"اس ڈرامے کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں... تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تھیٹر فن ہے۔ اور فن حقیقت سے جتنا بھی مستعار لے لے، بالآخر تصوراتی ہی ہوتا ہے۔"

"لیکن لوگوں کے قیاس...؟"

"لوگوں کو اس داستان کا کیا علم؟ ایسا تو سوچنا ہی بے بنیاد ہے۔ اگر طارق کی حماقت نہ ہوتی تو..."

میں نے بات کاٹ کر کہا:

"وہ تو عباس کا دشمن ہے، لعنت ہو اس پر..."

"بس اب خوش ہو جاؤ۔"

***

"سنا ہے کرم یونس تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں۔"

"پھر تو تمہاری بات بن جائے گی۔"

"نہیں۔ میں اس طرح کے کذب پر یقین نہیں رکھتی۔"

"اسے سب کچھ بتا دو گی؟"

"یہی راہِ راست ہے۔"

"تم ایک غیر معمولی لڑکی ہو! آج کل اصولوں پر کون چلتا ہے... تو کیا فاعل کا نام بھی بتا دو گی؟"

Scanned with CamScanner

"میرے خیال میں یہ بات اہم نہیں۔"

"بالکل درست کہتی ہو۔ یہی بہتر طریقہ ہے۔"

***

میں تھیٹر کے کیفے میں پہنچی۔ مجھے دیکھتے ہی عم احمد برجل نے پکار کر کہا:

"خوش آمدید، عزیزہ!"

میں اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ میرے لیے سینڈوچ اور چائے تیار کرنے لگا۔ ہم نے جتنی کچھ خوشی دیکھی ہے وہ انھیں دو لوگوں کے باعث ــــ عم احمد اور ام بانی۔ یادوں کے سیلاب نے مجھے آ لیا۔ چائے اور سینڈوچ اور رومان... ایک رقص کی دُھن جہنّم سے آتی ہوئی... غلاظت کے ڈھیر پر گرتے بارش کے قطروں کی طرح...

عم احمد نے کہا:

"عباس کی کامیابی اچھا شگون ہے۔ ماضی کے دُکھوں کا ازالہ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا:

"وہ ایک اچھا کلمہ کہے بغیر چلا گیا۔"

"قلق مت کرو۔ یہاں تو کسی کو قلق نہیں۔"

"اور طارق رمضان؟"

"وہ تو نیم مجنون ہے۔"

***

یہ میرے لیے ایک نیا اور ہولناک تجربہ تھا۔ میں نے اعتراف کرنے کا عزم کر لیا تھا، مگر خوف نے مجھے ایسا کرنے نہیں دیا ــــ آخری لمحے تک نہیں۔ میں شریف تھی، طاہرہ تھی... فریب سے نفرت کرتی تھی، مگر خوف نے میری زبان پکڑ لی تھی۔ کرم اس قدر محبت کرنے والا،

Scanned with CamScanner

مثالی نوجوان لگتا تھا۔ کہیں میں اسے کھو نہ بیٹھوں۔ میں خاموش رہ گئی تھی، حتیٰ کہ ہمارے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اپنی کمزوری پر میں ندامت سے گڑی جا رہی تھی۔ اس لمحے سچائی ہمارے سامنے ننگی کھڑی تھی۔

"میں مجرم ہوں... میں تجھے پہلے نہ بتا سکی..."

اس کی سنجیدہ نگاہوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ جس بات کا مجھے ڈر تھا وہی ہو رہی تھی۔ میں نے نگاہیں جھکا لیں۔

"میں تجھے کھو دینے کے خوف سے ہراساں تھی... میری بات کا یقین کر... میرے ساتھ زبردستی ہوئی تھی..."

میں نے نظریں فرش پر گاڑ دیں۔ میں نے کچھ کہا اور اس نے کچھ کہا۔ مگر الفاظ ہمارے کرب کی شدید حرارت میں کھوئے جا رہے تھے۔ اس کی آواز میرے شعور پر کندہ ہو گئی جب وہ بولا:

"ماضی کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں۔"

میں اور بھی روئی تھی، مگر مجھے ایک غیر متوقع امید کی کرن بھی نظر آ گئی تھی۔ میں نے کہا کہ میں ساری زندگی اس کی خوشی کے لیے وقف کر دوں گی۔ آنسو پونچھتے ہوئے میں نے کہا تھا:

"معصوموں کو لوٹنا کتنا سہل ہے!"

***

بھاری دل کے ساتھ میں قید خانے کی کوٹھری میں واپس پہنچی۔ میں اسے فواد شلبی سے ملاقات کے سوا کچھ نہیں بتاؤں گی۔ کیوں اسے تسکین پہنچاؤں؟ وہ عباس سے محبت نہیں کرتا۔ یوں ظاہر کر رہا ہے جیسے اسے دل چسپی ہی نہیں۔ اگر میری طرح دُکھ جھیلتا تب پتا چلتا۔ ہم جو کچھ بیچتے ہیں اس سے خریدنے والے اپنا دل بہلا لیتے ہیں، مگر ہمارے دل بہلانے کے لیے صرف گالی گلوچ کا تبادلہ ہے۔

***

Scanned with CamScanner

درجہ بہ درجہ میری مایوسی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ایک نئے شر نے گھر کی اساس ہلا ڈالی تھی۔

"افیون بہت خراب چیز ہے۔ یہ تمھیں تباہ کر دے گی۔"

"پھر بھی میں اس کے لیے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

"تم دنیا سے فرار حاصل کر رہے ہو۔ اور بڑی سُرعت سے!"

"اس کے لیے بھی اللہ کا شکر!"

"میں اپنی سی پوری کوشش کرتی ہوں... پھر عباس بھی ہے، تمھارا پیارا بیٹا۔"

وہ سیاہ چائے کا ایک اَور گھونٹ بھرتا ہے۔ میں کہتی ہوں:

"میری تنخواہ گھر چلانے کے لیے کافی نہیں۔"

"رمضان کے کمرے کا کرایہ بھی تو آتا ہے۔"

"وہ بھی کافی نہیں۔ مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔"

میں اب تمھیں سمجھ گئی ہوں، اور خوف زدہ ہوں۔ اوّل ایام میں میں نے جو تصور کیا تھا تم وہ نہیں ہو۔ تم ہر شے گنوا چکے ہو۔ حتیٰ کہ اپنی مردانہ قوت بھی، جس پر تمھیں بڑا ناز تھا۔ اب ہم جدا کمروں میں سوتے ہیں۔ ہمارے درمیان نہ محبت باقی رہی ہے نہ جنسی خواہش۔ یا عباس، بس تم ہی باقی بچے ہو... اپنے باپ کی باتوں پر دھیان مت دو... وہ مریض ہے، اس پر اعتبار مت کرو ... یہ احسن ہے کہ تم زیادہ تر تنہا رہتے ہو۔ اللہ تمھارے ساتھ ہے... اللہ کافی... تم فرشتہ ہو... اپنی کتابوں، مدرسے اور تھیٹر کو اپنا استاد بناؤ۔ تم میری اولاد ہو اور طیّب انسانوں کی اولاد ہو... تم اس ظلمت میں ڈوبے قدیم مکان کا واحد نور ہو... ہر شے میں واحد رہو...

***

وہ چوری چھپے مجھ پر نظر ڈالتا ہے کہ میں اسے سب کچھ بتا دوں گی۔ ہیہات! وہ اَور بھی مجھ سے نفرت کرے! وہ کہتا ہے:

"سردیاں آ رہی ہیں۔ اس کھلی دکان میں کیسے گزر ہو گی؟"

Scanned with CamScanner

میں وثوق سے کہتی ہوں:

"عباس کامیاب ہو جائے تو سب کچھ بدل جائے گا۔"

وہ تلخی سے کہتا ہے:

"جب عباس کامیاب ہو جائے!"

میں نے نفرت سے کہا:

"میں اُس کے ساتھ رہوں گی۔ تمھیں بھی وہ کوئی کمبل یا عبا دے دے گا۔"

***

احمریں کیفے ٹیریا ہمیشہ یکساں رہتا تھا ـــــ ہر تغیر پر خنداں، سب کی سنتا اور کسی پر یقین نہ کرتا۔ عم احمد برجل نے کہا تھا:

"یہ رہے تمھارے سینڈوچ۔ میں چائے تیار کرتا ہوں۔"

ایک جواں سال شخص میرے برابر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پھلیاں اور سینڈوچ طلب کیے تھے۔ وہ تھیٹر میں کام کرنے والوں میں سے تھا، مگر اداکار نہیں تھا۔ وہ پُرکشش نوجوان تھا، بس سر اور ناک ذرا بڑی تھی۔ عم احمد نے مجھ سے پوچھا تھا:

"آنسہ حلیمہ، کوئی فلیٹ ملا؟"

اجنبی کے سامنے میں نے تکلف سے کہا تھا:

"سونا تلاش کرنا زیادہ آسان ہو گا۔"

اس نوجوان نے اچانک پوچھا:

"کیا فلیٹ کی تلاش ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ عم احمد نے ہمارا تعارف کرایا۔

"کیا شادی کر رہی ہو؟" اس نے جرأت سے کہا تھا۔

آہ... رومان کی ابتدا ہو رہی ہے! اس تھیٹر میں کس سرعت سے اس کا آغاز ہوتا ہے، اور تشدد تک پہنچنے سے قبل ختم نہیں ہوتا... شکار کا قتل، بانسری کی دُھن کے ساتھ...

Scanned with CamScanner

"میرے پاس ایک قدیم مکان ہے۔ اس کی دو منزلیں ہیں۔"

"کیا فلیٹ ہیں؟"

"نہیں۔ مکان کو فلیٹوں میں تقسیم نہیں کیا گیا۔"

عم احمد نے پوچھا تھا کہ کیا ایک منزل پر میں رہ سکتی ہوں۔ اس نے اثبات میں جواب دیا تھا۔ میں نے پوچھا تھا:

"آپ کو اور آپ کے خاندان کو تکلیف تو نہ ہو گی؟"

اس نے جرأت سے اعلان کیا تھا:

"میں وہاں اکیلا رہتا ہوں۔"

جب اس جسارت پر میں نے غصے سے منہ پھیرا تو اس نے عیاری سے کہا تھا:

"آپ اپنے خاندان کے ساتھ وہاں بالکل محفوظ رہیں گی۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ پر بُرا تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ ... وہ چاہتا کیا ہے؟ اسے میرے المیے کے بارے میں کیا علم؟ میری محبت... انسان ذات پر میری گہری بے اعتباری...

***

میں نے کہا کہ میں محلہ اللام میں امّ بانی کے چھوٹے سے فلیٹ کی طرف جا رہی ہوں جہاں طارق رمضان بھی ٹھہرا ہوا ہے۔ ام بانی نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا مگر مجھے طارق کے اٹھنے تک انتظار کرنا پڑا۔ وہ اپنے کمرے سے نکلا تو اس کے سر کے بال مثل شیطان کھڑے ہوئے تھے۔

اس نے بھونڈے تمسخر سے طنزیہ کہا:

"خوش آمدید، عزیزہ!"

میں نے فوراً اپنے مطلب کی بات پوچھی:

"تم عباس کے پاس گئے تھے؟"

"ہاں۔"

Scanned with CamScanner

"یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تم نے ایسی باتیں کیں کہ عباس چلا گیا۔"

وہ حقارت سے بولا:

"پھنس گیا تھا تو بھاگ گیا!"

اس کے توہین آمیز انداز کے باعث میری آنکھوں میں غیظ سے آنسو آ گئے۔ ام بانی نے چیخ کر کہا:

"کیا تمہارے قلب میں ذرا رحم نہیں؟ یہ کیا باتیں کر رہے ہو؟ تمیہ کی وفات کی میں شاہد ہوں... میں نے خود دیکھا کہ عباس حُزن سے جنونی ہو گیا تھا۔"

اس کی بات سن کر میں چونک پڑی۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ آیا حقیقت ان افواہوں کے مطابق ہے جو پھیلائی جا رہی ہیں۔

"تو کیا تم متفق ہو کہ یہ باتیں غلط ہیں؟"

"سب بکواس ہے!" ام بانی نے کہا۔

"تو کیا وہ تمہارے سامنے اس کو قتل کرتا؟ ... احمق!" طارق نے کہا۔

"عباس کو قاتل تصور کرنا ہی حماقت ہے!"

"تھیٹر میں ہر رات اس کا اعتراف دکھایا جا رہا ہے۔"

ام بانی نے کہا:

"اس ڈرامے کے طفیل تمہیں اسماعیل سے بڑھ کر داد مل رہی ہے۔"

"جرُم کے طفیل... جرُم کے... جس کی وجہ سے وہ فرار ہوا۔"

میں نے اصرار سے کہا:

"وہ کسی دوسرے مکان میں مقیم ہے اور نئے ڈرامے پر کام کر رہا ہے۔"

وہ تمسخر سے قہقہہ لگا کر بولا:

"نئے ڈرامے پر! کیوں خود کو فریب دیتی ہو یا ام عباس!"

***

Scanned with CamScanner

آہ! اُس زمانے میں وہ ہر بات کے باوجود معقول اور مقبول ہوتا تھا۔

"تمھاری کیا رائے ہے حلیمہ؟ طارق رمضان ہمارا ایک کمرہ کرائے پر لینا چاہتا ہے۔"

میں نے احتجاج کیا تھا۔

"نہیں... نہیں... وہ جہاں رہتا ہے وہیں رہے!"

"امّ بانی سے اس کی لڑائی ہو گئی ہے۔ وہ گھر اس نے چھوڑ دیا ہے اور اب بے گھر پھر رہا ہے... اور مہنگائی روز بہ روز بڑھ رہی ہے۔"

"گھر میں اجنبی کو رکھنا خوشگوار نہ ہو گا۔"

"اُسے کمرے کی حاجت ہے، اور ہمیں نقدی کی حاجت ہے۔"

"وہ کسی اُٹھائی گیرے سے بہتر نہیں ہے۔"

"اسے امید تھی کہ ہم کرم کریں گے۔ خصوصاً تم۔ ہمارے پاس اتنے خالی کمرے ہیں کہ ایک فوج ٹھہرائی جا سکتی ہے۔"

میں نے بددلی سے رضامندی دے دی تھی۔ میرے نزدیک وہ کسی کام کا نہ تھا ـــــ ایک ناکام اداکار، جو عورتوں کی خون پسینے کی کمائی کھاتا تھا۔ لیکن میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ یہ کرے گا۔

***

میرے امّ بانی کے گھر جانے کے دوسرے دن وہ اچانک ہماری دکان پر آ پہنچی۔ وہ اپنے مرد کی بدسلوکی کی معافی مانگنے آئی تھی۔ طارق کی طرح وہ بھی پچاس سے اوپر کی ہے مگر اب بھی حسین ہے اور اس کی مالی حالت ٹھیک ہے۔ اس نے کہا:

"تھیٹر میں ڈرامے کی کامیابی پر ہر شخص رشک کر رہا ہے۔ اس سے پہلے ایسی کامرانی کسی کو نہیں ملی۔"

میں نے اداسی سے کہا:

"مگر مصنف روپوش ہے۔"

Scanned with CamScanner

امّ بانی نے کہا، "نیا ڈرامہ مکمل کر لے تو ظاہر ہو جائے گا۔" پھر اس نے کہا:
"جو باتیں کی جا رہی ہیں بالکل غلط ہیں۔ خرافات۔ ... لیکن طارق مجنون ہے..."
کرم نے طنز کیا:
"وہ اپنی ماں کو قتل کر دیتا تو بہتر نہ ہوتا؟"
مجھے امّ بانی ہمیشہ پسند رہی۔ اس سے بھی فرق نہ پڑا کہ وہ میرے شوہر کی رشتے دار ہے۔

***

طمبکشیہ میں وہ لوگوں سے بھرا گھر... ربڑ کی بُو اس میں یوں بھری ہوئی تھی جیسے وہ کوئی سڑک ہو۔ عم احمد برجل کو بٹھانے کے لیے میری خالہ نے ایک گوشہ صاف کیا اور کہا:
"خوردنی اشیا کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ بعد اللہ کے انھیں کا بھروسا ہے۔"
اس نے غیر معمولی اہتمام سے کہا تھا:
"میں اس سے زیادہ اہم بات کے لیے آیا ہوں۔"
"تو پھر سپیرے، پٹاری کھول!"
"بات حلیمہ کے بارے میں ہے۔"
خالہ نے اُس کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف۔ میرے رخساروں پر خون دوڑ گیا۔ اس نے پوچھا:
"کیا؟ ... دُولھا؟"
"صحیح اندازہ لگایا۔"
اس نے عم احمد برجل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا:
"کرم یونس۔"
میری خالہ نے کہا:
"کرم یونس کون ہے؟"
"تھیٹر میں پرامپٹر ہے۔"

Scanned with CamScanner

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"تھیسٹر کا باعزت ملازم ہے۔"

"کیا وہ شادی کے لائق ہے، یا عم احمد؟"

"میرا تو یہی خیال ہے۔ مگر دُلھن کی راے جاننا بھی تو ضروری ہے۔"

"دلھن تو نہایت حسین ہے۔ مگر ہم فقیر ہیں، یا عم احمد۔"

اب میری بولنے کی باری تھی۔ میں اپنے خونیں راز کے بوجھ سے چُور تھی۔ دُولھا سے مجھے اُلفت نہیں تو نفرت بھی نہیں تھی۔ اچھا خوش شکل جوان تھا۔ شاید وہ مجھے ذہنی سکون دے سکے... کون جانے مسرّت بھی دے سکے۔ خالہ کی نظروں کے محاصرے میں مَیں نے رک رک کر کہا کہ میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔

"ملازم ہے، ملکیت والا ہے، اور طبّب شہرت رکھتا ہے۔"

خالہ نے کہا، "علی خیرہ اللہ۔"

وہ مجھ سے محبت تو کرتی تھی مگر مجھ سے خلاصی پا کر خوش بھی ہوتی۔ میں اس تنگ فلیٹ سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ سرحان الہلالی جیسے حرام زادے سے تو کچھ امید نہ تھی۔

***

"زندگی دشوار ہو گئی ہے۔ فاقہ دروازے پر دستک دے رہا ہے۔"

اس نے مجھے حقارت سے دیکھ کر کہا:

"تمھاری خرافات بند کرنے کی ایک ترکیب مل گئی ہے۔"

"کیا اس جنسی افیون کی عادت کا علاج ہو گیا؟"

"الہلالی ہمارے گھر میں محفلیں برپا کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔"

میں اس کی بات نہیں سمجھی۔ اس نے اضافہ کیا:

"ہم ایک کمرہ ان کے تاش کھیلنے کے لیے تیار کر دیں گے۔ بس رزق ہمارے ساتھ سخی ہو جائے گا۔"

Scanned with CamScanner

میں نے ملال سے کہا:

"گھر میں قمار خانہ بناؤ گے؟"

"ہر چیز کا بد ترین طریقے سے ذکر کرتی ہو۔ بس کچھ دوست اکٹھے ہو جائیں گے۔ اور کیا ہو گا؟"

"لیکن..."

اس نے بات قطع کر کے کہا:

"تم اچھی زندگی گزارنا نہیں چاہتیں؟"

"اور صاف ستھری بھی!"

"اچھی ہو گی تو صاف ستھری بھی ہو جائے گی... غلاظت تو صرف منافقت میں ہے۔"

میں مارے قلق کے آہستہ سے بولی:

"اور عباس کا بھی سوچنا ہے۔"

اس نے غیظ سے جواب دیا:

"اس گھر کا مالک میں ہوں، عباس نہیں... تمہارا بیٹا مجنون ہے! ...مگر یہ تو تم بھی چاہتی ہو گی کہ اُسے پیٹ بھر کھانا اور کپڑے ملیں..."

***

بادلوں کی کثرت سے خریف میں سورج اس طرح بار بار چھپ جاتا ہے کہ میرا دل بھاری رہتا ہے۔ ہر روز کم از کم ایک جنازہ سیدی الشعرانی کے مزار والی سڑک پر جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ مرد جب گاہکوں سے بات نہ کرتا ہو تو خود کلامی کرنے لگتا ہے۔ میں تو عباس کی خوش سلوکی کے خواب دیکھتی ہوں، مگر اس کے پاس خواب دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔

***

Scanned with CamScanner

ہم مسرّت کے لمحات کو کیوں یاد نہیں رکھتے کہ بعد میں ان کی صداقت کا یقین کر سکیں؟ کیا یہ وہی مرد ہے؟ کیا وہ پُرخلوص تھا جب اس نے کہا تھا:

"میں عم احمد کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے اتنی مسرّت دی جو کوئی بشر مشکل سے برداشت کر سکے۔"

میں نے ناز سے سر کو جنبش دے کر کہا تھا، "مبالغہ مت کرو۔"

اس نے ایسی آواز میں جو اَب ہمیشہ کے لیے غائب ہو چکی ہے، کہا تھا:

"حلیمہ... اس شخص کی خوشی کا کیا عالم ہو گا جس کا دل عبث نہ دھڑکا ہو..."

میں اُس سے محبت نہیں کرتی تھی مگر اس کی باتوں سے محبت کرنے لگی تھی۔ ان کی جذبے کی شدّت مجھے گرما دیتی تھی۔

***

مقررہ دن آ پہنچا... میرے قلب میں فرحت اور خوف کی امواج... میں ہندی حمّام میں گئی تھی۔ ام بانی نے مجھے لباس، کوٹ اور جوتے فراہم کر دیے تھے۔ میں ہیر ڈریسر کے پاس سے مدّت سے نظر انداز کیے بال جدید انداز میں سنوار کر واپس آئی تھی۔ مرد نے حقارت سے مجھے دیکھ کر کہا تھا:

"ابھی رنڈی پن کی رگ دبی نہیں! ... فقر و فاقہ کے اس زمانے میں تم اس کا استعمال کیوں نہیں کرتیں؟"

میں نے اُس رات کا سکون کسی بھی قیمت پر غارت نہ کرنے کا مصمّم ارادہ کر رکھا تھا۔ ہم تھیٹر پہنچے تو ہمارا شایانِ شان احترام کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ الہلالی کی ستائش بھری نظریں مجھ پر جم گئیں۔ میں نے کہا:

"مگر مصنف کہاں ہے؟"

"وہ نہیں آیا۔ مگر اس کے بارے میں مَیں نے تمھیں کافی بتا دیا ہے۔"

میری اوّلیں امیدیں خاک میں مل گئیں۔ تجدیدِ شباب کی باطنی شعاع اچانک بجھ گئی۔ ہم عم

احمد برجل سے ملنے چلے گئے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ہمیں چائے اور سینڈوچ دیے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا:

"ایامِ ماضی کی طرح..."

اے عم احمد، یہ کیا کہتا ہے! ماضی کاش کبھی ظہور پذیر نہ ہوا ہوتا۔ اس کا واحد نیک ثمر تک غائب ہے۔ یہ جگہ میرے اعصاب کو جھنجھنا دیتی ہے اور میرے حزن میں اضافہ کر دیتی ہے۔ مناسب وقت پر ہم ہال میں داخل ہوئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا دیکھ کر خوشی میں میرے منہ سے نکلا:

"ڈراما کامیاب ہے!"

میں نے اس کا جواب نہیں سنا۔ پردہ اُسی پرانے گھر پر اٹھ رہا ہے۔ واقعات تواتر کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں۔ میری حیات کا ہر عذاب میری آنکھوں کے سامنے ہے ـــ کچھ بھی نہیں چھوڑا گیا، سوائے آہوں کی یاد کے۔ ایک بار پھر میں جہنم میں ہوں۔ ہر بار سے کہیں بڑھ کر خود کو ملزم ٹھہرا رہی ہوں... خود سے کہہ رہی ہوں کہ اس وقت مجھے اس کو چھوڑ دینا چاہیے تھا... اس موقعے پر مجھے انکار کر دینا چاہیے تھا... آہ! ... تو میں محض اس کی شکار نہیں ہوں جیسا کہ سمجھتی آئی ہوں... لیکن یہ جرائم کا کیسا طوفان ہے جس سے کوئی آشنا نہ تھا؟ یہ مجھے کس عجیب صورت میں پیش کیا جا رہا ہے؟ ... کیا اس کی میرے بارے میں سچ مچ یہی رائے ہے؟ ... یہ کیا ہے اے میرے بیٹے؟ تُو نے تو باپ سے بڑھ کر اپنی ماں کو غلط سمجھا... اور اس سے بڑھ کر ظلم کر رہا ہے ... کیا میں انانیت اور خودغرضی کے باعث تیری تحیہ سے شادی پر معترض تھی؟ کیسی انانیت... کیسا حسد؟ نہیں... نہیں... یہ فی نفسہ جہنم ہے۔ تو نے اپنے باپ کو تقریباً میری زیادتی کا شکار ظاہر کیا ہے...وہ خود اپنی ماں کے سوا کسی کی زیادتی کا شکار نہیں ہوا... کیا تُو نے مجھے رنڈی سمجھا؟ نایکہ تصور کیا؟ کیا تو نے خیال کیا کہ میں نایکہ بن کر نقدی کی طمع میں تیری زوج کو سیّاح کے پاس لے گئی؟ یہ تیرا تخیل ہے کہ جہنم ہے؟ یا عباس، تُو نے مجھے قتل کر دیا... تو نے اپنے ڈرامے میں مجھے کردارِ شر بنا دیا... لوگ تالیاں بجا رہے ہیں... لوگ تالیاں بجا رہے ہیں...

میں تمام میّت ہوں۔ کیفے میں محفل بپا ہے۔ مرد مجھ سے پوچھتا ہے:

"کیا ہم بھی شریک ہوں؟"

یہ محسوس کر کے کہ وہ مجھے مشتعل کرنے کی، میرا تمسخر اڑانے کی کوشش کر رہا ہے، میں

Scanned with CamScanner

نے نفرت سے جواب دیا:

"کیوں نہ شریک ہوں؟"

لیکن در حقیقت میں شریک نہیں ہو سکی۔ مجھ پر سکتہ طاری ہے اور بخار سا چڑھا ہوا ہے۔ کانوں میں آوازوں کا تلاطم ہے... اجنبی شکلیں بلاوجہ قہقہے لگاتی، موجوں کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی ہیں۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ یہ قیامت کا دن ہے۔ آنے دو قیامت کو... قیامت آنے دو! اللہ کے سوا میرے ساتھ کوئی حاکم عدل نہیں کرے گا۔ تُو نے قتل کیا، خیانت کی، اور خود کشی کر لی۔ میں تجھے کب دیکھوں گی؟ کیا میں تجھے اب کبھی نہ دیکھوں گی؟

ہم فجر کے قریب بیت القدیم میں پہنچے۔ میں دیوان پر گر پڑی۔ وہ آتش دان روشن کرنے لگا۔ میں نے سنا کہ پوچھ رہا ہے:

"ڈراما پسند آیا؟"

میں نے سرد مہری سے کہا:

"دیکھنے والوں کو پسند آیا..."

"اور موضوع؟"

"موضوع جاندار تھا!"

"ہم جیسے ہیں ویسا ہی نہیں پیش کیا؟"

"نفرت کرنے والے طارق رمضان کی طرح مت سوچو۔"

"ہر شے حقیقت سے بڑھ کر حقیقی تھی۔"

میں نے غیظ سے کہا:

"ڈرامے میں مجھے جیسا دکھایا گیا اس کا حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں۔"

وہ کریہہ ہنسی ہنسا۔ میں نے اپنے عذاب کو دباتے ہوئے کہا:

"یہ تخیلاتی کہانی ہے۔"

"ہر کردار اصل زندگی کے مطابق..."

"جدت یہی ہے کہ تخیل کثرت سے ہوتا ہے اور واقعہ محض تھوڑا سا۔"

"پھر تمھیں اس طرح کیوں پیش کیا؟"

Scanned with CamScanner

"مصنف آخر ہماری اولاد ہے۔"

"میرا خیال تھا وہ تم سے محبت کرتا ہے... تمہارا احترام کرتا ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے!"

"مگر تمہاری تلملاتی نظریں تو کچھ اور کہہ رہی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں کہ میں صحیح کہہ رہی ہوں۔"

"... حتیٰ کہ طارق کے ساتھ بھی! سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر گر جاؤ گی!"

میں نے غصے میں کہا:

"ایسے منحوس خیالات کو اپنے پاس رکھو۔"

"اس ولد نے ہمیں جیل تک پہنچایا۔"

"اس نے اپنے آپ کو نہیں، تجھے پیش کیا ہے۔"

"خود کیسا مثالی بنتا تھا..."

قلبی یاس سے مغلوب ہوتے ہوئے میں نے کہا:

"وہ واپس آجائے تو اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

میں بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ دروازہ بند کیا اور زاروقطار رونے لگی ... تو نے اپنی ماں کو کیوں نہیں جانا، اے عباس...؟

***

وہ سیڑھیوں سے نشے میں لڑکھڑاتا ہوا اُترا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا:

"کولون ہو گا؟ مجھے چوٹ لگ گئی ہے۔"

میں کمرے میں گئی کہ کولون لاؤں۔ میں نے کہا، "یہ رہا۔"

"شکریہ۔ میں پینے میں تجاوز کر گیا۔"

"اور آج شام سے تقدیر نے بھی ساتھ نہیں دیا۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا اور میری طرف دیکھا۔ اس نے دروازے کی کنڈی لگا

Scanned with CamScanner

دی۔ میں مدافعت کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا:

"حلیمہ... تم کتنی حسین ہو..." وہ میرے نزدیک آ گیا۔ "چلو اوپر چلیں..."

میں غیظ و غضب سے تیوریاں چڑھا کر پیچھے ہٹی۔ اس نے کہا:

"کیا تُو اس حیوان سے وفادار رہنا چاہتی ہے؟"

"میں ایک شریف عورت ہوں، اور ایک ماں ہوں۔"

میں نے لپک کر دروازہ کھول دیا تھا۔ لمحہ بھر کے تردّد کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا اور گھر سے بھی چلا گیا تھا۔

***

ان میں سے کئی ایک نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی مگر منہ کی کھائی تھی۔ رنڈی؟ یہ سچ ہے کہ ایک مرتبہ میرے ساتھ زنا کیا گیا تھا... اور میں تمہارے باپ کے ساتھ سوئی... گو زیادہ عرصے نہیں۔ اس کے بعد میری زندگی اور یہ تجرّد... میں رنڈی نہیں راہبہ ہوں میرے بیٹے! کیا میری یہ کاذِب تصویر تیرے باپ نے کھینچی تھی؟ مجھ سی بد نصیب، محروم عورت کی؟ تُو کیوں کر ایسا تصور کر سکا؟ میں تجھے ہر بات بتاؤں گی۔ مگر تُو واپس کب لوٹے گا؟

***

ہر رات وہ رنگ رلیاں منانے اس بیت القدیم میں آ جاتے تھے۔ ان کے افعال سے سیّدی الشعرانی کے مزار کی سمت جانے والی راہ ناپاک ہو رہی تھی۔ ان کی فاجر نگاہوں کو پڑھ کر میرا دل ڈوب جاتا اور عباس کے لیے فکرمند ہو جاتی جو اپنے کمرے میں موجود ہوتا تھا۔ مگر تُو تو ہیرا ہے میرے بیٹے! فقر کی دلدل میں تجھے کیوں کر رکھوں؟ میں اُن کے سامنے خوش دلی کا تصنّع کرتی اور انھیں قرض کی رقم سے آراستہ کیے ہوئے کمرے میں لے جاتی۔ میرا کام ان کی شراب و طعام کے لیے ساقی گری تھا، اور میں جانتی تھی کہ یہ زوال کے پھسلواں راستے پر ہمارے پہلے قدم ہیں۔

Scanned with CamScanner

"میرے بیٹے، فکر نہ کر۔ یہ تیرے باپ کے دوست ہیں۔ کُل مردوں کے یہی افعال ہیں۔"

"لیکن امّی، تمہارا وہاں کیا کام؟"

"وہ میرے تھیٹر کے دوست ہیں۔ انھیں نظر انداز کرنا میرے لیے مناسب نہیں..."

"مکان نہایت طیّب اور مامون ہے،" سرحان الہلالی نے میز کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا جہاں اسماعیل پتّے پھینٹ رہا تھا۔ فواد ہنس کر بولا:

"طارق اور تحیہ کا ساتھ بیٹھنا ممنوع ہے..."

کرم کھانے کی میز کے پاس نقدی کے صندوقچے کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ طارق نے ہنستے ہوئے کہا:

"نذر کا صندوق، یا سیّدی کرم یونس..."

سرحان مذاقاً کہتا ہے:

"معرکے کی صوت سے بلند کوئی صوت نہ ہو!" *

کرم سیاہ چائے میں افیون گھول رہا ہے۔ آہ وہ ابتدا... جس کی کوئی انتہا نہ تھی!

***

میں اپنی کال کوٹھری میں لوٹ آئی ہوں، جیسے ہی میں نے وہ لباس اس کی مالکہ کو لوٹا دیا ہے جسے پہن کر تھیٹر گئی تھی۔ وہ بیٹھا ہے... صورت پر مُردنی طاری کیے... خالی خالی چہرہ لیے... مونگ پھلیاں اور تربوز کے بیج بیچتا رہتا ہے، اور زمانے کی شکایت میں ہر گاہک کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ میں چپکے چپکے تقریباً خود کلامی کرتی ہوں:

"ڈراما کامیاب رہا، بس یہ اچھی بات ہے۔:

وہ کہتا ہے:

"کم از کم ایک ہفتے سے پہلے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"دیکھنے والوں کا ردِ عمل ہر شے پر حاوی ہے..."

"الہلالی نے اُسے معاوضہ کتنا دیا ہوگا؟"

Scanned with CamScanner

"پہلی تحریر کا معاوضہ سب سے کم ملتا ہے... عباس مادّی چیزوں سے بے نیاز ہے..."
اس پر وہ تمسخر سے قہقہہ مار کر ہنستا ہے۔ میں اس پر لعنت بھیجتی ہوں۔

***

حجرۂ تخت کی وسعت میں شر کا دیوتا متمکن ہے اور مسکراتے ہوئے ہم پر نظر ڈالتا ہے۔
"خوش آمدید حلیمہ! تو تمہارے بیٹے نے نیا ڈراما لکھا ہے؟"
"ہاں۔"
اس نے عباس سے مخاطب ہو کر کہا:
"پہلا تو قطعی بے کار تھا۔"
عباس نے جواب دیا:
"آپ کا تبصرہ میرے لیے ہمیشہ سودمند ہوتا ہے۔"
"تمہاری والدہ کی خاطر میں ہمیشہ تمہاری ہمت افزائی کروں گا۔"

***

ہفتہ اختتام تک پہنچا تو عیاں ہو گیا کہ ڈراما کس درجہ کامیاب ہے۔ اس سے قبل تھیٹر کے ٹکٹ اس طرح کبھی فروخت نہیں ہوئے تھے۔ اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ مصنف کب ظاہر ہو گا؟ ... اس کی میرے بارے میں جو بھی رائے ہو۔ میں سب آلام برداشت کر لوں گی... مگر وہ ہے کہاں؟ میں مرد کو سنانے کے لیے زور سے کہتی ہوں:
"بے شک تھیٹر والوں کو علم ہو گیا ہو گا کہ ہمارا غائب ہونے والا کہاں ہے۔"
"آخری بار میں ایک عشرہ پہلے تھیٹر گیا تھا۔"
میں اس سے کسی شے کی طالب نہیں اور اس کی زبان کے حملے سے خائف ہوں۔ وہ اکثر تھیٹر جایا کرتا ہے، جبکہ افتتاحی رات کے بعد میری وہاں جانے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔

Scanned with CamScanner

دوسری صبح وہ دوبارہ گیا۔ وہ خوشگوار گرم دن تھا۔ سورج چمک رہا تھا اور میرا دل امید سے لرز رہا تھا۔

***

میں کچھ بھی عجیب و غریب تصور کر سکتی تھی مگر تحیہ سے عباس کی شادی کا نہیں... اب عباس چلا جائے گا اور طارق میرے گھر میں مقیم رہے گا۔ اے اللہ تیرا انصاف کہاں ہے!

"عباس! یہ تجھ سے دس سال عمر میں بڑی ہے... اس کی سیرت کی ایک تاریخ ہے۔ کیا تم اس کا مطلب نہیں سمجھتے؟"

وہ متبسم ہو کر طمانیت سے بولا تھا:

"افسوس کہ آپ محبت کے معنی نہیں سمجھتیں۔"

باطنی تلخی میری روح میں بھر آئی تھی اور مجھے ساری مدفون مسرتیں یاد آ گئی تھیں۔ اس نے مزید کہا تھا:

"ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔"

"انسان اپنے ماضی سے نجات نہیں پا سکتا۔"

"ہر چیز کے باوجود تحیہ طاہرہ ہے۔"

میں انصاف نہیں کر رہی تھی۔ میں اپنے بارے میں بھول رہی تھی۔ مگر میری خواہش تھی کہ عباس کو بہتر زندگی ملے۔ بس یہی کلُ معاملہ تھا۔ تحیہ میرے پاس آئی تھی۔ اس کے چہرے پر حُزن تھا، مگر عزم بھی۔ اس نے مجھ سے التجا کی تھی:

"میری خوشی کی راہ میں نہ آئیے۔"

میں نے حدّت سے کہا تھا:

"تُو معصومیت کا سرقہ کر رہی ہے۔"

"میں اس کی وفاشعار بیوی بنوں گی۔"

"تُو؟"

Scanned with CamScanner

میرے لہجے کی تیزی کے باعث غصے سے اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر کہا تھا:

"تھیٹر میں ہر عورت کی ابتدا سرحان الہلالی ہی سے ہوئی ہے۔"

میرا دل ڈوب گیا تھا۔ تو سب لوگ جانتے ہیں؟ یا ظاہر کرتے ہیں کہ جانتے ہیں؟ لگتا تھا جیسے وہ مجھے دھمکی دے رہی ہو۔

بہت خوب! لیکن ہر شے کے باوجود، بیٹا تو وہ میرا ہی رہے گا۔

***

یہ مرد آخر آج اتنی دیر کیوں لگا رہا ہے؟

اس تنگ گلی کی دیواروں سے سورج کی آخری شعاعیں رخصت ہو رہی ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟ کیا اسے اُس مکان کا پتا چل گیا جہاں عباس روپوش ہے، اور وہ وہاں چلا گیا؟ کیا وہ دونوں ساتھ واپس آئیں گے؟ میں اُس کے مہذب اور وجیہہ چہرے کا تصور کر سکتی ہوں جب وہ مجھ سے معذرت کرے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ میرا یہ عذاب ابدی ہو۔ اس ڈرامے نے میری کمزوریوں کی جانب اشارہ ضرور کیا ہے مگر میں نے اپنے قلب کو ہمیشہ مصفا رکھا ہے۔ کیا میں نے اپنی کمزوریوں کا کافی کفارہ ادا نہیں کر دیا؟ کون تصور کر سکتا تھا کہ طاہرہ اور حسین حلیمہ ایسی زندگی بسر کرے گی؟ میرے دل میں اب محبت اور برداشت کے سوا کچھ نہیں۔ یارب! میں تیری قضاوت قبول کرتی ہوں۔ حتی کہ کرم کی ابتلا میں اس تک کی مغفرت کرتی ہوں۔ میں اس کے وحشیانہ سلوک کی مغفرت کرتی ہوں۔ جب وہ میرے روپوش حبیب کا بازو تھامے ہوئے آئے گا تو میں ہر بات معاف کر دوں گی۔ میرا قلب عجیب مسرت سے منور ہو گیا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت مدھم پڑتی گئی۔ ایک گاہک نے سودے کا لفافہ لے جاتے ہوئے کہا:

"تم کسی دوسری دنیا میں ہو، یا امّ عباس..."

مسجد سے عصر کی اذان بلند ہوئی اور خریف کا مختصر دن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ یہ تاخیر بلاسبب نہیں ہو سکتی۔ وہ اس انتظار کے لائق نہیں، لیکن آخر اب تک کیوں نہیں لوٹا؟ سرد ہوا

میں شمع بھڑکی اور میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب دوبارہ بیٹھنے کا ارادہ نہ تھا۔ میرا قلب متغیر ہو چکا تھا۔ اس نے بے رحمی کے ساتھ مجھے دھوکا دیا ہے۔ اب صبر نہیں ہوتا... میں اسے تلاش کرنے جاؤں گی... تھیٹر کے دروازے کے قریب سب سے پہلے فواد شلبی دکھائی دیا۔ اس نے غیر معمولی نرمی سے میرا استقبال کیا اور کہنے لگا:

"خدا کرے یہ خبر جھوٹی ہو..."

میری امید کی آخری کرن معدوم ہو گئی۔

"کیسی خبر؟"

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ خاموش رہا۔ اس پر میں نے کہا:

"کیا عباس کے متعلق؟"

اس نے خاموشی سے سر ہلا دیا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ کیفے ٹیریا کے دیوان پر لیٹی ہوں۔ عم احمد برجل میری تیمارداری کر رہا تھا۔ فواد شلبی اور طارق رمضان بھی موجود تھے۔ عم احمد نے مجھے پوری خبر مجھے ماتمی آواز میں سنائی اور اس جملے پر اختتام کیا:

"مگر اس بات کا کسی کو یقین نہیں آرہا..."

فواد اپنی کار میں مجھے گھر چھوڑنے آیا۔ راستے میں وہ سوچتے سوچتے بولا:

"اگر اس نے خود کشی کی ہے تو لاش کہاں ہے؟"

میں نے سوال کیا:

"تو پھر اس نے وہ خط کیوں لکھا؟"

اس نے جواب دیا:

"یہ اس کا راز ہے... وقت آنے پر ہمیں معلوم ہو جائے گا۔"

مگر میں جانتی ہوں... میرا دل جانتا ہے... عباس نے خود کشی کر لی ہے، اور شہر بانسری پر ایک دُھن بجا رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

عباس کرم یونس

بیت القدیم میری اوّل عمر کا واحد رفیق تھا۔ یہ مجھے پورے کا پورا حفظ تھا۔ اس کی وسیع قوس دار چوکھٹیں، چھوٹے قبضوں والا سرخ، سبز اور کتھئی روغن کاری کے شیشوں والا دروازہ، بیٹھک کی آہنی سلاخوں والی کھڑکی، اوپر اور نیچے کی منزلوں کے کمروں کی اونچی چھتیں اور ان میں لگے روغن کیے ہوئے چوبی شہتیر، اور معصرانی سِلوں والے فرش، پرانے صوفے، گدّے، چٹائیاں اور قالین۔ اور چوہوں اور لال بیگوں کی فوجیں، اور چھپکلیاں۔ چھت پر دھلائی کے کپڑے ٹانگنے کے لیے ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے تار جیسے ٹرام کے لیے سڑکوں پر لگے ہوتے ہیں۔ وہاں سے دوسری چھتیں نظر آتی تھیں جن پر عورتیں اور بچے ہوتے تھے۔ میں اس گھر میں اکیلا پھرا کرتا تھا، اپنا سبق یاد کرتا ہوا، کوئی شعر پڑھتا ہوا، یا تھیٹر کا کوئی مکالمہ دُہراتا ہوا... اس گھر کے درودیوار میں میری اکیلی آواز گونجتی رہتی۔ میں پہروں چھت سے نیچے تنگ گلی میں خلق کو گزرتے دیکھا کرتا۔ میرا دل کسی رفیق کی حسرت کرتا تھا۔ کوئی لڑکا پکارتا:

"نیچے اترو۔"

میں جواب دیتا:

"دروازہ مقفل ہے، اور چابی ابی کے پاس..."

مجھے دن رات تنہا رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ میں ذرا بھی خوف نہ کھاتا تھا، شیاطین سے بھی نہیں۔

ابی تمسخر سے کہتے:

"ابن آدم سے بڑھ کر کوئی شیطان نہیں۔"

امّی جلدی سے اضافہ کرتیں:

Scanned with CamScanner

"تم فرشتے بننا..."

فراغت میں مَیں چوہوں یا چھپکلیوں کا تعاقب کیا کرتا۔

ایک دن امّی نے بتایا تھا:

"تم چھوٹے تھے تو ہم تمھیں چمڑے کے گھوارے میں لٹا کر تھیئٹر لے جایا کرتے تھے اور ٹکٹ گھر کے پاس ایک لکڑی کی بنچ پر بٹھا دیتے تھے۔ میں نے کتنی ہی بار تمھیں تھیئٹر میں دودھ پلایا ہے۔" ظاہر ہے وہ زمانہ تو مجھے یاد نہیں لیکن وہ عرصہ جب میں چار برس کے لگ بھگ رہا ہوں گا، میرے حافظے میں کچھ کچھ موجود ہے۔ میں تھیئٹر میں اسٹیج کے آگے پیچھے گھومتا پھرتا تھا جہاں اداکار اپنے مکالمے یاد کر رہے ہوتے تھے۔ میرے کانوں میں خوب صورت ترین اشعار پڑتے اور گراں ترین جنسی فقرے بھی۔ یہ ایسی تعلیم تھی جو مجھے والدین سے کبھی نہ مل سکتی جو ہمیشہ یا تو سوتے یا کام کرتے رہتے تھے۔ ہر ڈرامے میں افتتاحی شب مَیں اپنے ابی کے ساتھ تھیئٹر میں موجود ہوتا تھا ـــــ یا تو تھیئٹر کی روشنیوں سے خِیرہ، یا سوتا ہوا۔

اسی زمانے میں مجھے میری پہلی کتاب کا تحفہ ملا تھا: "ابنِ سلطان اور ساحرہ۔" یہ کتاب مجھے فواد شلبی نے دی تھی۔ یہ ڈراموں میں خیر اور شر کو بالمقابل پانے کا میرا اوّلیں تجربہ تھا۔ میرے والدین کے پاس میری تربیت کے لیے وقت نہیں تھا۔ میرے باپ کو تو تعلیم اور تربیت میں دل چسپی ہی نہ تھی اور امّی یہ کہنے پر قانع تھیں کہ "فرشتے بنو۔"

وہ مجھے سمجھاتیں کہ فرشتہ بننے کا مطلب خیر سے محبت کرنا، کسی کو ضرر نہ پہنچانا، صاف ستھرے رہنا اور صاف کپڑے پہننا ہے۔ میرے حقیقی استاد سب سے اوّل تھیئٹر، پھر کتابیں، اور پھر ایسے لوگ تھے جن کا میرے والدین سے کوئی رشتہ نہ تھا۔

جب میں نے مدرسے جانا شروع کیا تو گویا مجھ پر جنّت کے دروازے کھل گئے۔ مدرسے نے مجھے تنہائی سے نجات دلا دی، گو وہاں مجھے ہر قدم پر خود ہی پر بھروسا کرنا پڑتا تھا۔ میں علی الصباح بیدار ہوتا، رات کو تیار کیے گئے اور خوان پوش سے ڈھانک کر رکھے اُبلے انڈوں اور پنیر کا ٹھنڈا ناشتہ کرتا، کپڑے پہنتا اور اپنے سوتے ہوئے والدین کی نیند میں خلل ڈالے بغیر خاموشی سے گھر سے نکل جاتا۔ دوپہر کو واپس آتا تو وہ لوگ کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہے ہوتے۔ میں گھر میں اکیلا مدرسے کا کام کرتا، کوئی کھیل کھیلتا یا کتابوں سے دل بہلایا کرتا۔ پہلے صرف تصویریں

دیکھتا اور پھر لکھے ہوئے حروف کو پڑھتا۔ میں عم عبدہ کی فیاضی کو کبھی فراموش نہیں کروں گا ـــــ وہ پرانی کتابیں بیچنے والا جو مسجد سیدی الشعرانی کے پاس سڑک کے کنارے دکان لگاتا تھا۔ اور پھر... رات کے کھانے میں پنیر اور حلوہ کھا کر میں سونے کے لیے لیٹ جاتا۔ اس طرح میں عصر کے وقت سے پہلے دن بھر والدین کی صورت بھی نہیں دیکھ پاتا تھا، اور وہ مختصر وقت بھی ان کی جانے کی تیاریوں میں گزر جاتا تھا۔ مجھے ان کا اُنس اور توجہ اس قدر کم نصیب ہوتی تھی کہ میں شاید اس باعث ان سے اَور بھی زیادہ محبت کرنے لگا تھا۔ میری امی کی خوب صورتی، ان کی نرم مزاجی اور محبت مجھ پر سحر کر دیتی تھی اور ان کے اس اصرار "فرشتہ بنو" کے تصور سے میں سرشار ہو جاتا تھا۔ اسی طرح مجھے اپنے ابی بھی شان دار نظر آتے تھے ـــــ اس قدر پُرمذاق، ہنس مکھ اور شفیق؛ وہ جو تھوڑا سا وقت ہم ساتھ گزارتے کبھی تنبیہوں اور نصیحتوں کی نذر نہ ہوتا۔ بس کبھی کبھی وہ مجھے یاد دلاتے:

"اکیلے رہنے میں خوش رہو۔ تم گھر بھر کے بادشاہ ہو۔ اسے سے بڑھ کر اَور کیا چاہیے؟ تمھارا باپ بھی تمھاری طرح اکلوتا تھا اور خود ہی پر اعتماد کرتا تھا۔ ایسا تھا تمھارا باپ۔ اور تم اس سے بڑھ کر شان دار نکلو گے..."

امی جلدی سے اضافہ کرتیں:

"یہ فرشتہ ہے۔" پھر مجھ سے کہتیں، "فرشتے بننا، یا حبیبی!"

ایک بار میں نے ابا سے پوچھا تھا:

"کیا دادا دادی آپ کو تنہا چھوڑ دیتے تھے؟"

انھوں نے جواب دیا تھا:

"تمھارے دادا؟ وہ تو مجھ سے تعارف ہونے سے پہلے آخرت کو سدھار گئے تھے... لیکن تمھاری دادی، وہ گھر پر کام کرتی تھیں..."

امی نے ابی کو گھور کر دیکھا تھا اور مجھے احساس ہوا تھا کہ ان الفاظ میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔ امی نے کہا تھا:

"تمھارے دادا کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا، اور پھر دادی بھی اُن سے جا ملی تھیں۔ اس لیے گھر میں تمھارے ابی تنہا رہ گئے تھے۔"

Scanned with CamScanner

میں نے پوچھا تھا:

"اسی گھر میں؟"

"ہاں۔"

اور ابی نے کہا تھا:

"اگر دیواریں بول سکتیں تو تم سے عجب حکایات بیان کرتیں۔"

وہ تنہائی کا گھر تھا، لیکن ہم آہنگی کا بھی۔ اُس وقت امی اور ابی خوش گوار زوجین تھے۔ کم از کم مجھے تو وہ ہر شام کے جھٹ پٹے میں ایسے ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ آپس میں باتیں کرتے، ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے اور مجھ سے دونوں گہری محبت کرتے تھے۔ ابی اکثر زیادہ کھُل کر باتیں کرنے پر مائل رہتے مگر امی انھیں نظروں ہی نظروں میں تنبیہ کر دیتیں۔ میں اکثر اس بات پر غور کیا کرتا کہ امی انھیں کیا کہنے سے باز رکھتی ہیں۔ ان سے جدائی کا وقت میرے لیے صبر آزما ہوتا تھا اور میں بے تابی سے جمعرات کے دن کا انتظار کیا کرتا جب میں شام کو ان کے ساتھ ڈراما دیکھنے تھیٹر جا سکتا تھا۔ پڑھنے کی استعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ مجھ میں کتابوں کی اشتہا بھی بڑھتی گئی تھی۔ کتابیں خریدنے کے لیے میں زیادہ جیب خرچ مانگنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے کمرے میں بچوں کی پرانی کتابوں کی ایک چھوٹی سی لائبریری بنالی تھی۔ ابی مجھ سے پوچھتے:

"تم تھیٹر میں ڈراما دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتے؟"

لیکن میں ڈراما دیکھنے پر مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ میرے خواب مجھے نئے آفاق کی جانب لے جا رہے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہہ ہی دیا:

"میں تھیٹر کے لیے ڈرامے لکھنا چاہتا ہوں۔"

ابی نے قہقہہ لگا کر کہا:

"اس سے بہتر ہے اداکار بنو۔ یہ افضل ہے اور منفعت بخش بھی۔"

میں نے کہا:

"میں نے اپنے ذہن میں ایک کہانی بھی بنالی ہے۔"

"واقعی؟" ابی نے کہا۔

میں نے انھیں "فاؤسٹ" کی کہانی کا خلاصہ سنا دیا۔ میں نے اس میں اپنی طرف سے کوئی

Scanned with CamScanner

اضافہ نہیں کیا تھا ماسوا اس فرق کے کہ ہیرو کو اپنے سِن کا لڑکا بنا دیا تھا۔ امّی نے پوچھا:

"مگر لڑکے نے شیطان پر کیوں کر فتح پائی؟"

ابی نے کہا:

"آدمی شیطان پر فتح شیطانی وسائل ہی سے حاصل کرتا ہے۔"

امّی نے غصے میں چیخ کر کہا:

"اپنے افکار اپنے ہی پاس رکھو۔ دیکھ نہیں رہے تم ایک فرشتے سے بات کر رہے ہو؟"

اوائلِ عمر ہی سے میں "فن" اور "خیر" سے عشق کرنے لگا تھا۔ اپنی تنہائی کی لامتناہی ساعتوں میں مَیں ان کے بارے میں بلند آواز سے طویل خود کلامیاں کرتا۔ ان کے بارے میں میں نے اپنے ہم جماعت لڑکوں سے بھی علم حاصل کیا۔ میں اپنے ہم جماعتوں میں خاصا ممتاز تھا۔ ان میں زیادہ تر سچ مچ لفنگے تھے۔ استاد ان سے نالاں ہوتا تو چیخ کر کہتا:

"ارے چکلے کی اولادو!"

مگر ان میں ایک گروہ مثالی لڑکوں کا بھی تھا اور میں انھیں سے میل جول رکھتا تھا۔ ہم نے مل کر ایک "جمعیتہ الاخلاقیہ" قائم کر لی تھی اور ہم مبتذل گفتگو کی جم کر مخالفت کرتے تھے۔ ہم مصر الثورۃ الجدید کا قومی ترانہ گاتے تھے جس پر ہمیں صدقِ دل سے ایمان تھا۔ ہم میں سے بعض نے شجاعت کے جوہر دکھانے کے لیے خود کو عسکری یا سیاسی میدان کے لیے وقف کرنے کی قسم کھائی۔ میرا خیال تھا کہ تھیٹر بھی جوہرِ شجاعت کے جھنڈے گاڑنے کے لیے مناسب میدان ہے اور میرے لیے موزوں بھی، کیوں کہ میں ابتدائی جماعتوں ہی میں نگاہ کمزور ہونے کے باعث چشمہ لگانے لگا تھا۔ ہمارے درمیان اور جو بھی فرق رہے ہوں لیکن ہم سب کے خوابوں میں ایک مثالی دنیا سمائی ہوئی تھی جس کے ہم ممتاز ترین باشندے تھے۔ یہاں تک کہ مصر اسرائیل جنگ نے بھی ہماری مثالی دنیا اور آدرش کا بال بیکا نہ کیا تھا۔ جب نعرے وہی تھے اور ہمارے رہنما وہی تھے تو ہزیمت ہمارا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ لیکن امّی کا چہرہ مُرجھانے لگا تھا اور وہ زیرِ لب ایسے کلمات کہنے لگی تھیں جو میں سمجھ نہیں پاتا تھا۔ ابی اپنے شانوں کو جھٹک کر بات ٹالتے رہتے تھے گویا کوئی بات ہی نہ ہو، یا پھر مضحکہ خیز آواز میں چیخ چیخ کر قومی ترانہ گانے لگتے:

بلادی، بلادی، فداک دمی

(اے وطن، اے وطن، تجھ پر اپنا خون بہایا)

تھیٹر چند دنوں کے لیے بند کر دیا گیا تو پہلی بار مجھے دن بھر امی اور ابی کے ساتھ رہنے کی مسرت نصیب ہوئی۔ ابی مجھے ایک دن شارع الجیش کے ایک قہوہ خانے میں بھی لے گئے تھے۔ جنگ میں ہزیمت کے کچھ غیر متوقع خوش گوار نتائج بھی تھے، لیکن بہت مختصر عرصے کے لیے۔

***

امی نے پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے کہا:

"عباس، ہمارے یہاں ایک اجنبی آ کر رہنے والا ہے۔"

میں نے بے یقینی سے اُن کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کہا:

"تمھارے ابی کا دوست ہے۔ تم بھی اسے جانتے ہو۔ طارق رمضان۔"

"وہ اداکار؟"

"ہاں۔ اسے اپنے پرانا والا مکان چھوڑنا پڑا ہے۔ آج کل مکان ملتے نہیں ہیں۔ اسے اب تک کوئی مناسب مکان نہیں مل سکا ہے۔"

"وہ بڑا واہیات اداکار ہے۔ بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"لوگوں کو ایک دوسرے کے کام آنا چاہیے۔ اور تم تو فرشتہ ہو یا حبیبی!"

ابی نے کہا:

"وہ فجر کے وقت آئے گا اور عصر تک سوتا رہا کرے گا۔ اس طرح اس کے واحد کمرے کے سوا گھر تو پھر بھی تمھاری مملکتِ خاص رہے گا۔"

گھر میں اُس کے وجود کا مجھے کبھی کوئی خاص احساس نہیں ہوا۔ عموماً وہ میرے والدین کے ساتھ یا ان کے فوراً بعد چلا جایا کرتا تھا۔ وہ شکل سے بد تہذیب نظر آتا تھا اور ناشائستہ زبان استعمال کرنے کا عادی تھا۔ میرے والدین کی خوشنودی کی خاطر وہ مجھ میں خصوصی دل چسپی لیتا مگر میرے دل میں اس کے لیے بالکل احترام نہ تھا... ایک دن میری کتابیں دیکھ کر کہنے لگا:

"مدرسے کی کتابیں ہیں؟"

Scanned with CamScanner

امی نے فخر سے کہا:

"ادب اور تھیٹر کی کتابیں ہیں۔ تم مستقبل کے ڈراما نگار سے مخاطب ہو۔"

اس نے کہا:

"لعنت ہو تھیٹر پر! اس سے تو میں کباڑی یا قصاب ہوتا تو اچھا تھا۔"

اس پر میں نے پوچھا:

"آپ ہمیشہ چھوٹے رول کیوں کرتے ہیں؟"

اس نے اچانک کھانس کر کہا:

"قسمت! ... میری تقدیر تو ایسی ہے کہ اگر تمہارے ابی کی مہربانی نہ ہوتی تو عوامی بیت الخلا میں سونا پڑتا۔"

امی بولیں:

"ایسی باتوں سے ہمارے پروفیسر کو خوف زدہ مت کرو طارق!"

اس نے ہنس کر کہا:

"ڈراما نگار کو ہر چیز کا علم ہونا چاہیے۔ خاص طور پر شر کا۔ تھیٹر کا منبع شر ہی ہے۔"

میں نے سادہ لوحی کے جوش سے کہا:

"مگر خیر کو دائمی فتح ملتی ہے۔"

اس نے جواب دیا:

"ہاں... تھیٹر میں..."

***

جس طرح رات اترتی ہے ویسے ایک مبہم سا تغیر اُن پر چھاتا جا رہا تھا۔ نہ ان کی خاموشی وہ خاموشی تھی، نہ ان کا کلام وہ کلام تھا۔ نہ میرے ابی وہ ابی تھے نہ میری امی وہ امی تھیں۔ ان کے درمیان کون سا تاریک راز حائل ہو گیا تھا؟ امی کی بشاشت رخصت ہو گئی تھی اور ابی، جو پہلے اتنے خوش مزاج تھے، ہر وقت قہقہے لگاتے رہتے تھے، ہر چیز کا مذاق اڑاتے اور ہر ایک سے خندہ پیشانی

Scanned with CamScanner

سے ملتے تھے، اب اپنی ذات میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ امی کے برتاو میں یوں تو وہی محبت اور حلیمی تھی مگر اب اس میں ایک ایسا ملال شامل ہو گیا تھا جو وہ مجھ سے چھپا نہیں سکتی تھیں۔ میری روح میں ایک انجانا خوف اور قلق اُترنے لگا تھا۔ اور ایک دن چاے کے وقت میں نے سنا کہ طارق ابی کو مشورہ دے رہا ہے:

"شیطان سے مغلوب نہ ہو جانا۔"

امی نے تلخی سے کہا:

"تمھارے سوا دوسرا کوئی شیطان نہیں۔"

ابی نے احتجاج کیا:

"میں بچہ نہیں ہوں!"

میں نے اندازہ لگایا کہ میری موجودگی کے باعث امی نے مزید کچھ نہیں کہا۔ ان کے جانے کے بعد مجھ پر ایک عجب اُداسی اور احساسِ زیاں چھا گیا۔

یہ بات تکلیف دہ حد تک صاف تھی کہ کچھ نہ کچھ ہو گیا ہے۔ میں نے امی سے پوچھنا چاہا لیکن وہ ہر بار ٹال گئیں۔ وہ اور ابی جب بھی بڑے کمرے میں تنہا ہوتے، ان کے درمیان تلخ و ترش گفتگو ہونے لگتی۔ میں کھلے دروازے کے پیچھے دبک کر سنتا۔

"تمھارا اب بھی علاج ہو سکتا ہے۔"

"میرے ذاتی معاملات میں دخل مت دو!"

"لیکن تمھارے فعل کا اثر ہم سب پر پڑتا ہے، تمھیں اس کا احساس نہیں؟"

"مجھے وعظ سننے سے نفرت ہے۔"

"افیون نے میری خالہ کے زوج کو ہلاک کر دیا تھا۔"

"ثابت ہوا کہ اس کے فائدے بھی ہیں!"

"تمھاری شخصیت میں تغیر آ گیا ہے۔ ناقابلِ برداشت ہو گئے ہو تم!"

مجھے خوف نے جکڑ لیا۔ میں جانتا تھا افیون کیا ہوتی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں ایک ڈراما "شکار" دیکھ رکھا تھا۔ افیون کھانے والوں کی خراب حالت کے مناظر مجھے پہروں پریشان کرتے رہے تھے۔ کیا ابی اُن جیسے ہو جائیں گے؟ کیا میرے پیارے ابی فنا ہو جائیں گے؟ ابی اور طارق

رمضان کے لوٹنے سے پہلے میں امی کے ساتھ تنہا ہوا تو میں نے انھیں افسردگی سے دیکھا۔

انھوں نے پوچھا:

"کیا بات ہے عباس؟"

میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

"میں سب جانتا ہوں۔ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ مجھے وہ ڈراما شکار بھولا تھوڑا ہی ہے۔"

"کیسے جانتے ہو؟ نہیں نہیں بیٹا، جو تمھارا خیال ہے وہ بات نہیں۔"

اسی وقت ابی داخل ہوئے۔ وہ غصّے میں تھے اور صاف ظاہر تھا کہ انھوں نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ انھوں نے چیخ کر کہا:

"اے ولد! اپنی حد میں رہ!"

میں نے کہا:

"میں آپ کے لیے خوف زدہ ہوں۔"

اس بات پر وہ اس قدر خوفناک آواز میں چیخے جو میں زندگی میں پہلی بار سن رہا تھا۔

"خاموش! ورنہ میں تیرا سر توڑ دوں گا!"

اس لمحے میرے نزدیک وہ ایک جانور میں تبدیل ہو گئے۔ میرا طویل سہانا خواب چکنا چور ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں پلٹ آیا اور ایک ایسا ڈراما سوچنے لگا جس کا آغاز طارق رمضان کے گھر سے نکالے جانے سے اور انجام میرے ابی کے توبہ کرنے پر ہوتا تھا، جس میں ظاہر ہے میری کوششوں کا دخل تھا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ خیر کو فتح یقیناً نصیب ہو گی، بس کوئی ابی کی مدد کر دے۔ لیکن حالات اَور بھی بگڑتے گئے۔ ابی ہم سے دور ہوتے چلے گئے۔ میں پہچان بھی نہ سکتا تھا کہ یہ وہی پہلے والے ابی ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو ہم سے بالکل علیحدہ کر لیا۔ صرف ہم پر گرجنے برسنے کے وقت وہ ہم سے کلام کرتے۔ میں ان سے ڈرنے اور دور دور رہنے لگا۔ امی ملول رہتی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ ایک بار انھوں نے ابی سے کہا:

"گھر چلانے کے لیے میری اکیلی کی تنخواہ کافی نہیں۔"

"تو جاؤ دیوار سے سر پھوڑ لو!" ابی نے جواب دیا۔

حقیقت یہی تھی کہ ہمارے رہن سہن میں فرق آ گیا تھا۔ اخراجات بہت کم کر دیے گئے

Scanned with CamScanner

تھے اور کھانا پینا حد درجہ معمولی ہو گیا تھا۔ کھانے پینے کی تو مجھے پروا نہ تھی، مگر میں کتابیں کہاں سے خریدتا؟ افسوس کہ روح کی خوراک بھی رقم خرچ کیے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ لیکن سب سے بڑا سانحہ یہ تھا کہ میں نے اپنا باپ کھو دیا تھا۔ میرے پہلے والے ابی کہاں تھے؟ مجھ سے نگاہ ملتے ہی انھیں طیش آنے لگا تھا۔ وہ مجھ سے کہتے:

"تو ایک بے کار نمونہ ہے! حیات کے لیے صالح نہیں ہے۔"

امی اور ابی کے تعلقات اس حد تک خراب ہو گئے کہ دونوں علیحدہ کمروں میں رہنے لگے۔ ہمارا گھر بکھر رہا تھا۔ ہم ایک چھت تلے اجنبیوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ امی کا غم مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا تھا۔ میرے ذہن نے ایک ایسے منظر کا تصور کیا جس میں میرے ابی اور طارق رمضان ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ ابی طارق کو قتل کر دیتے ہیں۔ انھیں گرفتار کر لیا جاتا ہے، اور رخصت ہوتے وقت وہ مجھ سے کہتے ہیں:

"کاش میں نے تمھاری بات سن لی ہوتی!"

جس کے بعد بیت القدیم پہلے کی طرح طہارت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ بعد میں اپنے تخیل کی سفاکی پر مجھے ظاہر ہے ندامت ہوئی۔ میں نے ایک بار امی سے پوچھا:

"آپ تن تنہا کیوں کر گھر چلا لیتی ہیں؟"

"میں چھوٹی موٹی چیزیں بیچ دیتی ہوں۔ بیٹا تم اپنی پڑھائی میں دل لگاؤ۔"

"میرا دل آپ کے ساتھ ہے۔"

"جانتی ہوں۔ مگر فی الوقت تم ہمارے بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ تم پڑھ لکھ کر اچھی سی ملازمت کر لو، پھر ہم..."

"میں تھیٹر کے لیے ڈرامے لکھوں گا۔"

"اس میں نہ روزگار کی ضمانت ہے نہ ثروت۔"

"میں مادہ پرست نہیں ہوں۔ آپ جانتی ہیں میں مادی چیزوں کی پروا نہیں کرتا۔"

"مادہ پرست بھلے نہ بنو، مگر اسے یکسر فراموش بھی نہ کرو۔"

اور میں نے جوش و خروش سے انھیں یقین دلایا:

"فتح آخر کار خیر ہی کی ہو گی امی!"

Scanned with CamScanner

مجھے اپنے خوابوں کی ویسی ہی لت پڑ چکی تھی جیسے میرے ابی کو افیون کی... میں اپنے اطراف کی ہر چیز کو بدل ڈالنے کے خواب دیکھتا تھا ـــــ میں بجری کے بازار میں جھاڑو دلواتا، پرانے مکان مسمار کرا کے اونچے اونچے فلیٹ تعمیر کروا دیتا، پولیس والے کی پوشاک خوب صورت بنا دیتا، استادوں اور طالب علموں کا رویّہ بہتر کر دیتا، ہوا سے بہترین طعام اور مشروب اتار لاتا اور شراب اور افیون کو روئے ارض سے غائب کر دیتا۔

ایک دوپہر دونوں مرد بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ ابی موچنے سے اپنی مونچھیں اکھاڑ رہے تھے اور طارق اپنی جراب رفو کر رہا تھا۔ طارق کہہ رہا تھا:

"فقیروں کے افلاس سے دھوکا نہ کھانا۔ اس ملک میں ایسے بے شمار مالدار لوگ ہیں جن کے بارے میں کسی کو علم نہیں۔"

ابی نے کہا:

"الہلالی تو سونا بنا رہا ہے!"

"الہلالی کا کیا ذکر! عورتوں اور پٹرول کی دولت کی بات کرو۔"

"تجویز تو اچھی ہے مگر ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔"

میں نے دخل دیتے ہوئے کہا:

"ابوالعلا معرّی تو ایک دال کھا کر گزارا کیا کرتے تھے۔"

ابی نے چیخ کر کہا:

"یہ حکمت ماں کے سامنے جھاڑ!"

میں خاموش ہو گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ دونوں تو بالکل حیوان ہیں۔

***

تحیہ عین میرے سامنے کھڑی تھی۔ ناقابلِ یقین حد تک پُرجمال۔ اس کی وہ آنکھیں! ... میں بالکل مدہوش ہو کر اُسے تکے جا رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ امتحان کے دنوں میں مَیں رات کو جاگتا اور دن میں سوتا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں کمرے میں ٹہل ٹہل کر سبق

Scanned with CamScanner

یاد کر رہا تھا۔ تحیہ طارق رمضان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ امی اور ابی سو چکے تھے۔ میں نے اس سے پہلے تحیہ کو اسٹیج پر دیکھا تھا۔ وہ طارق رمضان کی طرح چھوٹے موٹے پارٹ کرتی تھی۔ اس وقت میں اسے اپنے روبرو، پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا:

"تم اس وقت کیوں کر جاگ رہے ہو؟"

"محنتی مجاہد ہے! امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔"

"شاباش!"

وہ دونوں اوپر طارق کے کمرے میں چلے گئے۔ میرا سر چکرا گیا۔ خون کھول اٹھا۔ میرے والدین کی لاعلمی میں وہ عورت کو اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ کیا اب ہمارا گھر ذلت کے ایسے گڑھے میں جا گرا ہے؟ میں مزید ایک لفظ نہ پڑھ سکا۔ میرا دماغ اوائلِ شباب کی ساری حسرتوں کے شعلوں میں گھر گیا تھا۔ ترغیب نے چُوطرفہ حملہ کیا تھا اور میں سراسر مصمم عزم کے بل پر اس سے نبرد آزما تھا۔ میرے پورے وجود میں طوفان بپا تھا۔ آخرکار نیند نے مجھ پر غلبہ پالیا۔

دوپہر کو جب وہ بڑے کمرے میں بیٹھے تھے، میں ان کے پاس جا پہنچا۔ ابی نے تردّد سے مجھے دیکھ کر پوچھا:

"کیا بات ہے؟ تمھیں کیا ہوا؟"

میں نے کہا:

"جو کچھ ہوا وہ تصور سے بعید ہے۔ رات طارق تحیہ کو اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔"

ابی کی بھاری آنکھیں میری جانب اٹھیں اور مجھے دیکھتی رہیں۔ میں سمجھا کہ انھیں یقین نہیں آرہا۔ میں نے کہا:

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

انھوں نے سرد مہری سے سوال کیا:

"تم آخر چاہتے کیا ہو؟"

میں نے کہا:

"میں آپ کو اطلاع دینا چاہتا تھا۔ آپ انھیں سیدھا کریں۔ انھیں سمجھا دیں کہ یہ باعزت گھر ہے۔ آپ ان کو فوراً نکال دیں۔"

Scanned with CamScanner

"تم پڑھائی میں دھیان لگاؤ اور گھر کی باتیں گھر کے مالک پر چھوڑ دو،" انھوں نے تیزی سے کہا۔

امی نے مری ہوئی آواز میں کہا:

"ان کی منگنی ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا:

"مگر ابھی شادی تو نہیں ہوئی۔"

ابی نے انگلی سے میری طرف اشارہ کر کے غیظ سے کہا:

"یہ بھوکوں مرنا چاہتا ہے..."

میں غصّے سے پھٹ پڑا۔ میں نے کہا:

"ہمارے افلاس کے ذمّے دار آپ ہیں..."

اس پر ابی نے چائے کی پیالی گھما کر مجھ پر دے ماری چاہی مگر امی لپک کر درمیان میں آ گئیں۔ وہ مجھے میرے کمرے میں لے آئیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے والے لگ رہے تھے۔ میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا:

"ان سے کوئی توقع رکھنا بے سود ہے۔ بس اب ان سے کوئی تعلق مت رکھیے۔ ہم دونوں کیوں نہ کہیں چلے جائیں... لیکن کہاں؟ ہم رہیں گے کہاں؟ اور... ہمارے پاس پیسا کہاں سے آئے گا؟"

ان سوالوں کا خود میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مکروہ سچائی میرے سامنے برہنہ ہو گئی تھی۔ امی کی مدافعت نے حالات کی یورش کے سامنے دم توڑ دیا تھا ـــــ حالات جو میرے باپ کی لت نے پیدا کیے، جن کا وہ یقینی طور پر ذمے دار تھا لیکن جن سے بچ نکلنے سے معذور تھا۔ لیکن اس بری عادت کے علاوہ بھی وہ اکثر مجھے ایک بے اصول انسان معلوم ہوتا تھا۔ میں اُسے حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور ایسے شخص کو مسترد کرتا تھا۔ اس نے ہمارے گھر کو چکلا بنا دیا تھا۔ لیکن میں خود بھی کمزور تھا۔ میں صرف رو سکتا تھا۔

***

Scanned with CamScanner

میں امتحان میں کامیاب ہو گیا لیکن مجھے وہ خوشی نہ ہوئی جو ہونی چاہیے تھی۔ میں شرم سے گڑا جا رہا تھا اور مستقل اُداس رہنے لگا تھا۔ طویل چھٹیوں میں میں زیادہ تر وقت لائبریری میں گزارتا رہا۔ وہاں میں نے ایک ڈراما لکھا۔ میں نے ابی سے التجا کی کہ وہ اسے سرحان الہلالی کے پاس لے جائیں مگر انھوں نے بس اتنا کہا:

"ہمارا تھیٹر بچوں کا نہیں ہے۔"

آخر امی میرا ڈراما لے گئیں۔ دو ہفتے بعد وہ اسے واپس لائیں اور مجھ سے کہنے لگیں:

"پہلا ڈراما قبول ہو جانے کی توقع غلط ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم کوششیں کیے جاؤ۔"

مجھے افسوس تو ہوا مگر مایوسی نہیں ہوئی۔ میں مایوس کیسے ہو سکتا تھا جب کہ میری واحد امید ہی تھیٹر تھا۔ ایک دن دارالکتب میں میری فواد شلبی سے ملاقات ہو گئی۔ ہم نے مصافحہ کیا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ میں کون ہوں۔ اس کے التفات سے مجھے یہ سوال کرنے کی ہمت ہوئی کہ میں تھیٹر کے لیے قابلِ قبول ڈراما کیسے لکھوں۔ اس نے پوچھا:

"تمھاری عمر کیا ہے؟ کون سی کلاس میں ہو؟"

"سیکنڈری اسکول میں ہوں۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کر لو؟"

"مجھے لگتا ہے کہ میں اس وقت بھی لکھ سکتا ہوں۔"

"نہیں۔ ابھی تم زندگی کو نہیں سمجھتے۔"

"مجھے خوب معلوم ہے کہ زندگی کیا ہے۔"

وہ مسکرایا۔ اس نے کہا:

"اچھا تو بتاؤ ــــ کیا ہے زندگی؟"

"زندگی مادّے کے خلاف روح کی کش مکش ہے۔"

"اچھا!"

اس کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔

"اور اس میں موت کیا کردار ادا کرتی ہے؟"

Scanned with CamScanner

میں نے پورے اعتماد سے کہا:

"موت مادّے پر روح کی آخری فتح ہے۔"

اس نے میرا شانہ تھپتھپایا اور کہا:

"کاش یہ اتنا سادہ مسئلہ ہوتا! تمھیں ابھی مزید تجربے کی ضرورت ہے۔ جاؤ اور معلوم کرو کہ لوگوں کو کن مسائل سے دل چسپی ہے، کیا شے انھیں جوش دلاتی ہے۔ میں تمھیں مشورہ دوں گا کہ زندگی میں چھلانگ لگا دو، اس کا ہر ذائقہ چکھو۔ اور کم از کم دس برس مزید انتظار کرو۔"

اس کی یہ باتیں سن کر میں اور بھی اپنے اندر سمٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ترغیب سے محفوظ ہوں؟ شاید وہ ہمارے گھر کے حالات سے ناواقف تھا؛ اور میرے اوائلِ شباب کی روح میں برپا طوفان سے بھی ناواقف تھا، شہوت اور عظمت کے مابین جان لیوا کش مکش سے بھی، مجنوں اور لیلیٰ کے عشقیہ اشعار اور عمر خیام کے عیش آفریں کلام کے ٹکراؤ سے بھی، اور اس تضاد سے بھی جو اوپر کی منزل کے کمرے میں رہنے والی بدچلن تحیّہ اور اُس کے اس جاں سوز تصور میں تھا جو میری روح کو پگھلائے دے رہا تھا اور جو زمین پر پڑی غلاظت اور آسمان پر تیرتے دودھیا بادلوں کے تضاد جیسا تھا۔

***

طارق کے کمرے سے متصل کمرے میں عجیب و غریب تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ پرانا سامان فروخت کر دیا گیا تھا؛ اس کی جگہ نیلام سے خوب صورت سازوسامان خرید کر رکھ دیا گیا تھا۔ معصرانی سِلوں والے فرش پر قالین بچھا دیا گیا تھا جس پر سبز بانات سے ڈھکی بڑی سی میز رکھی گئی تھی۔ وسطی دیوار کے ساتھ کھانے کی میز لگی تھی۔ یہ پُراسرار تیاریاں کس لیے کی جا رہی تھیں؟ جب میں نے امّی سے پوچھا تو انھوں نے گول مول سا جواب دیا:

"تمھارے ابی شام کو یہاں اپنے دوست احباب کے ساتھ تفریح کریں گے، جیسے سب مرد کرتے ہیں۔"

ابی کا نام سنتے ہی میں شک شبے میں پڑ گیا۔ امی نے اضافہ کیا کہ تھیٹر ختم ہونے کے بعد وہ

لوگ بقیہ شام یہاں گزارا کریں گے۔

مجھے رات بھر کمرے میں چھپ کر جھانکنے اور کان لگا کر باتیں سننے کی عادت پڑ گئی۔ ہمارے گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا علم صرف رات ہی کے وقت ہو سکتا تھا۔ یہ نام نہاد دوست بہت رات گئے آنا شروع ہوتے تھے۔ میں ان کی آمد دیکھ سکتا تھا ـــــ پہلے ابی، پھر الہلالی، اسماعیل، سالم العجرودی، فواد شلبی، تحیہ اور طارق... پھر میں تاریکی میں اوپر والی منزل میں چلا جاتا اور وہاں سے جھانک کر دیکھتا۔ وہ میز کے گرد بیٹھے ہوتے اور تاش کے پتے بانٹے جا چکے ہوتے۔

وہاں جُوا کھیلا جاتا تھا ـــــ بالکل جیسے ڈراموں میں دکھاتے ہیں اُس طرح۔ تھیٹر کے ڈرامے، اپنے اداکاروں سمیت، ہمارے گھر میں در آئے تھے۔ فرق یہ تھا کہ اسٹیج پر ان کے کردار خیر اور شر میں منقسم ہوتے تھے جب کہ اس گھر میں یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور صرف شر کی طرف تھے۔ وہ سب اداکار تھے ـــــ حتیٰ کہ تھیٹر کا ناقد بھی ـــــ اور ان کی واحد سچائی صرف جھوٹ تھی۔ اگر ایک بار پھر طوفانِ نوح آئے تو کشتی نوح میں جگہ پانے والے صرف میں اور امی ہوں گے۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس میں ہمارا ہاتھ نہیں تھا۔ لیکن امی ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنے لگی تھیں۔ میں نے احتجاج کیا تھا۔

"آپ ان بدمعاشوں کی مدارات کیوں کرتی ہیں؟"

امی نے بہانہ بنایا:

"وہ میرے کام کے ساتھی جو ہیں۔ اور پھر میں اس گھر میں میزبان ہوں۔"

"گھر؟ کیسا گھر؟ ... اب تو یہ قمبہ خانہ ہے... قمارخانہ بن چکا ہے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں یہاں سے نکل چلیں۔ لیکن فی الوقت میں کیا کر سکتی ہوں؟"

میں نے تنگ آ کر کہا:

"اسی لیے میں پیسے سے نفرت کرتا ہوں۔"

"لیکن ہم پیسے کے بغیر جی نہیں سکتے۔ یہی تو المیہ ہے... کچھ بھی ہو، میری آخری اور واحد امید تُو ہی ہے، میرے بیٹے!"

***

Scanned with CamScanner

خیر کیا ہے؟ عمل کے بغیر خیر کا کیا مطلب ہے؟ میں صرف خواب و خیال کی دنیا کا سورما تھا جو تھیٹر کی دنیا ہے۔ گھر فحاشی کا اڈا بن رہا تھا اور میری نوعمری اس بات کا کافی بہانہ نہ تھی کہ میں نے اس صورتِ حال کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں اپنے ہم جماعتوں کی زندگی میں محض تخیلاتی طور پر شامل ہو سکتا تھا جہاں خوب صورت کلمات عمل کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا رقص الموت تھا جس پر میں باہر کھڑا تالیاں بجا سکتا تھا۔ پھر فواد شلبی اپنے ساتھ دُرّیہ کو لانے لگا۔ تیسرے کمرے میں میرے دادا کی نشانی، "بسم اللہ" کے طغرے، کے نیچے وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے تھے۔ میں نے امی سے کہا:

"شلبی اور دُرّیہ بھی... ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

انھوں نے سُرخ آنکھوں کے ساتھ جواب دیا:

"تم اس قابل تو ہو جاؤ۔"

"میرا دم گھُٹ رہا ہے۔"

"میرا تم سے زیادہ دم گھٹتا ہے۔"

"کیا یہ سب کچھ صرف افیون کے باعث ہو رہا ہے؟"

انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔

"شاید اصل وجہ افیون نہیں... شاید افیون کسی اَور سبب کا نتیجہ ہے۔"

امی نے آہ بھر کر کم زور آواز میں کہا:

"تمھارا باپ مجنون ہے... مگر میری بھی خطا ہے کہ اس کے کہنے میں آ گئی..."

"میں اُسے قتل کرنا چاہتا ہوں۔"

امی نے میرا بازو سہلا کر کہا:

"خود کو پڑھائی میں غرق کر دو۔ میری واحد امید تم ہو!"

***

Scanned with CamScanner

وہ رات جس نے میری آخری خود فریبی کو جلا کر خاکستر کر دیا... اپنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے مجھے سرحان الہلالی سیڑھیوں سے لڑکھڑاتا ہوا نیچے آتا دکھائی دیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں نیم مُردہ سی تھیں۔ وہ کوئی دیوانہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ وہ جُوے کی میز سے اس طرح کیوں اُٹھ کر آ گیا۔ پھر امی اپنے کمرے سے باہر آئیں۔ یہ دیکھنے کہ کیا بات ہے، وہ آخری سیڑھی پر اس سے ملیں۔ انھوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی میں کچھ کہا جو میں نہ سُن سکا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ الہلالی بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ میں بے اختیار چھلانگ لگا کر کھڑا ہو گیا، لیکن فوراً ہی میرے قدم تھم گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ امی کو روکنے سے زیادہ میرے لیے اہم یہ ہے کہ سچائی کا پتا چلاؤں۔ میری ماں بھی؟ ہو سکتا ہے چند لمحوں کے لیے میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔ یہ ایسی ضرب تھی جو میری کل کائنات کو پاش پاش کر دینے والی تھی۔ مجھے اپنے اطراف ہولناک شیاطین کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ میں دوڑتا ہوا بڑے کمرے میں پہنچا اور امی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے بتی جلائی ـــــ کمرہ خالی تھا۔ میں نے بتی دوبارہ بجھا دی اور واپس بڑے کمرے میں پہنچا۔ میں نے وہاں کی بتی جلائی اور ہونقوں کی طرح کھڑا رہا۔ اسی وقت ابی تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے میرے پاس آئے۔ انھوں نے چھُوٹتے ہی پوچھا:

"اس وقت تم کیسے جاگ گئے؟"

مجھے علم نہ تھا کہ کیا کہہ رہا ہوں۔ مگر میں نے کہا:

"میں سو نہیں سکا۔"

"تم نے سرحان الہلالی کو تو نہیں دیکھا؟"

"وہ گھر سے چلا گیا ہے۔"

"کب؟"

"کچھ دیر پہلے... مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔"

میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میرا دماغ دیوانگی کے خیالات سے پھُٹکا جا رہا تھا۔ مجھے وقت کے گزرنے کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ آخر قدموں کی چاپ نے میرے اوسان بحال کیے۔ لوگ جا رہے تھے۔ پھر بڑے کمرے میں ابی اور امی تنہا رہ گئے۔

Scanned with CamScanner

میں کنجی کے سوراخ سے کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔ میں نے ابی کا سوال سنا:

"میرے پیٹھ پیچھے کیا ہوا تھا؟"

امی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ابی نے دوسرا سوال پوچھا:

"کیا عباس نے دیکھا تھا؟"

دوبارہ جواب ندارد۔

"ہر ایک جانتا ہے کہ الہلالی نے کسی کو نہیں بخشا۔ حتی کہ ام بانی کو بھی نہیں۔"

امی کی آواز تک نہیں نکل رہی۔ ابی نے کہا:

"ہر شے کی کچھ نہ کچھ قیمت ہوتی ہے۔ اصل بات تو یہ ہے! اور تم؟ خیر، تم اس قابل نہیں کہ تم پر غیرت کھائی جائے۔"

آخر کار امی بولیں۔

"تم ارذل ترین کیڑے ہو!"

ابی نے قہقہہ لگا کر کہا:

"ماسوا ایک کیڑے کے..."

تو حقیقت یہ تھی! یہ میرا باپ تھا اور یہ میری ماں تھی۔ اشتعال کے شعلے میری روح کو سفاکی سے جلا رہے تھے۔ اپنا خنجر میان میں رکھ دے کہ قیصر بھی قتل ہو چکا۔ سیرانو دی برجراک بھوتوں سے جدال کرتا تھا!

دلّال اور رنڈی ـــــ میرا باپ اور میری ماں ـــــ میں دونوں سے ہاتھ دھوتا ہوں۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ ایک بار میں نے دونوں کو فواد شلبی کے ساتھ سرگوشیاں کرتے دیکھا تھا اور اُس وقت کچھ نہ سمجھا تھا۔ ایک بار دونوں اکٹھے طارق رمضان سے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اور میں نے شک نہ کیا تھا... یہ سب... بلا استثنیٰ... کیوں نہیں؟ یہ عورت میری اوّل عدو ہے۔ میرا باپ تو مجنون ہے اور لت کا شکار ہے، لیکن میری ماں... میری ماں اس تمام شر کی خالق ہے۔

***

Scanned with CamScanner

کمرے میں امی کی آواز پہنچی جو مجھے پکار رہی تھیں۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ابی کے خلاف میرے جذبات کی واضح صورت تھی لیکن امی کے خلاف میرے شعور کا تلاطم اور کراہت بے شکل تھے۔ وہ جلدی سے میرے کمرے میں داخل ہوئیں اور میرا بازو پکڑ کر بولیں:

"تھوڑی دیر کے لیے پڑھنا چھوڑو۔ ہمیں ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔"

وہ مجھے بڑے کمرے میں لے گئیں اور کرسی پر بٹھا کر چائے بنانے لگیں۔ میں نے کہا:

"آج کل میں آپ کے بارے میں کچھ خوش نہیں ہوں۔"

انھوں نے مجھ پر نظر ڈال کر کہا:

"مجھے معلوم ہے تم کیوں حزیں ہو۔ لیکن میرے آلام میں مزید اضافہ نہ کرو۔ نجات کی ساعت قریب آ رہی ہے۔ ہم دونوں اکٹھے یہاں سے چلے جائیں گے۔"

اُف، کس قدر مکار عورت ہے! میں نے کہا:

"یہ گھر صرف آگ میں جل جانے سے پاک ہو سکتا ہے۔"

"کیا یہ کافی نہیں کہ میں تیری پرستش کرتی ہوں؟"

کیا میں اپنے دل کی جھلستی راکھ اس کے منہ پر دے ماروں؟ کیا میں دفن کر دوں اسے؟ میرے تخیل کے شعلوں نے میرے ہر ردعمل کو مفلوج کر دیا تھا... میں انھیں تکتے رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا۔

انھوں نے سوال کیا:

"کیا آج کل کوئی نیا ڈراما لکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا:

"ہاں... اس ڈرامے سے آپ کو ڈراما گناہگار عورتیں یاد آئے گا۔"

یہ گناہ آلود زندگی گزارنے والی عورتوں کے بارے میں ایک ڈراما تھا۔

"نہیں، میرے حبیب! تم اپنا ڈراما اپنے قلب کے نور سے لکھنا۔"

اسی وقت ابی اپنے کمرے سے نکل آئے اور تحیہ اور طارق زینے سے اترے۔ میں اپنے کمرے میں واپس جانا چاہتا تھا مگر تحیہ نے مجھے روک لیا۔

Scanned with CamScanner

"اے مصنف، کچھ دیر ہمارے ساتھ بھی بیٹھو۔"

غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ تحیہ نے مجھ پر توجہ دی تھی۔ میں بیٹھ گیا۔ طارق نے ہنس کر کہا:

"یہ مصنف تو کوئی المیہ تصنیف کرے گا۔"

میرا باپ بڑبڑایا:

"یہ فضیلت کے مرض میں مبتلا ہے۔"

تحیہ نے پیالی سے گھونٹ بھرا اور بولی:

"کیسی جمیل بات ہے کہ اس زمانے میں کوئی شخص خیر کا داعی ہے۔"

ابی نے کہا:

"اس کی آنکھیں کمزور ہیں، اس لیے نہیں دیکھ سکتا کہ گردوپیش میں کیا ہو رہا ہے۔"

تحیہ نے کہا:

"اسے اس کی جنت میں رہنے دو۔ میں بھی نیکی سے پیار کرتی ہوں۔"

طارق ہنس کر بولا:

"تمہاری نیکی سے تو ہم سب کا دل شاد ہوتا ہے۔"

تحیہ نے چائے پیتے ہوئے کہا:

"ماں کی طرح حسین اور باپ کی طرح قوی ہے۔ یہ تو ڈان ژوان نکلے گا۔"

ابی نے حقارت سے کہا:

"اس کا چشمہ تو دیکھو۔ مشکل تو یہی ہے کہ اسے کچھ نظر نہیں آتا۔"

وہ چلے گئے۔ میں اپنے غیظ و غضب میں سلگتا رہا۔ اپنے تخیل میں پھر کچھ ڈھانے اور کچھ بنانے لگا۔ لیکن جب تحیہ نے مجھے روکا تھا تب اس کا بدن مجھ سے مَس ہوا تھا۔ اس لمس نے ایک نئے خواب کا آغاز کر دیا تھا۔ تحیہ میری ماں سے کسی طرح بہتر نہ تھی۔ پھر وہ کیوں کر اس قدر کم قابلِ اعتراض لگتی تھی؟ بعد میں تنہائی میں اس لمس کی یاد نے میرے ذہن کے بھڑکتے جہنم میں ایک نئی کہانی کو جنم دیا تھا۔ کہانی اسی بیت القدیم کے گرد گھومتی تھی جو میرے دادا نے اپنے ماتھے کے پسینے سے بنایا تھا، اور پھر کس طرح وہ چکلے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہی بنیادی خیال تھا۔ اس کے کامیاب ہونے کی میرے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہ تھی کہ یہ خیال ہی میرے تن

Scanned with CamScanner

بدن میں فرحت کا ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ کیا یہ کامیاب ڈراما ہو گا؟ اور... کیا محبت کے بغیر کامیاب ڈراما بن سکتا ہے؟

***

دروازے پر ہلکی سی دستک... میں نے دروازہ کھولا۔ تحیہ باہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ یہ چائے کے وقت سے پہلے یہاں کیوں آئی ہے؟ وہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی:

"تمہارے سوا سب لوگ سو رہے ہیں۔"

وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈال کر کہا:

"کرسی، بستر... یہ صرف کمرہ نہیں پورا گھر ہے۔ اچھا... تمہارے پاس تھوڑا سا حلوہ ہو گا؟"

میں نے معذرت چاہتے ہوئے کہا:

"افسوس... نہیں ہے۔"

کمرے کے وسط میں اس کے گدرائے بدن سے ترغیب کی حرارت پھیل رہی تھی۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ اس کی آنکھوں کی شفاف پُتلیاں شہد کے رنگ کی ہیں۔

"تمہارے پاس تو کتابوں کے سوا کچھ نہیں۔ پھر تو مجھے چلا جانا چاہیے،" تحیہ نے کہا، لیکن جانے کے بجائے مجھ سے مخاطب ہو کر بولی:

"تم سوچ رہے ہو گے اتنی صبح میں کہاں چل پڑی۔ میں شارع الجیش پر اپنے فلیٹ میں جا رہی ہوں۔ جانتے ہو وہ کہاں ہے؟ ٹرام کے راستے پر باب الشعریہ سے ایک اسٹاپ آگے۔ عمارت نمبر ۱۱۷۔"

اس کے نسوانی بدن کی خوشبو سے مجھ پر نشہ طاری ہو رہا تھا۔ میں نے بے اختیار کہا:

"رکیے... میں آپ کے لیے باہر سے حلوہ لے آتا ہوں۔"

"نہیں، میں راستے سے لے لوں گی... تم بہت اچھے ہو۔"

اس کی موجودگی کے باعث کچھ دیر کے لیے میں نے اپنے اندر بپھرتے ہوئے طوفان کو فراموش کر دیا تھا۔ میں صرف اتنا کہہ سکا:

"اچھی تو آپ ہیں۔"

اس نے مجھ پر ایسی التفات کی نظر ڈالی جو خوابوں کو جنم دے سکتی تھی۔ پھر وہ آرام سے دروازے کی جانب بڑھی۔ میں نے گھبرا کر کہا:

"جائیے مت! ... میرا مطلب ہے... جلدی کیا ہے؟"

اس نے متبسم ہو کر مجھے دیکھا اور کہا:

"اگلی ملاقات تک..."

وہ چلی گئی ـــــ اس پُرسکون کمرے میں ایک پُرمسرت ہیجان چھوڑ کر، ایک انتہائی پُرشوق تلاطم... بھلا وہ بغیر کسی وجہ کے میرے کمرے میں کیوں آئی؟ اور اس طرح باتوں باتوں میں اپنا پتا کیوں بتایا؟ میرا مسرت زدہ، ضدی، سادہ لوح دل کس کس طرح دھڑک رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک جیتی جاگتی عورت ـــــ نہ کہ لیلیٰ و لبنیٰ و میہ، اوفیلیا و دسدیمونیا۔ اس کے بعد ہر صبح ہماری نظروں کے تبادلے میں ایک خاص معنی پیدا ہو گئے، ایک نیا سحرِ حیات۔ ہم ہر شخص سے بے نیاز ایک دوسرے سے گفتگو میں محو ہو جاتے۔ میں حیرت میں خود سے سوال کرتا تھا: کیا میں رفعتوں کی جانب پرواز کر رہا ہوں؟ یا سُرعت سے پستیوں کی جانب گر رہا ہوں؟

***

امشیر* کی چیختی ہواؤں کے باوجود مجھے اوپر کی منزل سے شور صاف سنائی دیا۔ میں لپک کر زینے پر چڑھا۔ میں نے دیکھا کہ بڑے کمرے میں طارق رمضان تحیہ کے رخساروں پر طمانچے مار رہا ہے۔ میں حیرت اور غم سے پتھر ہو کر رہ گیا۔ تحیہ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ طارق نے اطمینان سے پوچھا:

"ہم نے تمھیں پریشان تو نہیں کیا؟"

غم اور غصے کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے بمشکل کہا:

"معاف کیجیے گا..."

"یہ ہمارا یومیہ دستور ہے۔ گھبراؤ مت۔ تم بھی لطف اٹھاؤ۔"

Scanned with CamScanner

اندر سے تحیہ لرزتی ہوئی آواز میں چیخی:

"اب کی بار میں واپس نہیں آؤں گی۔"

طارق کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔

میں واپس نیچے آ گیا۔ ایک اور الم نے میرا کلیجا جکڑ لیا۔ آخر یہ کیوں کر ہوا؟ تحیہ جیسی گل بدن حسینہ طارق جیسے مردود کے ظلم و ستم کیوں برداشت کرتی ہے؟ کیا محبت اسی لیے نور بخشتی ہے کہ ایک المیے کو منکشف کرے؟

وہ دو دن تک نہیں لوٹی مگر تیسرے دن واپس آئی تو اس کا چہرہ منور ہو رہا تھا۔ میرا دل مسل گیا اور میرا حزن اور بھی گہرا ہو گیا۔ میں اس کے طرزِ عمل کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن میری محبت اب ایسی حقیقت تھی جس سے مفر ممکن نہ تھا۔ شاید میری لاعلمی میں وہ بہت عرصے سے جڑ پکڑ چکی تھی اور اب نشوونما پا کر ایک چھتنار پیڑ بن چکی تھی۔ پھر ایک دن جب وہ دونوں مکان سے باہر جا رہے تھے، وہ جراب درست کرنے کے لیے جھکی اور تہہ کیا ہوا چھوٹا سا کاغذ کا پُرزہ فرش پر گراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ مرتعش ہاتھوں سے وہ پُرزہ اٹھا کر میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے ملاقات کا مقام اور وقت پڑھا۔

***

وہ چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ کمرے صرف دو تھے لیکن خوب صورت اور صاف ستھرے، اور ان میں عنبر کی مہک پھیلی تھی۔ میز پر نارنجی مدور گل دان میں گلابوں کا ایک دستہ تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی پوشاک میں میرا استقبال کیا اور گلابوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"ہماری ملاقات کی خوشی میں..."

وفورِ شوق کی طویل ہم آغوشی جس سے دل بے پناہ مسرت سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو علیحدہ ہونے سے قبل ہی اولیں بوسے کی لذت میں غرق یہ ہم آغوشی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی۔ لیکن اس نے کمال نرمی سے مجھے خود سے علیحدہ کیا اور میرا بازو تھام کر مجھے دوسرے کمرے میں لائی جہاں ہم ایک بڑے سوفے پر ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

Scanned with CamScanner

اس نے مدھم آواز میں سرگوشی کی:

"ہم نے جرأت تو بہت بڑی کی ہے... لیکن یہی درست ہے۔"

میں نے جوش و خروش سے دُہرایا:

"یہی درست ہے..."

پھر میں نے ایامِ طفلی کے اختتام کا عزم کر کے کہا:

"میں بہت عرصے سے تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"واقعی؟ اور میں بھی... کیا تم یقین کرو گے... یہ میری پہلی محبت ہے۔"

میں بے یقینی کے عالم میں خاموش رہا۔ لیکن اس نے پُرحرارت لہجے میں کہا:

"تم نے میرے بارے میں بہت کچھ سنا ہو گا۔ لیکن وہ صرف ٹھوکریں تھیں ___ محبت نہیں تھی۔"

میں نے تاسف سے کہا:

"ایسی زندگی تمھارے لیے مناسب نہیں تھی..."

اس نے کہا:

"بھکاری اپنے لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ چاہیے اور وہ نہیں چاہیے۔"

"اب یہ سب کچھ بدل جانا چاہیے۔"

"یعنی؟"

"ہم اب ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔"

اس نے جوش سے کہا:

"میں آج تک تم جیسے شخص سے نہیں ملی تھی۔ وہ سب حیوان تھے۔"

میں نے کچھ احتجاجاً کہا:

"سب؟"

"میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی... سرحان الہلالی، سالم العجرودی... اور آخر میں... طارق..."

میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے امّی کا خیال آیا۔ لیکن اس نے کہا:

Scanned with CamScanner

"اگر تم ماضی کو بھلا نہیں سکتے تو اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنا ارادہ بدل دیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک داخلی قوت سے سرشار ہو کر کہا:

"مجھے صرف تمہاری حقیقی قدر و قیمت سے سروکار ہے۔"

"میرا دل ہمیشہ کہتا تھا کہ تم میرے گھٹیا خوف سے بہت بڑے ہو۔"

"میں بچہ نہیں ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولی:

"مگر تم ابھی طالب علم ہو۔"

"یہ سچ ہے۔ مجھے ابھی طویل مرحلہ طے کرنا ہے۔"

اس نے خلوص سے کہا:

"میرے پاس کچھ رقم جمع ہے۔ میں انتظار کر سکتی ہوں۔"

لیکن میں صرف محبت کے دام میں گرفتار ہی نہ تھا۔ میں اس بے مسرت اور منحوس گھر سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ وہ قدم اٹھاؤں جو واپس نہ لیا جا سکے اور ایک نیا راستا کھول دے۔ میں نے کہا:

"اس کے برعکس ہمیں فوراً شادی کر لینی چاہیے۔"

اس کا چہرہ یوں گلابی ہوا کہ وہ اور بھی حسین لگنے لگی۔ لیکن فرطِ جذبات سے کچھ کہہ نہ سکی۔

"ہمیں یہی کرنا پڑے گا۔"

اچانک اس نے اشتیاق سے بے قابو ہو کر کہا:

"میں اپنی زندگی بدل ڈالنا چاہتی ہوں۔ میں تھیٹر سے بھی چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔ لیکن... کیا تمہارے والد تمہارا خرچ اٹھاتے رہیں گے؟"

میں نے کہا:

"وہ ہرگز ایسا نہ کریں گے۔ اور میں ہرگز اس غلیظ مال کو قبول نہ کروں گا۔"

اس نے حیرت سے کہا:

"پھر آخر ہم شادی کیسے کریں گے؟"

"میرا بائی اسکول اب ختم ہونے کو ہے۔ اور میری کمزور نگاہ کی وجہ سے مجھے فوج میں لازمی

بھرتی سے استثنیٰ مل جائے گا۔ میں یقیناً کوئی نہ کوئی ملازمت تلاش کر لوں گا۔ میری صلاحیت کا انحصار ذاتی درس پر ہے نہ کہ اسکول میں اجتماعی درس پر...''

''کیا تمھاری آمدنی ہم دونوں کے لیے کافی ہو گی؟''

''ابی تھیٹر میں پرامپٹر کی ملازمت ترک کرنا چاہتے ہیں۔ قمار اور دوسرے ذرائع سے ان کی خوب آمدنی ہو جاتی ہے۔ میں ان کی جگہ کے لیے درخواست دے دوں گا۔ اس طرح میں تھیٹر میں بھی وقت گزار سکوں گا ــــ اُس دنیا میں جس سے میرا قلبی تعلق ہے۔ اور یہ فلیٹ تمھاری ملکیت ہے، اس لیے سر چھپانے کی جگہ بھی ہمارے پاس ہو گی۔''

''کیا میں بھی حالات بہتر ہونے تک تھیٹر میں کام جاری رکھوں؟''

''نہیں،'' میں نے سختی سے کہا۔ ''تم ان لوگوں سے دور رہو۔''

''میں نے بتایا ہے کہ میرے پاس کچھ رقم جمع ہے۔ لیکن وہ تمھارے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے تک نہ چل پائے گی۔''

میں نے شدتِ جذبات میں کہا:

''ہم کسی نہ کسی طرح گزارا کر لیں گے... جب تک ہمیں ہمارا گوہرِ مقصود ملے۔''

ہم پھر ہم آغوش ہو گئے اور ہم نے دنیا و مافیہا کو کچھ عرصے کے لیے فراموش کر دیا۔ آخر میں اس نے نرمی سے اپنا بدن چھڑا کر سرگوشی میں کہا:

''میں طارق رمضان سے دور رہنا چاہتی ہوں... میں اب واپس نہیں جاؤں گی۔''

میں نے کہا:

''وہ یہاں آ جائے گا۔''

طارق رمضان کا نام سن کر میری طبیعت مکدّر ہو گئی تھی۔

''میں دروازہ نہیں کھولوں گی،'' اس نے مجھے یقین دلایا۔

میں نے کہا:

''میں اُسے سب کچھ بتا دوں گا۔''

''عباس،'' اس نے کچھ گھبرا کر کہا، ''احتیاط رکھنا۔ کہیں بات بڑھ نہ جائے۔''

میں نے شیخی سے کہا:

Scanned with CamScanner

"میں اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔"

***

جب میں باب الشعریہ لوٹا تو ایک نیا انسان بن چکا تھا۔ پہلی بار میں نے تحیہ کو ایک مُحب کی نظر سے الوداع کہتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ پہلے سے کہیں بڑھ کر حسین اور ہم دردی کی مستحق نظر آئی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا: بہت جلد مَیں جانے والا ہوں، تماشائیوں کی صف سے اٹھ کر زندگی کے اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے کے عین وسط میں، اس منحوس بیت القدیم سے نکل کر تازہ، پاک صاف ہوا میں سانس لینے کے لیے... میں خالی کمرے میں انتظار کر رہا تھا کہ طارق سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آیا۔ سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا:

کیا تحیہ نہیں پہنچی؟"

میں اس کا سامنا کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں۔"

"تھیٹر میں تو نظر نہیں آئی۔"

"وہ تھیٹر نہیں جائے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ یہاں نہیں آئے گی اور تھیٹر بھی نہیں جائے گی۔"

"اور یہ سب اسرار تم کو کیوں کر معلوم ہوئے؟"

"ہم شادی کرنے والے ہیں۔"

"ہہ؟"

"ہم نے شادی کرنے کا اقرار کر لیا ہے۔"

"اے ابن... کیا تو پاگل ہو گیا ہے؟ کیا بک رہا ہے؟"

"ہم تمھارے ساتھ شرفا کا برتاو کرنا چاہتے ہیں۔"

اچانک اس نے میرے منھ پر زور کا طمانچا مارا۔ غیظ میں آ کر میں نے اسے گھونسا رسید

کیا۔ وہ چکرا کر زمین پر گرنے لگا۔ اتنی دیر میں میرے والدین دوڑتے اور چیختے چلاتے آ پہنچے۔ طارق نے کہا:

"کیا مسخرا پن ہے... یہ اماں کا لاڈلا تحیہ سے شادی کرنے چلا ہے..."

امی چیخ پڑیں:

"تحیہ...؟ وہ تجھ سے دس سال بڑی ہے..."

طارق ہمیں دھمکیاں دینے لگا۔ آخر امی نے اس سے کہا:

"اپنا سامان اٹھا کر رخصت ہو جاؤ۔ والسلام!"

طارق نے جاتے جاتے چیخ کر کہا:

"میں قیامت تک نہ جاؤں گا۔"

تھوڑی دیر سکوت رہا۔ پھر امی نے تمسخر سے ایک پرانے گیت کے بول دُہرائے:

"فی العشق یا ما کنت أنوح..."

(آہ تیرے عشق میں میں نے نوحے پڑھے...)

پھر وہ بولیں:

"عباس، یہ وقتی جذبات ہیں..."

"نہیں، یہ نئی زندگی ہے۔"

"اور تمہارے خواب؟ تمہارا مستقبل؟"

"انھیں میں صدقِ دل سے پایۂ تکمیل کو پہنچاؤں گا۔"

"تم اُس کے بارے میں جانتے ہی کیا ہو؟"

"اس نے مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دیا ہے۔"

امی قہقہہ لگا کر بولیں:

"بنتِ تھیسٹر... سب اصولوں سے واقف... مگر تم بھی عجیب ہو۔ اپنی ماں کو جاننے کے بعد تو تمھیں عورت ذات سے نفرت ہو جانی چاہیے تھی۔"

پھر وہ مجھے کمرے میں لے آئیں اور کہنے لگیں:

"اس کی سیرت اور ماضی کے بارے میں بھی جانتے ہو؟"

Scanned with CamScanner

ماضی کے پرانے درد سے میرے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ میں نے ان سے نظریں بچاتے ہوئے کہا:

"انسان اپنے ماضی سے کبھی فرار حاصل نہیں کر سکتا۔"

آہ! وہ نہیں جانتیں کہ مجھے اُن کے بارے میں کیا علم ہے۔ میں نے کہا:

"ہر شے کے باوجود تحیہ پاک ہے۔"

کاش میں تمہارے بارے میں بھی یہ کہہ سکتا اے میری ماں!

***

بائی اسکول ختم کرتے ہی میں نے سرحان البلالی کے تھیٹر میں ابی کی جگہ ملازمت کر لی۔ تحیہ اور میں نے فوراً عقد کر لیا۔ ہم نے بیت القدیم اور اس کے مکینوں کو بلا کسی رسم کے اسی طرح الوداع کہا جیسے میں اسکول یا دارالکتب جانے کے لیے نکل رہا ہوں۔ ابی نے ہمیں نہ وداع کیا نہ دعا دی۔ لیکن اتنا ضرور کہا:

"اگر تھیٹر میں پرامپٹر کی نوکری ہی کرنی تھی تو اسکول میں اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

امی نے البتہ مجھے گلے لگایا اور رونے لگیں۔ انھوں نے کہا:

"ربِ عالم تجھے خوش رکھے اور برے لوگوں کے شر سے تیری حفاظت کرے۔ تو سلامتی سے جائے اور ہم سے ملنے آتا رہے!"

لیکن اس جہنم میں کبھی واپس آنے کا میرا ہرگز ارادہ نہ تھا۔ میں ایک مختلف زندگی گزارنے کے لیے بے قرار تھا۔ میں نئی، تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا تھا اور اس قعرِ مذلت کو جہاں میں نے اتنے آلام برداشت کیے تھے، بالکل فراموش کر دینا چاہتا تھا۔ تحیہ میری منتظر تھی ـــــ اور محبت بھی۔ دو ہم آہنگ ہستیوں کے وصل سے جو مسرت پیدا ہو سکتی تھی وہ تمام تر اب میری تھی۔ وہ ہر طرح پُرکشش تھی ـــــ خاموش، باتیں کرتی ہوئی، سنجیدہ یا ہنستی ہوئی۔ حتیٰ کہ کھانا پکاتے اور گھر صاف کرتے ہوئے بھی وہ نہایت دلکش لگتی تھی۔ میری تنخواہ سے جو کچھ پورا نہ پڑتا وہ اُس

کی جمع پونجی سے پورا ہو جاتا۔ اس کی رفاقت نے مجھے ایسا سکون بخشا کہ میں ماضی کے تمام غضب اور قلق اور آلام سے آزاد ہو گیا۔ میں رات کو تین بجے گھر لوٹتا اور صبح دس بجے تک سوتا تھا۔ اس کے بعد محبت اور کتابوں کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ ہم دونوں نے اپنی تمام امیدیں تھیئٹر میں میرے کسی ڈرامے کی کامیابی سے وابستہ کر لی تھیں۔ اس کامیابی کے حاصل ہونے تک ہم سادگی بلکہ غربت سے بھی زندگی بسر کرنے کو تیار تھے۔ ہم دونوں کی باہمی مسرّت نے ہماری کوششوں کو دوچند کر دیا تھا۔ تحیہ نے اپنی قوّتِ ارادی کو ثابت کر دیا۔ اس نے شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی نہ چکھا اور سگریٹ پینا بھی چھوڑ دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ تو افیون کی بھی عادی ہو جاتی لیکن افیون پہلی بار چکھنے پر اس کی جی متلا گیا تھا اور اسے ہمیشہ کے لیے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسے گھر داری میں اس قدر مہارت تھی کہ ایک بار مَیں کہے بغیر نہ رہ سکا:

"تمہارا گھر ہمیشہ صاف ستھرا اور منظّم، تمہارے طعام ممتاز، تمہارا سبھاو مہذّب۔ بھلا تمہیں وہ زندگی کیوں گزارنی..."

میری بات قطع کر کے اس نے کہا:

"میرے ابی مر گئے تھے اور امی نے ایک مہتمم سے دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتا تھا اور امی مجھے نظر انداز کرتی تھیں۔ اس لیے مجھے وہاں سے فرار ہونا پڑا۔"

اس کے آگے نہ اُس نے کبھی کچھ بتایا نہ میں نے جاننا چاہا۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ کن حالات نے اسے سرحان الہلالی کے تھیئٹر کی ممثلہ بنایا ہو گا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے یاد آیا کہ میری امی نے بھی اسی تھیئٹر میں کام کیا تھا۔ اسی طرح وہ بھی سرحان الہلالی کے رحم و کرم پر رہی تھیں۔ میں ایک ذاتی جنگ لڑ رہا تھا، ہر قسم کی غلامی کے خلاف، جس میں لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کیا تھیئٹر اس معرکے کا صحیح میدان ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا میرا بیت القدیم کا تصور، جو اس درجہ پست ہو چکا تھا کہ چکلا بن گیا تھا، اس پلاٹ کا مضبوط سہارا بن سکے گا؟

***

تحیہ کی شیریں گفتاری، حِلم اور محبت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ میرے اپنے والدین کے باہمی تعلقات، میرے بشاش بچپن میں بھی، کبھی اتنے اچھے نہ رہے تھے۔ تحیہ سچ مچ فرشتہ تھی۔ اس نے اپنے افسردہ ماضی کو کہیں دور پھینک دیا تھا۔ وہ مجھ سے حقیقی محبت کرتی تھی اور اب میرے بچے کی ماں بننا چاہتی تھی۔ لیکن میں بچہ نہیں چاہتا تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ ہماری قلیل آمدنی پر مزید بوجھ پڑ جائے گا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر مجھے خوف تھا کہ اس سے میری فنکارانہ زندگی میں خلل پڑے گا اور اپنا فن مجھے دنیا میں سب سے پیارا تھا، حتیٰ کہ محبت سے بھی زیادہ۔ حالاں کہ مجھے تحیہ کی خواہش پوری نہ ہو سکنے کا بے حد افسوس تھا، میرا اخلاقی معیار مجھے خود غرضی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن عین اس وقت جب ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں چڑھتے چڑھتے ہماری دسترس سے نکل گئی تھیں، تحیہ کی ماں بننے کی آرزو پوری ہو گئی۔ تحیہ حاملہ ہو گئی۔ اب ہمیں نہ صرف حال بلکہ مستقبل کے لیے بھی سوچنا پڑا اور نئی صورتِ حال سے نبٹنے کے لیے دوسرے وسائل کھوجنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہمارے حالات نے مجھے یہ یقین دلا دیا کہ اگر اس کا ذرا بھی امکان ہو تو مجھے ایک اور ملازمت کرنی پڑے گی۔

زمانۂ تعلیم میں میں نے سن رکھا تھا کہ امریکا اور یوروپ کے ادیب لکھنے کے لیے قلم کی جگہ ٹائپ رائٹر استعمال کرتے ہیں۔ میں نے بھی ٹائپ کرنا سیکھ لیا تھا۔ تھیٹر جاتے ہوئے راستے میں فیصل نامی ایک ٹائپنگ بیورو پڑتا تھا۔ میں وہاں کام کرنے لگا۔ مجھے کام کے حساب سے معاوضہ ملنے لگا۔ اس دکان پر میں نے صبح آٹھ بجے سے سہ پہر دو بجے تک کام کرنا شروع کر دیا۔

تحیہ کو معلوم ہوا تو وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ اس نے کہا:

"تم تین بجے رات کو سوتے ہو۔ اب دس بجے کے بدلے صبح سات بجے اٹھو گے، پھر کام پر چلے جاؤ گے۔ واپس آ کر دو گھنٹے کی نیند لینے کے لیے کم از کم چار سے چھ بجے تک سوؤ گے۔ تمھیں آرام کرنے کا، پڑھنے لکھنے کا وقت کب ملے گا؟"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"تمھارے ابی کافی مال دار آدمی ہیں۔"

میں نے غصے سے کہا:

"میں اُس غلیظ مال کا ایک حبہ بھی قبول نہیں کروں گا۔"

Scanned with CamScanner

میں نے اس موضوع پر مزید بات کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ سچ مچ ایک ممتاز عورت تھی لیکن زندگی کے بارے میں عملی بھی تھی۔ وہ میرے مال دار باپ سے مدد مانگنے کو اس پر ترجیح دیتی تھی کہ مسلسل کام میرے وقت اور فن اور راحت کو سلب کر لے۔ میں نے دو دن کی چھٹی لے کر ایک ڈراما لکھا اور سرحان الہلالی کو پڑھنے کے لیے دیا۔ سرحان الہلالی نے کہا:

"تو تم نے ارادہ نہیں بدلا؟"

انتظار کا وہ زمانہ میں نے خوب صورت خواب دیکھتے ہوئے گزارا۔ فن میری سب سے گہری آرزوؤں کی تکمیل ہی نہیں، فی نفسہ میری زندگی بن چکا تھا۔ یہ ڈراما میں نے بیت القدیم کے قمارخانے میں تبدیل ہونے کو ڈرامے کے موضوع کے طور پر استعمال کرنے سے بہت پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ پلاٹ میرے ذہن میں ہنوز پوری طرح جم نہیں پایا تھا۔ تاہم میں اس ڈرامے کے ارفع اخلاقی پیغام سے بھی کافی مطمئن تھا۔ سرحان الہلالی نے ڈراما واپس لوٹا دیا۔ اس کا تبصرہ بس اتنا تھا:

"ابھی طویل مراحل سے گزرنا ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

"اس میں کیا کمی ہے؟"

اس نے عجلت سے کہا:

"یہ کہانی ہے، مگر ڈراما نہیں ہے۔"

اور لکھنا جاری رکھنے کے لیے ہمت افزائی کا ایک کلمہ تک نہیں!

یااللہ... وہ عذابوں سا عذاب! حتیٰ کہ بیت القدیم کے عذاب سے بھی بڑھ کر! فن میں ناکامی بذاتِ خود موت ہے۔ ہم اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ اور میری نسبت سے تو فن محض فن نہ تھا؛ مجھ جیسے خیال پرست انسان کے لیے تو فن اُس عمل کا نعم البدل تھا جو میں کر گزرنے سے معذور تھا۔ اگر میں تھیٹر کے میدان میں جہاد نہ کر سکا تو کیا کروں گا؟ میرے نزدیک تو شر کا مقابلہ کرنے کا یہی ایک میدان تھا۔ اور اگر میں جدوجہد جاری رکھنے کی طاقت کھو بیٹھا تو؟ تب کیا ہو گا؟ دن گزرتے گئے اور میں مسلسل کام میں جٹا رہا۔ میں مشین بن گیا۔ میں جلد بازی سے ہم بستری کرنے لگا۔ میں اپنے باطن سے کٹ گیا۔ نہ پڑھنا تھا نہ لکھنا ـــــ زندگی روزمرہ روے ارض کی

صعوبتوں اور غلاظتوں، اُبلتے گٹروں اور شکستہ اور بد نظم ذرائع آمدورفت کا مقابلہ کرنے تک محدود ہو گئی۔

ایسے حالات میں، تحیہ کو اپنے پہلو میں لے کر، میں زندگی پر غور کرتا تو مجھے اپنی حیات مہمل کاموں کا ایک مضحکہ خیز کیلنڈر نظر آتی۔ ہم محتاط خواب دیکھتے ہوئے ایک دوسرے سے بوس و کنار کرتے۔ تحیہ کے بطن میں پلتی ہوئی زندگی میری موعودہ، مستقبل کی کامیابی کی راگنی کے سُر چھیڑتی۔ لیکن کبھی کبھی میرا تخیل مشتعل ہو جاتا۔ وہ اس بیت القدیم اور اس کے جملہ فاسقوں کو آگ کے شعلوں میں جل کر راکھ ہوتا ہوا دکھاتا۔ حالاں کہ اپنے تخیل کی سفاکی پر مجھے بعد میں ہمیشہ ندامت محسوس ہوتی۔ بے شک مجھے اپنے باپ سے ذرا بھی محبت نہیں رہی تھی، لیکن ماں کے لیے میرے دل میں شفقت اور تردد تھا۔ ایک دن میں نے اپنی قلبی کش مکش کا تحیہ سے ذکر کیا تو اس نے کہا:

"قانون کی نظر میں خفیہ قمارخانہ چلانا جرم ہے، لیکن بے پناہ مہنگائی بھی ایسا ہی جرم ہے۔"

میں نے پوچھا:

"کیا تم اپنے گھر میں وہ سب کچھ ہونے دو گی؟"

"لاسمح اللہ! لیکن میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ بعض لوگ مصیبت میں تنکوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔"

میں نے خود سے کہا کہ میں بھی اسی ڈوبتے ہوئے شخص کی مانند ہوں۔ قانون کی نگاہ میں میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ باعزت روزگار کی خاطر میں نے اپنا سارا وقت بے وقعت کام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ نتیجے میں میری زندگی چوبِ خشک کی مانند ہو گئی تھی۔ کیا یہ بھی ایک قسم کا جرم نہ تھا؟

دن گزرتے گئے اور میرا عذاب بڑھتا گیا۔ کسی شیطانی قوت نے میری پوشیدہ خواہشوں کو تخیل کا لباس پہنانا شروع کر دیا۔ ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھے بیٹھے، میں اپنی کھوئی ہوئی آزادی، ختم ہوتی ہوئی تخلیقی قوت اور گم شدہ انسانی وجود کی بازیابی کی آرزو سے مغلوب ہو جاتا۔ قیدی اپنی زنجیریں کیسے توڑے؟ میرے تخیل میں ایک مقدس دنیا ہوتی جہاں گناہ نہ تھا، بندش نہ تھی،

Scanned with CamScanner

سماجی ذمے داریاں نہ تھیں؛ بس ہر سمت تخلیقی قوت دھڑک رہی تھی، نئے خیالات اُبھر رہے تھے، نئی فکر طلوع ہو رہی تھی، اس کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔ مکمل تنہائی تھی ـــــ نہ ماں، نہ باپ، نہ بیوی، نہ بچے۔ ایسی دنیا جہاں فنکار ہلکا پھلکا، بادلوں کی طرح اڑتا پھرے! ... آہ، یہ کیسا خواب ہے! خیر اور نیکی کے لیے اپنا وجود وقف کر دینے والوں کے دل کے نہاں خانوں میں کیسے شیاطین پوشیدہ ہیں! اپنی فرشتہ جیسی بیوی کا خیال مجھے منفعل کر دیتا۔ میں اس عورت کے سامنے خجل ہو جاتا جس کے وجود سے میرے لیے محبت اور صبر کے چشمے پھوٹتے تھے۔ اللہ میری زوجہ کو اپنی حفاظت میں رکھے اور میرے والدین کو معاف کرے۔ تحیہ نے کہا:

"کیا سوچ رہے ہو؟ میں جو کہہ رہی ہوں تم سن ہی نہیں رہے۔"

میں نے محبت سے اس کا ہاتھ چھوا اور کہا:

"میں آنے والے نئے مہمان کے بارے میں سوچ رہا ہوں، کہ اس کے لیے ہمیں کیا تیاریاں کرنی چاہییں۔"

***

ایک روز میں عم احمد کے بار میں بیٹھنے والا تھا کہ اس کے چہرے پر میں نے کسی بد خبر کی اداسی دیکھی۔ میں نے پوچھا:

"خیر یا عم احمد؟"

"معلوم ہوتا ہے تم نے کچھ نہیں سنا۔"

"میں ابھی پہنچا ہوں۔ کیا ہوا؟"

اس نے افسوس سے کہا:

"فجر کے وقت... مکان پر پولیس کا چھاپا..."

"ابی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور کیا ہوا؟"

Scanned with CamScanner

"وہی جو ایسی صورتوں میں اکثر ہوتا ہے۔ قمار بازوں کو چھوڑ دیا اور تمہارے والدین کو گرفتار کر لیا۔"

میں نے ایک لمحے میں اپنا تمام غصہ فراموش کر دیا۔ میرا حال اتنا خراب ہو گیا کہ پریشانی سے مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے ماں باپ کے ہولناک مقسوم نے میرے دل پر خنجر کی طرح ایسا کاری وار کیا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ سرحان الہلالی نے مجھے فوراً بلوا بھیجا۔

"میں ان کے لیے شہر کا بہترین وکیل کروں گا۔ پولیس نے نقدی اپنے قبضے میں لے لی ہے۔ انھیں وہاں کافی منشیات بھی ملیں... لیکن پھر بھی... امید ہے۔"

میں نے کہا:

"میں ابھی اُن کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

"ضرور جانا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ آج رات میں تمھیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ تھیٹر کا پرانا اصول ہے ـــــ کھیل چلتا رہنا چاہیے، خواہ ہم میں سے کسی کے عزیز کی موت ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ممثل کو ہر حال میں اسٹیج پر اپنا کردار ادا کرنا ہے، خواہ وہ مزاحیہ کردار ہی کیوں نہ ہو۔"

میں شکست خوردہ اس کے کمرے سے نکلا۔ ماضی کے خوفناک تخیلات کے احساسِ جرم نے میرے عذاب میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

طاہر کی پیدائش مقدمے سے ذرا پہلے ہوئی۔ وہ ایسے دکھ بھرے، توہین آمیز اور افسردہ ماحول میں پیدا ہوا کہ اس کی ماں نے اپنی خوشی کا میرے سامنے بھی اظہار نہیں کیا۔ وہ ایک ماہ کا بھی نہ ہوا تھا کہ اس کے دادا دادی جیل بھیج دیے گئے۔ وہ صحت مند بچہ نہ تھا۔ اس بات پر ہم دونوں پریشان رہنے لگے۔ لیکن میں اپنے کام میں فرار حاصل کر لیتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو دوبارہ کام میں غرق کر دیا تھا۔ لیکن میرے نصیب میں ابھی اس سے بھی ہولناک الم باقی تھا۔ طاہر ایک ماہ کا تھا کہ تھیہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ہم دونوں نے سوچا کہ انفلوئنزا ہو گا، اور خود ہی کچھ دوائیں خرید لیں۔ لیکن جب ہفتے بھر بعد بھی تھیہ کی طبیعت اچھی نہ ہوئی تو میں ڈاکٹر کو گھر لے کر

آیا۔ ڈاکٹر نے کئی قسم کے ٹیسٹ کرنے کے بعد ٹائیفائیڈ کے شبے میں تحیہ کو اسپتال میں داخل کرنے کا مشورہ دیا۔

میں نے تحیہ کی دیکھ بھال خود کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لیے اسپتال میں داخل کرانے کے مشورے کو مسترد کر دیا۔ میں نے فیصل ٹائپنگ بیورو میں ملازمت ترک کر دی۔ تنخواہ کے نقصان کو پورا کرنے کے لیے میں نے گھر کا ریفریجریٹر فروخت کر دیا۔ میں دن بھر تحیہ اور بچے کی تیمارداری کرنے لگا۔ میں نے اس طرح جان و دل سے ان کی خدمت کی کہ گو بچے کی حالت میں فرق نہ آیا لیکن تحیہ کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ کرسی پر بیٹھنے کے قابل ہو گئی۔ اس کے چہرے کی شگفتگی رخصت ہو گئی تھی اور بدن میں ذرا طاقت نہ رہی تھی۔ لیکن وہ مستقل بچے کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ تحیہ کی بحالی سے مجھے ذرا فراغت نصیب ہوئی، حالاں کہ طاہر کی طبیعت اب بھی اچھی نہ تھی۔ رات کے وقت جب میں تھیٹر جاتا تو اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ مجھے آسرا تھا کہ اب تحیہ جلد بچے کی تیمارداری کرنے کے قابل ہو جائے گی، لیکن اچانک اس کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اسے اتنی جلد اٹھ کھڑا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں دوبارہ، پہلے سے دُگنے عزم کے ساتھ، دونوں کی تیمارداری میں لگ گیا۔ میری نظریں گھر کی دوسری قابلِ فروخت اشیا کو ڈھونڈنے لگیں۔

لیکن ڈاکٹر کی یقین دہانیوں کے باوجود میرا دل ڈوب چکا تھا۔ اب جب میں تحیہ کے زرد چہرے کو دیکھتا تو اس کے ساتھ گزارا ہوا مسرّت کا ایک ایک لمحہ اس طرح یاد کرتا جیسے خاموشی سے اسے الوداع کہتا ہوں۔ ام ہانی نے ہمارے مصائب کی خبر سن کر میری غیر موجودگی میں ہمارے گھر رہنے کی پیش کش کر دی تھی۔ جب آخری گھڑی آئی تو میں گھر سے باہر تھا۔ میں نے دروازے پر ام ہانی کے دل دوز نالے سنے۔ اپنے مقسوم کو تسلیم کر کے میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دل کے دروازے تاریک ترین غم کے لیے وا کر دیے۔

تحیہ کی موت کے ایک ہفتے کے اندر اندر طاہر بھی اس سے جا ملا۔ ڈاکٹر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ نہیں بچے گا۔ مجھے ٹھیک سے باپ بننے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ اس کا کرب زدہ وجود میرے لیے ہمیشہ غم کا باعث رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

اُس زمانے کی مجھے کوئی بات یاد نہیں۔ ہاں، طارق رمضان کا گریہ صاف صاف یاد ہے۔ میں تنہائی میں جی بھر کر رو چکا تھا اس لیے جنازے میں شامل دوسرے لوگوں کے سامنے تحمل سے کھڑا تھا۔ اچانک طارق کی آہ و بکا نے تھیٹر سے آئے تمام لوگوں کو اس کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ میں تعجب سے اس گریے کا مطلب سوچتا رہ گیا۔ طارق رمضان، یہ جانور جس نے اب اپنی ہوس کا رخ ام بانی کے گھر کی جانب کر دیا ہے، کیا واقعی تحیہ سے محبت کرتا تھا؟ میں صرف مرنے والی کے شوہر کی حیثیت سے نہیں، ڈراما نگار کی حیثیت سے بھی طارق رمضان کے آنسوؤں کا مطلب معلوم کرنا چاہتا تھا۔ حُزن کی آخری انتہا پر بھی میں اپنے فن کو نہیں بھُولا تھا۔

***

اور اب تنہائی تھی ـــــ خالی گھر میں چھائی خاموشی جو یادوں اور بھوتوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور حزن اور احساسِ جرم سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہوا دل تھا، کیوں کہ برف کی سی سرد حقیقت جو میرے سامنے تھی، سرگوشیوں میں کہتی تھی کہ میرا خواب پورا نہیں ہوا۔ اب میں خواب دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنے غم میں پوری طرح غرق ہو جانے کے لیے تیار تھا۔ لیکن الم اپنی انتہا سے گزر کر ایک خمار طاری کر دیتا ہے جس سے ایک انوکھی سی راحت بھی ملنے لگتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جب طارق رمضان گریہ کر رہا تھا تو حقیقت میں وہ ہنس رہا ہو؟ یہ بھی تنہائی ہے ـــــ غم اور صبر ـــــ اور ایک دعوتِ عمل۔ عمر بھر مجرّد رہنے کا عزم، احساسِ خودداری کا سہارا اور آخری سانس تک فن میں ڈوبے رہنے کا ارادہ۔ میں نے ایک ڈرامے کا پلاٹ سوچ لیا تھا۔ اس کا نام تھا "بیت القدیم ـــــ ایک قحبہ خانہ"، کہ اچانک پہلے والی تحیہ بجلی کی طرح میری نظروں میں کوندی ـــــ حسین اور پُرشباب، صحت مند بدن والی تحیہ، زندگی کی مسرت سے بھرپور تحیہ۔ میرے دماغ میں ایک نیا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ ڈرامے کی جائے وقوع وہی رہے، کردار بھی زندگی پر مبنی ہوں، لیکن کہانی وہ ہو جو میرے تخیل نے تراشی تھی۔ حقیقت میں گھر پر پولیس کا چھاپا پڑا تھا اور مرض الموت نے تحیہ اور طاہر کو چھین لیا تھا۔ لیکن کوئی اَور بھی ان کا قاتل تھا ـــــ میرا تخیل، جس نے پولیس سے مخبری کی اور تحیہ اور بچے کو قتل کر دیا۔ یہ ڈراما لکھ کر میں اپنے

Scanned with CamScanner

باطن کے جرم کا اعتراف کروں گا اور کفارہ ادا کروں گا۔ میں زندگی میں پہلی بار ایک اصلی ڈراما لکھنے والا تھا۔ سرحان الہلالی اسے واپس نہیں کر پائے گا۔ گو ہو سکتا ہے کچھ لوگ سمجھیں کہ میں تخیل کے بجائے کسی خارجی حقیقت کے پوشیدہ جرم کا اعتراف کر رہا ہوں، لیکن مجھے پروا نہیں۔ باطنی لحاظ سے فن تطہیر کا وسیلہ ہے، خارجی لحاظ سے فن اس جنگ کی سبیل ہے جو گناہوں میں پیدا ہونے والے اُس شخص پر واجب ہے جو ان کے خلاف بغاوت کا عزم کرے۔ بس یہی ایک حقیقت ہے۔

اور تخلیقی عمل نے میرے وجود کو جکڑ لیا۔

***

ڈراما پڑھنے کے لیے ایک ماہ کی میعاد جب ختم ہوئی تو سرحان الہلالی سے ملاقات کے لیے تھیٹر جاتے ہوئے میرا دل دیوانہ وار دھڑک رہا تھا۔ اس بار اگر انکار ہوا تو میں برداشت نہ کر سکوں گا۔ میں نے اس کے آنکھوں میں پوشیدہ تبسم کی جھلک دیکھی تو میرا افسردہ دل توقع سے مرتعش ہو گیا۔ اس کے انگلی کے اشارے پر میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب اس کی گونج دار آواز سنائی دی:

"آخر کار تم نے ایک حقیقی ڈراما لکھ ہی ڈالا۔"

پھر وہ میری طرف ایسی سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا گویا پوچھ رہا ہو کہ آخر کیسے؟ لمحہ بھر کے لیے میرے سارے تفکرات ہوا ہو گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا چہرہ سُرخ پڑ گیا ہے۔ اس نے کہا:

"نہایت شاندار، ہولناک، کامیاب! لیکن تم نے اس کا نام افراح القبہ کیوں رکھا ہے؟"

میں نے حیرت سے کہا:

"نہ معلوم کیوں!"

اس نے زور سے ہنس کر کہا:

"ادیبوں کے یہی انداز تو میری سمجھ سے بعید ہیں۔ نہ جانے تم شر کے خلاف اخلاقی کش مکش کی فرحت کی طرف اشارہ کر رہے ہو، یا طنزیہ کہہ رہے ہو جیسے ہم کوئی نام برعکس رکھتے ہیں، کسی سیاہ فام کو صباح یا نور کہہ کر پکار لیتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

میں نے مسکرا کر اس سے اتفاق کیا۔

"میں تمھیں تین سو پاؤنڈ دینے کو تیار ہوں،" اس نے کہا۔ "سخاوت میری واحد خوبی کہی جا سکتی ہے۔ یہ کسی بھی ڈراما نگار کو دی جانے والی سب سے زیادہ رقم ہے۔"

کاش تم آج زندہ ہو سکتیں! کاش میری خوشی میں شریک ہو سکتیں!

پھر کچھ سوچ کر اس نے پوچھا:

"کہیں کچھ لوگ پریشان کن سوالات نہ پوچھیں؟"

"یہ ایک ڈراما ہے۔ اس سے زیادہ کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔"

"احسن! بالکل ٹھیک! لیکن ہمارے جاننے والوں میں یہ شک شبے کا طوفان اٹھا دے گا۔"

میں نے سکون سے کہا:

"اس کی مجھے پروا نہیں۔"

"براوو! اور کیا لکھا ہے؟"

"میں ایک نیا ڈراما لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔"

"واہ! یہ تمھارے لیے موسمِ باراں ہے۔ میں ہمہ تن انتظار ہوں۔ امسال خریف میں یہ ڈراما کمپنی کو متعجب کر دے گا۔"

***

چھوٹے سے گھر میں مجھ پر بار بار حُزن کے دورے پڑنے لگے تھے۔ میں گھر بدلنا چاہتا تھا، لیکن کیوں کر؟ سامان کی ترتیب بدلتے ہوے، پرانا پلنگ بیچ کر نیا خریدتے ہوے، مجھے احساس ہوتا کہ تحیہ ان چیزوں سے بڑھ کر میرے وجود میں اتر چکی ہے۔ میرا ماتم ایسا نہ تھا جو زور شور سے شروع ہو کر دھیما پڑتا جائے۔ شروع میں تو میرا غم ایک حد تک قابلِ برداشت تھا ــــ شاید اس لیے کہ میں سکتے کے عالم میں تھا ــــ لیکن رفتہ رفتہ الم میرے اندر اتنا گہرا اترتا گیا کہ میں صرف وقت کے ہاتھوں اس کے نقوش کے مٹنے کی امید کر سکتا تھا۔ بظاہر مجھ پر اس سانحے کا کوئی خاص اثر نہ ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کے باعث لوگ سوچتے ہوں کہ تحیہ کو سچ مچ میں نے قتل کیا ہے، لیکن

Scanned with CamScanner

اب وہ تو پوری حقیقت جان گئی ہے۔ خریف سے قبل ہی میرے والدین کی رہائی ہو گئی۔ مجھ پر ان کا احترام واجب تھا۔ احساسِ فرض ہمیشہ میرے دوسرے جذبات پر غالب آ جاتا ہے۔ اس لیے میں نے ان کا محبت اور کرم کے ساتھ استقبال کیا۔ لیکن انھیں اس قدر ابتر حالت میں دیکھ کر میرا صدمہ اَور بڑھ گیا۔ میں نے سر حان الہلالی سے بات کی کہ وہ تھیٹر میں اپنی سابقہ ملازمتوں پر بحال ہو جائیں، اور وہ اس پر راضی بھی ہو گیا، لیکن ان دونوں نے تھیٹر میں کام کرنے اور وہاں کے لوگوں سے کوئی رابطہ رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان لوگوں میں سے کسی نے، ماسوا ام بانی اور عم احمد برجل کے، اس دوران ان سے ملنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بات پر میں خوش ہوا تھا۔ ابی اب بالکل ویسے بن گئے تھے جیسا میں نے انھیں ڈرامے میں پیش کیا تھا۔ حالاں کہ وہ افلاس کے باعث افیون چھوڑنے پر مجبور ہونے کے باوجود اب بھی عجیب تھے اور میں انھیں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن میں نے ان کی شخصیت کو پوری طرح سمجھنے کا کبھی دعویٰ بھی نہ کیا تھا۔ میں نے ڈرامے میں انھیں افلاس اور منشیات کا شکار فنّی ضرورت کے تحت دکھایا تھا۔ نہ جانے ڈرامے میں اپنے کردار کے بارے میں وہ کیا کہیں گے۔ کیا اس ڈرامے کے پیش ہونے کے بعد میں ان کا سامنا کر سکوں گا؟ امی اب بھی مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی تھیں۔ لیکن میں اب آزاد ہونا چاہتا تھا۔ میں کہیں اَور اکیلے رہنا چاہتا تھا، خواہ وہ جگہ چھوٹا سا ایک کمرہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں ان سے محبت نہیں تو نفرت بھی نہیں کرتا تھا۔ ڈرامے میں اپنا کردار دیکھ کر انھیں صدمہ پہنچے گا۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ میں ان کے ایک ایک راز سے واقف ہوں۔ کیا اس کے بعد میں کبھی ان سے نظریں ملا سکوں گا؟ نہیں، نہیں، ہرگز نہیں! میں انھیں ان کے حال پر چھوڑ دوں گا، لیکن ان کی کفالت کا کوئی انتظام کر دوں گا۔ دکان کی تجویز بہت اچھی تھی۔ دراصل یہ عم احمد کی تجویز تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ اس سے روزگار حاصل کرتے رہیں گے اور صدقِ دل سے توبہ کر لیں گے۔

***

میں طارق رمضان کے روبرو تھا۔ یوں تو اب ہم میں علیک سلیک ہونے لگی تھی، لیکن اس

Scanned with CamScanner

وقت وہ اپنی مخصوص دھونس کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ طارق ایک ایسا شخص ہے جس میں اخلاق یا مروّت نام کی کوئی شے نہیں۔ میں ام بانی پر کئی بار خفا ہوا ہوں کہ وہ اس بھونڈے آدمی کے ساتھ کیوں رہتی ہے۔ اس نے جھوٹ موٹ مجھ سے کہا:

"میں ڈرامے کی مبارک باد دینے آیا ہوں۔"

مجھے معلوم تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ اپنی کوئی سفاکانہ تفتیش کرنے آیا ہے۔ پھر بھی میں نے اخلاقاً اس کا شکریہ ادا کیا۔

"ڈرامے کا ہیرو نہایت بُرا انسان ہے اور ڈراما دیکھنے والوں کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہو گی..."

میں نے اس کی بات کو فی الفور نظر انداز کر دیا۔ اپنے خیال میں وہ مجھے ڈائرکٹر کی رائے بتا رہا تھا، لیکن مجھے پروا نہ تھی۔ ہیرو نہ ڈرامے میں برا آدمی ہے نہ اصل زندگی میں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے آیا ہے۔ میں نے اس کی طرف حقارت سے دیکھا کہ وہ بول اٹھا:

"تم نے یہ نہ سوچا کہ ڈراما دیکھ کر لوگ تمھارے بارے میں کچھ شک کریں گے؟"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔"

وہ اچانک پھٹ پڑا۔

"تم کیسے سنگ دل قاتل ہو!"

میں نے حقارت سے کہا:

"اب تم ماضی کی باتیں کر رہے ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے یہ ایک محبت کا تجربہ تھا، جب کہ تمھارے لیے وہ رشتہ نفرت کے سوا کچھ نہ تھا۔"

"کیا تم اپنا دفاع کر سکو گے؟"

"مجھ پر کوئی الزام نہیں ہے۔"

"تمھیں جلد ہی عدالت میں جانا پڑے گا۔"

"تم نہایت احمق اور حقیر ہو۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تمسخر سے کہنے لگا:

"خیر تمھیہ تو قتل ہونے کی مستحق تھی، لیکن تُو بھی پھانسی کے قابل ہے۔"

Scanned with CamScanner

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس نفرت انگیز ملاقات کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی گرداب میں چکرا رہا ہوں۔ مجھے اپنے رہنے کے لیے کوئی دوسری جگہ تلاش کرنی پڑے گی۔ مجھے خود کو ان غبی لوگوں کی دسترس سے دور روپوش کر لینا پڑے گا۔ کیا میں سچ مچ پھانسی کے قابل ہوں؟ نہیں نہیں... اگر میری پوشیدہ خواہشیں مجھ کو مجرم ٹھہرائیں تب بھی نہیں۔ میری خواہشیں... ناقابلِ برداشت بوجھ سے آزاد ہونے کی خواہشیں تھیں، اپنی محبوب ہستیوں سے آزاد ہونے کی نہیں۔ اور وہ خواہشیں وقتی گھٹن سے پیدا ہوئی تھیں، کسی دائمی جذبے کے باعث نہیں۔ کچھ بھی ہو، اب میں ایسی جگہ مزید نہیں رہ سکتا جہاں یہ شیطان کسی بھی وقت گھس آئے۔

***

ایک دلال نے مجھے حلوان میں ایک قیام گاہ "لاکوت دارُور" میں کمرہ دلوا دیا۔ یہ بھی تنہائی تھی ـــــ گو دوسری قسم کی۔ میں تھا، میری کتابیں تھیں اور میرے خیالات تھے۔ میں زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں رہتا تھا۔ رات کے وقت تھوڑی دیر ورزش کے لیے ٹہلنے نکل جاتا تھا۔ نوکری سے میں استعفیٰ دے چکا تھا۔ اب میں نے طے کیا کہ بیٹھ کر درجنوں خیالات میں سے کوئی ایک منتخب کروں اور لکھنا شروع کر دوں۔ لیکن جب میں لکھنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ ذہن میں ایک بھی خیال نہیں۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ میں صرف تنہائی میں نہیں رہ رہا تھا، میں ایک خلا میں رہ رہا تھا۔ تحیہ کے لیے میرا غم لوٹ آیا ـــــ عمیق اور قاہر غم۔ میری نظروں میں طاہر تک کی شبیہ مجسم ہونے لگی ـــــ ننھا سا، کم زور، بیمار، کسی انجانے وجود کے سامنے ایک ایک سانس کے لیے ایڑیاں رگڑتا ہوا۔ الم سے فرار کی خاطر فن سے رجوع کرتا تو وہاں ایک سنسان خلا کے سوا کچھ بھی نہ پاتا۔ میں جل بُجھا تھا۔ جس شے نے میرے شعلے کو سیاہ پوش کر دیا تھا اس نے وہاں مُردنی کے سوا کچھ بھی نہ چھوڑا تھا۔ زندگی سے میری رغبت مُردہ ہو چکی تھی۔

اس دوران میں حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میں اخباروں میں متواتر اپنے ڈرامے کی شاندار کامیابی کی خبریں پڑھ رہا تھا۔ درجنوں تنقید نگار مصنف کی تعریفیں کر رہے تھے اور پیش گوئیاں کر رہے تھے کہ اس کی صلاحیتوں سے تھیٹر کی دنیا کو کس قدر فائدہ ہو گا۔ ایک طرف یہ ستائشیں

تھیں اور دوسری طرف تنہائی اور موت کے اس جہنم میں میرا گھسٹتا ہوا وجود۔ ایک بھی سطر لکھنے میں مسلسل ناکامی زندگی کی سب سے بڑی ستم ظریفی تھی۔ میں اپنی ہڈیوں میں اترتی ہوئی اداسی سے مخاطب ہو کر کہتا: تُو نے یہ توقع تو نہ کی تھی!

سرحان الہلالی نے کہا تھا کہ یہ موسمِ باراں ہے۔ لیکن میں سوچنے تک سے معذور ہو چکا تھا۔ میرے خیالات راکھ میں تبدیل ہو رہے تھے۔ باطن میں تخلیق کا چشمہ سُوکھا ہوا تھا۔ میں موت کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میں موت کو چھُو سکتا تھا، موت کی بُو سونگھ سکتا تھا، موت کو دیکھ سکتا تھا...

جب میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تو میں سرحان الہلالی کے پاس دوبارہ گیا۔ اس نے معاہدے کے علاوہ مجھے سو پاؤنڈ مزید دینے پر اعتراض نہیں کیا۔ میں موت کے ساتھ کسی دوڑ کے مقابلے میں شامل ہو گیا تھا لیکن میرا باطن اس حد تک بنجر تھا کہ میں ایک زندہ لاش سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔ فنا میرے کانوں میں تمسخر سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں عبث ہوں، میرا وجود عبث ہے۔ فنا میرے ساتھ کھلواڑ کر رہی تھی۔ وہ مجھے سزائے موت سنا رہی تھی۔ جب پیسے دوبارہ ختم ہو گئے تو میں پھر سرحان الہلالی کے پاس پہنچا۔ اس بار اس نے سختی مگر شرافت کے ساتھ کہہ دیا کہ وہ مزید رقم صرف اس صورت میں دے گا کہ میں اسے نئے ڈرامے کا کچھ حصہ دکھاؤں۔ اب میری حالت میں حُزن اور مُردنی کے ساتھ مفلسی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ تب میں نے ایک جائے پناہ کی سوچی ـــــ باب الشعریہ ـــــ لیکن کسی شے نے مجھے روک دیا۔ زندگی کے اس مقام پر جہاں میں اپنی مرضی سے بن ماں باپ کا ہو چکا تھا، اور جہاں میں اب بے گھر بھی ہونے والا تھا، نہ کوئی میرا تھا نہ میں کسی کا۔ مجھے زندگی سے کوئی ربط باقی نہ تھا ـــــ تو پھر میرا انجام وہی ہونا چاہیے جو ڈرامے کے ہیرو کا ہوا تھا۔ آخر کار میں نے اپنی آخری سطریں بھی سوچ لیں۔ میں اپنے آلام اور بار کا ذکر تک نہیں کرنا چاہتا۔ میرے دل میں ان کے لیے خود بھی حقارت تھی۔

عصر کی اذان سے ذرا پہلے میں جاپانی باغ کی طرف چلا گیا۔ میں وہاں ایک بنچ پر بیٹھ گیا ـــــ چہار اطراف سے بے خبر، سرتاپا اپنے خیالوں میں غرق جو ہولناکی سے متصادم تھے۔ زندگی؟ خاتمہ؟ کہاں؟ کس طرح؟ اُس رات میں گھنٹا بھر بھی نہ سویا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ میرا سر بھاری ہونے لگا۔ دن کی روشنی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ مجھ پر مُردنی سی طاری ہو گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو جھُٹ پٹے کا وقت تھا۔ تاریکی آہستہ، بھاری قدم بڑھاتی چلی آ رہی تھی۔ میں کوئی گھنٹا بھر

Scanned with CamScanner

سویا رہا تھا۔ میں بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اپنے جسم کی غیر متوقع چُستی پر حیرت زدہ رہ گیا۔ میرے اندر زندگی کسی برقی رو کی طرح دوڑ رہی تھی۔ میرا سر بھاری نہیں تھا۔ میرے دل پر وہ پتھر کی گراں سِل موجود نہیں تھی۔ یہ سب کیوں کر ہوا؟ غم و الم بادل کی طرح چھٹ گیا تھا۔ میں ایک بالکل نیا انسان بن چکا تھا۔ یہ کب پیدا ہوا؟ کیوں کر پیدا ہوا؟ صرف ایک گھنٹے کے عرصے میں یہ کایا کلپ کیسے ہو گئی؟ میں ایک گھنٹا نہیں، ایک کامل عصر تک سوتا رہا تھا اور اب اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں بیدار ہوا تھا۔ بے شک اسی نیند میں کوئی بات واقع ہوئی۔ یہ فرحت اور تازگی اور شادابی جو مجھے اپنے روئیں روئیں میں محسوس ہو رہی تھی، زندگی کا یہ سرُور جس نے ماضی کا ہر داغ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا ـــــ مجھے اس معجزانہ تبدیلی کے آغاز کا ذرہ بھر احساس بھی نہ ہو سکا تھا، اور اب یہ آ گئی تھی... آ چکی تھی! شاید میں نے کوئی طویل سفر کامیابی سے طے کر لیا تھا۔ ورنہ یہ تازہ آفرینش کہاں سے آئی؟ ناقابلِ فہم، غیر متوقع، شاید میں اس کا مستحق بھی نہ تھا، لیکن اتنی اصلی کہ چھوئی جا سکے، رگ و پے میں محسوس کی جا سکے۔ یہ نشاط آ گئیں مسرّت ـــــ میری تنہائی اور مفلسی کے باوجود، میرے غم و الم، میرے زیاں، میری مخالفتوں کے باوجود ـــــ میں اسی نشاطِ حیات سے، اسی جوششِ مسرّت سے پیوست رہنا چاہتا تھا جیسے یہ کوئی طلسمی تعویذ ہو۔ اس کی قوّت اس کے اسرار ہی میں پوشیدہ ہے۔ دیکھو اس کی حیات افزا قوّت فتح کے شادیانے بجاتی چلی آ رہی ہے۔ میں فوراً اسٹیشن کی طرف چل پڑا گو کہ وہ بے حد دور تھا۔ ہر قدم کے ساتھ ایک نئی، پُر حرارت قوت میرے وجود میں داخل ہو رہی تھی؛ امکانات ایک کے بعد ایک یوں روشن ہو رہے تھے جیسے بارش سے بھرے بوجھل بادل تلے اوپر اُمڈے چلے آ رہے ہوں۔ میرا رواں رواں زندگی سے مملو تھا، مشتاق تھا، زندگی کے لیے بے قرار تھا اور اس سے کچھ فرق نہ پڑ سکتا تھا کہ میری جیب میں ایک درہم بھی نہ تھا، دشمن میرے تعاقب میں تھے یا میں اپنے ساتھ صدمات کا بار لیے جا رہا تھا۔ کمرے میں چھوڑا ہوا خود کشی کا رقعہ مجھے کافی دور نکل جانے کے بعد یاد آیا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسے واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔ اب وہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو کیا ہو سکتا ہے؟ مجھے اس کی فکر نہیں ہوئی۔ اس لمحے مجھے کسی چیز کی فکر نہیں رہی تھی۔ میں چلا جا رہا تھا۔ جب مسرّت کا چیلنج ارادے کو آزاد کر دے تو یہ نشاط اپنے عروج پر ایک افلاس کے ہاتھوں تاراج، ہڈیوں تک برہنہ وجود پر بھی جگمگا سکتا ہے۔

**

Scanned with CamScanner

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم کتاب

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافت پابندِ سلاسل

مجلد ۳۷۵ صفحات　　قیمت: ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری پلازہ، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner

ادائیگی بذریعہ کریڈٹ
کارڈز بھی ممکن ہے

VISA

بین الاقوامی سطح پر
اردو کے قارئین کے لئے
خوشخبری

اردو زبان کی تاریخ میں پہلی بار

اب دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو زبان کے شائقین

اپنی من پسند علمی ادبی اور اسلامی کتابیں

فضلی بک سپر مارکیٹ سے براہ راست اپنے پتے پر حاصل کر سکتے ہیں۔

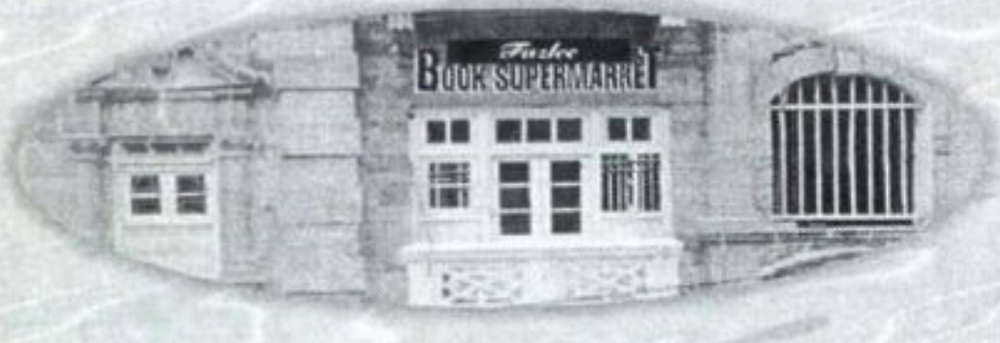

طریقہ کار نہایت آسان: آپ مندرجہ ذیل کسی بھی رابطے کے ذریعہ ہمیں مطلوبہ کتب کے بارے میں لکھئے ہم آپکو فوری طور پر ان کتب کی مجموعی رقم اور وزن کے مطابق ترسیل کے لئے موزوں ذریعوں سے مجموعی تخمینہ حاصل کر کہ آپ کو ارسال کر دیں گے۔ آپ کی کنفرمیشن ملتے ہی آپ کو کتب ارسال کر دی جائیگی۔

Fazlee
BOOK SUPERMARKET
RETAILERS • WHOLESALERS • DISTRIBUTORS

رابطہ کیجئے بذریعہ انٹرنیٹ: fazlee@tarique.khi.sdnpk.undp.org

رابطہ کیجئے بذریعہ فیکس: 0092-21-2633887

رابطہ کیجئے بذریعہ فون: 0092-21-2633853

رابطہ کیجئے بذریعہ خط: 4, Mama Parsi Building, Urdu Bazar, Karachi-74200 Pakistan.

Scanned with CamScanner

آپ کا حُسن دوبارہ آشکارا !

این فرینچ
ہیئر ریموور

یہ بنا کسی جلن یا اُلجھن، جلد کی تہہ تک پہنچ کر تمام غیر ضروری بالوں کو صاف کرتی ہے اور اس کے کنڈیشنر کا جادوئی اثر جلد کی قدرتی ملائمت اور دلکشی کو سامنے لاتا ہے۔ اس طرح آپ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ حسین نظر بھی آتی ہیں۔

این فرینچ
واقعی خیال رکھتی ہے!

Scanned with CamScanner

ایک روشن اور محفوظ مستقبل کی نوید!

حبیب بینک کی ماہانہ آمدنی اسکیم

میں سرمایہ لگا کر

سرمایہ حکومتِ پاکستان کی ضمانت کے تحت محفوظ

۱۶٫۵* فیصد سالانہ

تک بیش بہا منافع حاصل کیجئے۔

گوشوارہ آمدنی

سرمایہ کاری	متوقع کل ماہانہ آمدنی*
۱۰,۰۰۰ روپے	۱۳۷ روپے ۵۰ پیسے
۵۰,۰۰۰ روپے	۶۸۷ روپے ۵۰ پیسے
۱۰۰,۰۰۰ روپے	۱۳۷۵ روپے
۵۰۰,۰۰۰ روپے	۶۸۷۵ روپے

اہم خصوصیات

سرمایہ کاری کی کم سے کم حد ۱۰,۰۰۰ روپے۔
سرمایہ کاری کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد نہیں۔
سرمایہ کاری کی رقم ایسی ہو جو دس ہزار سے مکمل طور پر تقسیم ہو جائے۔
مدتِ تکمیل: پانچ سال۔
منافع کی ماہ بہ ماہ ادائیگی۔
منافع کی سرمایہ کاری: دس ہزار یا دس ہزار سے مکمل طور پر قابلِ تقسیم رقم لگائی جا سکتی ہے۔

تفصیلات کے لئے ہماری کسی بھی قریبی برانچ سے رابطہ کیجئے۔

* متوقع

آپ کا قابلِ اعتماد بینک

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

aaj

an urdu journal of literature and ideas

Published quarterly from Karachi, aaj presents each time a selection of contemporary writings from many languages of the world, translated in Urdu, as well as some ground-breaking Urdu writings of today. At the end of each regular issue a special section - a small anthology in itself - is devoted to a particular writer or subject. The special issues of aaj published so far have presented selections of Arabic, Persian and Hindi short stories, selected fiction of Gabriel Garcia Marquez, writings from different parts of the world covering the tragedy of Bosnia, and, recently, the "Story of Karachi" in two volumes.

Subscription

Pakistan:
Rs 300 (one year), Rs 500 (two years)
Please send the subscription through
cheque/pay order/draft drawn in favour of
"Quarterly Aaj, Karachi"
to the following address:
Managing Editor, aaj,
A-16, Safari Heights,
Gulistan-e-Jauhar, Karachi 75290.
Tel: (021) 811-3474
e-mail: aaj@biruni.erum.com.pk

Outside Pakistan:
Individuls: US$ 25 (one year), US$ 45 (two years)
Institutions: US$ 40 (one year), US$ 70 (two years)
Please send the subscription in US dollars to
Dr Muhammad Umar Memon,
5417, Regent Street,
Madison, WI 53705, USA.
Tel: (608) 233-2942
Fax: (608) 265-3538
e-mail: mumemon@factstaff.wisc.edu

Subscription includes registered air mail charges.

Scanned with CamScanner

سٹی پریس

مطبوعات کے اس نئے سلسلے کے تحت ملک کے شہری اور دیہی علاقوں
کی تاریخ، سماجی صورتِ حال اور متعلقہ موضوعات سے متعلق کتابیں
اردو، انگریزی اور سندھی میں شائع کی جائیں گی۔
یہ کم قیمت کتابیں براہِ راست خریدنے والوں کو معقول رعایت پر دستیاب ہوں گی۔
آنے والی چند کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

ناؤں مل ہوت چند

یادداشتیں (اردو ترجمہ)

(سندھ پر برطانوی قبضے اور کراچی شہر کے بسنے کا احوال)

جان برنٹن

John Brunton's Book (انگریزی)

(سندھ اور پنجاب میں ریلوے کی آمد کا احوال)

جمشید نسروان جی

کراچی کے محسن اور معمار کی شخصیت اور کام کے بارے میں مضامین کا انتخاب

اختر حمید خاں

تبدیلی کی یادداشتیں

عارف حسن

Working with Government (انگریزی)

(اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے تجربات)

عارف حسن

No Land for the Poor (انگریزی)

(پاکستان کے شہری اور دیہی علاقوں میں رہائشی سہولتوں کی صورتِ حال)

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر۔ کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner

قیمت: ۷۵ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری پلازہ، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner